سردار
محمد
ابراہیم
خان

کشمیر کی جنگ آزادی



"ریاست جموّں وکشمیر کی تاریخ آزادی اور جنگِ حریّت میں سردار محمد ابراہیم خان
ب ممتاز و خاص مقام کے مالک ہیں، حکومتِ آزاد کشمیر کی تشکیل و ترتیب اور جہاد میں
خدمات آپ نے سرانجام دی ہیں وہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہیں :

"کشمیر کی جنگِ آزادی" میں جہاں کشمیری حریّت پسندوں اور مجاہدوں کی اولوالعزمی
داستان ہے، وہاں مسلمانانِ جموّں کی دلیری اور اسلام دوستی کی کہانی بھی ہے۔
دی کے لوگوں کی آزادی کی تڑپ کا قصہ بھی ہے۔ اور بھارتی مظالم کی روداد بھی ہے"

محمود احمد ناظر

قیمت 30/-
اُردو اکیڈمی سندھ
ایم۔ اے جناح روڈ، کراچی

کشمیر
کی
جنگِ آزادی

سردار محمد ابراہیم خاں
سابق صدر حکومتِ آزاد کشمیر

954.79
ک 1191

قیمت ۳۰/-
اُردو اکیڈمی سندھ
ایم۔اے جناح روڈ، کراچی

کلاسیک
۴۲ - دی مال لاہور

کشمیر
کی
جنگِ آزادی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 50408.5
★ MAILSI ★

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (پاکستان)
نمبر شمار : ....
کتاب نمبر : ....

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

ناشر : آغا امیر حسین۔ کلاسیک ۔ لاہور
سرورق : سیّد تفضل ضیا

طابع : دین محمدی پریس ۔ لاہور
بار اوّل ۔ بارہ سو مارچ ۱۹۶۶ء

جملہ حقوق محفوظ

پیش لفظ

زیر نظر کتاب میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے ایک نہایت پُرآشوب دور میں کشمیری عوام کی جدوجہدِ آزادی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ہر لحاظ سے مکمل ہے اور نہ ہی کشمیری عوام کی اس داستانِ جنگِ آزادی میں تمام تر تفاصیل پیش کرنا ممکن ہے ——— پھر اس کتاب میں بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی سرگرمیوں کا ذکر کرنے پر بھی زیادہ زور دیا ہے۔ جس کے لیے راقم الحروف قارئین سے بہر کیف معذرت خواہ ہے۔

میری یہ کتاب ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء پر محیط ہے۔ اس کا بڑا حصہ اگرچہ ۵۲-۱۹۵۱ء میں ہی مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن چند در چند وجوہات کی بنا پر شائع نہ ہو سکا اب کافی غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد میں نے بعض پہلے کے لکھے ہوئے حصوں کو حذف بھی کر دیا ہے۔ کیونکہ چند باتیں جو صرف میرے ذاتی علم میں تھیں اگر آج کے حالات میں شائع کر دی جائیں تو ان کی وجہ سے بحث و تمحیص کا ایسا طوفانِ بدتمیزی برپا ہو جاتا جو لاحاصل ہونے کے علاوہ اور کچھ مقصد نہ رکھتا اور بحالاتِ موجودہ میرے خیال میں بہتر بھی یہی ہے کہ اس وقت ہم صرف جنگِ آزادی کشمیر کے مقاصد کو تقویت پہنچانے کی نہایت ٹھوس اور مثبت انداز میں کوشش کریں :

لاہور

یکم مارچ ۱۹۶۶ء

سردار محمد ابراھیم خان

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
ملسی (پاکستان)
نمبر شمار : ....
کتاب نمبر : ....

(۱)

تاریخی پس منظر

ریاست جمّوں اور کشمیر کے شمال میں جمہوریہ روس اور عوامی جمہوریہ چین واقع ہیں۔ اس کی مغربی سرحد سلطنتِ افغانستان سے اور شمال مغربی سرحد مغربی پاکستان سے ملتی ہے۔ جنوب مشرق میں ریاست جموں و کشمیر کی سرحدوں کا کچھ حصّہ بھارت کی سرحد سے بھی ملتا ہے۔ ریاست کا کل رقبہ ۸۴۴۷۱ مربع میل پر مشتمل ہے اور جغرافیائی اعتبار سے ریاست کے وسیع و عریض رقبے کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وادیٔ کشمیر کا طول ۸۴ میل اور عرض ۲۵ میل کے لگ بھگ ہے۔ ریاست کا دارالحکومت سرینگر ہے جو تقریباً اس کے وسط میں واقع ہے دریائے جہلم ریاست کے مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے۔ دوسرا حصّہ ریاست جمّوں کا میدانی علاقہ ہے۔ جسے مشرق میں دریائے چناب مغرب میں راولپنڈی اور ضلع ہزارہ کا پہاڑی سلسلہ اور دریائے جہلم پنجاب کے میدانی علاقہ سے الگ کرتے ہیں۔ جنوب اور مغرب کی طرف پنجال کا ۱۴۰۰۰ فٹ بلند کوہستانی سلسلہ ریاست کی سرحد بندی کرتا ہے اور جموں کے دامن کا ڈھلوانی علاقہ

مغربی پاکستان کے میدانی علاقے تک پھیلا ہوا ہے۔

ھالیہ کا سلسلہ ہائے کوہ جس کی چوٹیاں ۱۵٫۰۰۰ فٹ سے لیکر ۲۳٫۶۰۰ فٹ تک بلند ہیں بھارتی ریاست چمبہ کی شمال مغربی سرحد سے لے کر جنوبی سرحد تک چلا گیا ہے۔ جو سیدھا جاکر دریائے سندھ سے مل جاتا ہے۔ ریاست کا چوتھائی حصہ جو ہمالیہ کے کوہستانی سلسلہ کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ بہت گنجان آباد ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں پانی نسبتاً افراط سے دستیاب ہو جاتا ہے۔

دریائے سندھ کا بالائی حصہ جو ہمالیہ کے سلسلہ ہائے کوہ کے پار واقع ہے نسبتاً بنجر اور غیر آباد ہے۔ اس کے شمال میں کوہ قراقرم واقع ہے جو لداخ اور بلتستان کو چین کے صوبہ سنکیانگ سے علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے مغرب کی جانب دریائے ہنزہ بہتا ہے۔ اور شمال میں کوہ ہندوکش واقع ہے۔ جو اس خطے کو پاکستانی ملحقہ ریاست چترال سے الگ کرتا ہے۔

مشرقی لداخ کی وادیاں بنجر اور خشک ہیں، اس لئے وہاں کی بہت کم آبادی کے لئے اناج کی کفالت کر سکتی ہیں، لیکن بلتستان اور گلگت ایجنسی کے شمال مغرب میں آبادی کا بڑا حصہ کاشتکاری پر گذر اوقات کرتا ہے۔ گلگت کے مغربی اور جنوب مغربی پہاڑ نسبتاً کم بلند اور کٹے پھٹے ہیں۔

موسمی لحاظ سے ریاست جموں اور کشمیر کی آب و ہوا بہت تغیر پذیر ہے کیونکہ ریاست کے کسی حصہ میں اگر سخت سردی ہوتی ہے تو کسی علاقے میں مغربی پاکستان کے میدانی علاقوں کی طرح سخت گرمی پڑتی ہے، جبکہ موسم گرما میں ریاست جموں میں استوائی خطے کی سی شدید گرمی پڑتی ہے۔ وادیٔ کشمیر میں موسم گرما کے دوران معتدل آب و ہوا رہتی ہے۔ مگر موسم سرما میں شدت کی سردی

ہوتی ہے۔ جموں سرینگر روڈ پر واقع درہ بانہال کے علاقے میں اکثر نومبر کے شروع سے ہی اتنی سخت برف باری شروع ہو جاتی ہے کہ اس علاقے کے تمام راستے مسدود ہو کر رہ جاتے ہیں اور پورے موسم سرما کے دوران آمد و رفت کا سلسلہ منقطع رہتا ہے۔ وادی کے سرحدی اضلاع میں بھی سارا سال شدید سردی پڑتی ہے، جبکہ کشمیر اور گلگت کی تنگ اور گہری وادیوں میں عام طور پر موسم گرم اور مرطوب رہتا ہے۔

پہاڑوں سے گھرے ہوئے سرحدی علاقوں میں بارش بہت کم ہوتی ہے لیکن ریاست کے دوسرے علاقوں میں ۳" سے ۶۵" تک بارش ہو جاتی ہے۔

رقبے کے لحاظ سے ریاست جموں اور کشمیر برِ صغیر پاک و ہند میں سب سے زیادہ وسیع و عریض ریاست ہے۔ کیونکہ اس کا رقبہ برطانیہ سے کچھ ہی کم ہے اگر بھارت کی ریاستوں، میسور، ٹراونکور، جیسلمیر اور بیکانیر کا سارا رقبہ جمع کر لیا جائے تو وہ ریاست جموں و کشمیر کے رقبہ کے برابر ہوگا۔ یا اگر یورپی ممالک بلجیم، ڈنمارک، ہالینڈ، آسٹریا اور البانیہ کے تمام رقبہ کو یکجا کر لیا جائے تو یہ رقبہ برِ صغیر کی اس سب سے بڑی ریاست کے برابر ہوگا۔

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی آبادی چالیس لاکھ اکیس ہزار چھ سو سولہ نفوس پر مشتمل ہے۔ مندرجہ ذیل جدول میں ریاست کے مختلف خطوں کی آبادی کے اعداد و شمار درج ہیں:-

خطے کا نام	کل آبادی	مسلم آبادی	غیر مسلم آبادی
جموں	۱۹,۸۱,۴۳۳	۱۲,۱۵,۶۷۶	۶,۶۵,۷۵۷
کشمیر	۱۷,۲۸,۷۰۵	۱۶,۱۵,۴۷۸	۱,۱۳,۲۷۷
سرحدی اضلاع	۳,۱۱,۴۷۸	۲,۷۰,۰۶۱	۴۱,۳۸۵

ریاست جموں و کشمیر کی آبادی عراق کی آبادی سے کچھ زیادہ اور سوئیٹزرلینڈ کی آبادی کے برابر ہے۔ ریاست میں مسلمان، ہندو، سکھ اور بدھ لوگ آباد ہیں ۱۹۴۱ء کی آخری مردم شماری ریاست میں مسلمانوں کی غالب اکثریت کا زندہ ثبوت ہے۔ جس کے مطابق ۷۷،۱۱ فیصد مسلمان آباد ہیں، جبکہ اس کے مقابلے میں ہندو آبادی کا تناسب ۲۱،۱۲ فیصد اور سکھ آبادی کا تناسب ۴۲،۱ فیصد ہے۔ اور مشرقی لداخ میں چالیس ہزار بدھ آباد ہیں۔ اس کے باوجود بلتستان اور لداخ کے علاقے میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے۔ ریاست کی کل آبادی میں ایک فیصد سے کچھ زیادہ سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔

نسلی اور ثقافتی اعتبار سے ریاست کے لوگ مختلف حصوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ لداخ اور بلتستان کے لوگ مخصوص منگولوں جیسی شکل و شباہت رکھتے ہیں۔ اپنی زبان اور تہذیب کے لحاظ سے بھی یہ لوگ گلگت اور سرینگر کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر اگرچہ شکل و صورت میں تو گلگت کے لوگ لداخ اور بلتستان کے لوگوں سے کافی حد تک مشابہت رکھتے ہیں۔ مگر اپنی عادات و اطوار اور خصائل میں ان سے بہت مختلف ہیں۔ لداخیوں اور بلتستانیوں کی زبان تو گلگت سرینگر اور جموں کے باشندوں کی زبان سے قطعی مختلف ہے۔ وادی کشمیر کے لوگ کشمیری زبان بولتے ہیں جو ریاست کے بعض دوسرے خطوں میں بولی جانیوالی زبانوں سے بالکل مختلف ہے۔ وادی کشمیر کے لوگ اپنے لباس اور رسم و رواج میں بھی ریاست کے دوسرے علاقوں کے باشندوں سے بہت مختلف اور الگ حیثیت رکھتے ہیں۔ جموں، پونچھ اور ریاست کے دوسرے حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کے رسم و رواج اور طور طریقے تقریباً وہی ہیں جو مغربی پاکستان کے باشندوں کے ہیں۔

پرانے زمانے کے ہندو کبھی اچھے تاریخ داں ثابت نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ برّصغیر میں ہندو دورِ حکومت کی کوئی مستند یا قابل ذکر تاریخ دستیاب نہیں ہوتی البتہ ریاست جموں وکشمیر کی قدیم تاریخ پرانے زمانے کی ایک مشہور کتاب "راج ترنگنی" میں ضرور محفوظ ہے۔ جس کا ممتاز مصنّف "کلہانا" بارہویں صدی کے نصف اوّل میں ہو گزرا ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو راجوں مہاراجوں نے ریاست جموں وکشمیر پر تقریباً چار ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ اور یکے بعد دیگرے ان حکمرانوں کے اکیس ۲۱ خاندان وادیٔ کشمیر پر حکمران رہ چکے ہیں۔ "راج ترنگنی" میں ان ہندو حکمرانوں کے بہت کچھ حالات درج ہیں۔ لیکن ان میں بھی زیادہ تر قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

ھندو دورِ اقتدار کے ابتدائی حصے میں، لوگوں کے سماجی اور اقتصادی حالات پر روشنی ڈالنا تو ممکن نہیں، البتہ قدیم تواریخ سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے۔ کہ ریاست میں سر قبیلی اور موروثی طرز کی حکومت قائم تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ مہاراجہ کے مرنے کے بعد اس کے بڑے لڑکے کو تاج و تخت کا وارث سمجھا جاتا تھا۔ اور ہر حکومت کے اچھا یا بُرا ہونے کا انحصار حکمران کے ذاتی کردار اور سیرت پر تھا یہ مختصر سی کتاب ان تمام تر تفصیلات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

قدیم کشمیر کا ایک نہایت مشہور و معروف راجہ للیادتیہ (۷۵۱ء سے ۷۵۲ء تک) برسرِ حکومت رہا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ حکمران بنا تو ریاست کی حالت نہایت ابتر تھی اور ہر طرف بدامنی و بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ اس راجہ نے سب سے پہلے ریاست میں امن و امان بحال کیا۔ بگڑے ہوئے سماجی حالات کو معمول پر لایا اور جب وہ ریاست میں اپنی ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم کرنے

میں کامیاب ہوگیا تو اس نے گرد و پیش کے دوسرے ممالک کی فتوحات کا توسیع پسندانہ سلسلہ شروع کردیا جو ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ وسطی ایشیا کے دور دراز ممالک کو فتح کرتا ہؤا وہ بارہ سال کے طویل عرصے کے بعد تبت کے راستہ سے اپنے وطن واپس پہنچا تھا۔

عام طور پر یہ ہندو راجے سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حالانکہ ہندوؤں کے ابتدائی دور کے راجے ہر طرح سے خود مختار اور ریاست کے سفید و سیاہ کے مالک ہوتے تھے۔ لیکن ان میں سے بعض اپنی مطلق العنانی و خود مختاری سے بالکل ناجائز فائدہ نہ اٹھاتے تھے اور ہمیشہ اپنے عوام کے روزمرہ مسائل میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور ان حکمرانوں کو اس امر کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ان کا وجود اپنے عوام کی آسودہ و خوشحال زندگی کے دم قدم سے ہی قائم ہے۔ درحقیقت ان میں سے اکثر و بیشتر حکمران عوامی طبقوں میں سے ہی نکل کر رفتہ رفتہ تخت و تاج کے وارث بنے تھے۔ اس دور کا ایک مشہور چینی مؤرخ ہیون سانگ ۶۱۷ء اور ۶۵۳ء میں ریاست کی سیاحت کرتے ہوئے یہاں کے حالات اس طرح لکھتا ہے!

"یہاں کے لوگ خوشحال اور فارغ البالی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کشمیری حکمرانوں کا سکہ صرف ریاست پر ہی نہیں بلکہ کئی ہمسایہ ریاستوں پر بھی چلتا ہے"۔ اس زمانے کے روایتی طور پر سادہ طرزِ زندگی کے باوصف ریاست کے لوگ نہ صرف ثقافتی و تہذیبی لحاظ سے ترقی یافتہ تھے۔ بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی بہت آگے تھے۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو ان کی ترقی دورِ حاضر کے مقابلے میں بھی حیرت انگیز تھی۔ ہماری نئی کشمیری نسل کو اس بات پر بجا طور پر فخر ہے اور ہونا بھی چاہئے کہ بہت پرانے زمانے میں ہمارے آباؤ اجداد زندگی بسر کرنے کے لئے اپنا ایک منفرد فلسفہ حیات رکھتے تھے۔ جو کہ بے حد عمیق تھا۔ اور قبولیت کا خاص و عام

کا درجہ رکھتا تھا۔ یہ فلسفہ حیات سرتاپا وحدانیت پر مبنی تھا جو اپنی مخصوص گہرائی و گیرائی کے اعتبار سے دنیا بھر میں تسلیم کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۳۱۰ء سے لے کر سنہ ۱۵۵۳ء تک علاقائی مسلمان بادشاہ کشمیر پر حکمران رہے۔ مگر سنہ ۱۵۱۵ء سے لے کر سنہ ۱۷۱۸ء تک مغل بادشاہوں نے کشمیر پر حکومت کی جبکہ سنہ ۱۷۱۸ء سے لے کر سنہ ۱۸۱۹ء تک افغان گورنر ریاست پر حکومت کرتے رہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر پر ۵۰۰ سال سے زیادہ عرصے تک خود مختار مسلمان حکمرانوں کا سکہ چلتا رہا۔ مگر چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں چند اہم سیاسی تبدیلیاں ریاست کشمیر میں رونما ہوئیں۔ سب سے پہلے سنہ ۱۳۲۴ء میں ریاست تبت کا ایک شہزادہ کشمیر میں پناہ گزیں ہوا۔ اور یہاں کئی سال تک پناہ گزیں رہنے کے بعد اس نے ریاست کے غیر تسلی بخش اور ابتر سیاسی و سماجی حالات اور شاہِ کشمیر کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر، جو کشتواڑ گیا ہوا تھا، کشمیر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار یہ تبتی شہزادہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ جس کے بعد کشمیر میں ایسے حکمرانوں کے دور کا آغاز ہوا جو نسل و تہذیب کے لحاظ سے غیر ملکی تھے۔ یہ مسلمان سلاطین تقریباً ڈیڑھ سو سال تک کشمیر کے سیاہ و سفید کے مالک بنے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت سلطان زین العابدین کو حاصل ہوئی۔ جو بڈھ شاہ یعنی سلطانِ عظیم کے نام سے بھی تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے۔ بڈھ شاہ کے قائم مقام سلطان سکندر کے دور میں کشمیری پنڈتوں کی ایک بڑی تعداد ترکِ وطن کر کے پنجاب اور برِ صغیر کے دوسرے علاقوں میں آباد ہو گئی۔

زین العابدین بڈھ شاہ کے دورِ حکومت میں کئی صنعتیں بھی ریاست میں قائم کی گئیں، جن میں کاغذ تیار کرنے، شالیں بنانے اور ریشم تیار کرنے کی صنعتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، بڈھ شاہ اپنی ہر دلعزیزی اور ترقی پسندی کی وجہ سے ریاست کے ہر طبقہ میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔ اور ریاست کے ہندو باشندے

بھی اس کی تحمل مزاجی و بردباری کی وجہ سے اُسے پسند کرنے لگے تھے۔

۱۵۸۶ء میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے کشمیر کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور شہنشاہ اورنگ زیب کے دور اقتدار تک مغل گورنر کشمیر پر حکومت کرتے رہے۔ مغلیہ دورِ حکومت ریاست میں امن و امان اور خوشحالی کے دور کی وجہ سے مشہور ہے۔ لیکن اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی ریاست میں ایک بار پھر بدامنی کا آغاز ہو گیا۔ اور ۱۷۵۰ء میں احمد شاہ درّانی نے کشمیر کو فتح کر کے اپنی افغان سلطنت کی حدود میں شامل کر لیا۔ یہ افغان حکمران بہت سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ اس لئے اہلِ کشمیر ان کی حکومت سے کبھی مطمئن نہ ہو سکے اور ان کے دورِ حکومت کی مذہبی تشدد پسندی، قتل و غارت گری اور ظلم و ستم کی داستانیں آج تک وادیٔ کشمیر کے گھر گھر میں سنائی جاتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں افغان حکمرانوں کی بدعملیوں اور عدم تدبر کے باعث ریاست کے عوام اور خاص طور پر ہندو باشندوں کو سخت اذیتیں برداشت کرنا پڑی ہوں گی۔

بعد میں ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک کے دوران) سکھوں نے ریاست پر اپنا قبضہ کر لیا اور وادیٔ کشمیر پنجاب کے حکمرانوں کی عملداری میں آ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۴۶ء تک سکھ حکمران ریاست پر قابض رہے مگر یہ سکھ حکمران بھی کشمیری عوام کے لئے افغان حکمرانوں سے بہتر ثابت نہ ہو سکے۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اس کے جانشین حکمرانوں نے بھی ریاست کی دیکھ بھال کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور نہ ہی انہیں عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی رغبت پیدا ہوئی وہ وادیٔ کشمیر پر حکومت کرنے کے لئے ہمیشہ اپنے گورنر نامزد کر کے بھیجتے رہے جو ریاست میں اپنی من مانی کارروائیاں کرتے رہے، ولیم مورکرافٹ جس نے ۱۸۲۴ء میں ریاست کی سیاحت کی تھی لکھتا ہے کہ :۔ "سکھ حکمران کشمیری

باشندوں سے جانوروں کا سا سلوک کرتے تھے اور کسی سکھ کے ہاتھوں ایک کشمیری کے قتل کی سزا سولہ[16] روپے سے لے کر بیس[20] روپے تک جرمانے سے زیادہ نہ تھی اور اس وصول شدہ رقم میں سے ہندو مقتول کی صورت میں اس کے پسماندگان کو چار روپے اور مسلمان مقتول کی صورت میں اس کے لواحقین کو صرف دو[2] روپے کی حقیر رقم خون بہا کے طور پر ادا کی جاتی تھی"۔

مورکرافٹ کے بیان کے مطابق ریاستی عوام کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اور سکھ حکمران انہیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر ان کی نسل ختم کر دینے کے درپے رہتے تھے۔ مگر اس کے برعکس کشمیر کے بعض مسلمان حکمرانوں مثلاً احمد شاہ، اکبر اعظم، اور جہانگیر نے اس پسماندہ ریاست اور اس کے باشندوں کی بہتری کے لئے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان مغل حکمرانوں نے ریاست میں امن و امان کی بحالی اور عوام کی آسودہ حالی کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اکبر اعظم نے ہری پربت کے گرداگرد ایک فصیل تعمیر کروائی۔ جہانگیر اور شاہجہان بھی وادیٔ کشمیر کے بہت شیدائی تھے۔ اور اکثر اوقات ریاست کی سیر و سیاحت کے لئے یہاں آتے رہتے تھے، انہوں نے کئی قابلِ دید باغات اور عمارات بھی وادیٔ کشمیر میں بنوائیں۔ جھیل ڈل کے کنارے سرسبز و شاداب باغات اور دوسری یادگاریں مغل دور کے عظیم کارناموں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں اور نہ صرف اس زمانے میں بلکہ مستقبل میں بھی دنیا کے گوشے گوشے سے آنے والے سیاح وادیٔ کشمیر کی تاریخ کے اس عظیم دور کی یادگاروں کو دیکھ کر مغلیہ دورِ حکومت کی عظمت کی گواہی دیتے رہیں گے۔

برنیئر (BERNIER.) جس نے اورنگ زیب کے دور میں ریاست کی سیاحت کی تھی کشمیر کے حالات و کوائف اور ریاستی عوام کی محنت پسندی کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ اور اس نے کشمیریوں کی تیار کی ہوئی شالیں خاص طور پر بہت

پسند کی تھیں۔

۱۸۱۹ء میں کشمیر حکومت پنجاب کی عملداری میں آگیا اور شیخ امام الدین کو یہاں کا گورنر مقرر کیا گیا۔ کشمیر پر پنجاب کی عملداری ۱۸۴۶ء تک قائم رہی جس کے بعد حکومتِ برطانیہ نے ریاست کو اپنے دائرہ اقتدار میں شامل کر لیا۔ اور نومبر ۱۸۴۶ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے برطانوی فوج کی مدد سے ریاست پر قبضہ کر لیا۔

ریاست پر مسلمانوں کے ۵۰۰ سالہ طویل دور حکومت کے دوران کشمیری باشندوں کی اکثریت نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا اور سید علی ہمدانی کی علم دوستی اور خدا پرستی نے ریاستی عوام کے دلوں پر اس قدر گہرا اثر ڈالا وہ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں شامل ہو گئے۔

خطۂ جموں کی اپنی تاریخ

جموں کے راجے جو کہ جھیل مانسرور اور سرونسرور کے قریب جوار کی ڈوگرہ آبادی والے علاقوں پر حکمران تھے، بارہویں صدی سے پندرھویں صدی کے عرصے میں افغانستان کے خاندان غوری کے زیر اثر آگئے اور پھر ۱۵۵۴ء کے بعد ان راجوں نے مغل بادشاہوں کا جاگیری اقتدار قبول کر لیا۔ اس دور میں راجوری کا علاقہ راجہ اکرام اللہ خاں، بھمبر کا علاقہ راجہ عظیم اللہ خاں اور میرپور کا علاقہ دیوان غلام علی اور حیدر علی خاں گکھڑ کی ماتحتی میں رہا۔ مگر ۱۸۰۸ء میں سکھوں نے ایک بار پھر جموں پر حملہ کر کے اس سارے علاقے کے باشندوں کو حکومت لاہور کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ گلاب سنگھ کے والد کو حکومت برطانیہ کی طرف سے تحصیل جموں میں اندواڑا کی جاگیر دے دی گئی۔ جس کے بعد گلاب سنگھ کے والد نے حکومت پنجاب کی ملازمت بھی اختیار کر لی۔ پھر ۱۸۰۹ء میں گلاب سنگھ بھی

پنجاب کی سکھ فوج میں بطور سپاہی ملازم ہو گیا اور برطانیہ کی فوجی خدمات کے صلے میں اسے سیالکوٹ اور جہلم کے اضلاع میں جاگیریں دے دی گئیں۔ مگر ۱۹۲۰ء میں گلاب سنگھ کو باقاعدہ جموں کا راجہ بنا دیا گیا اور اس کے دو بھائیوں کو جموں کے شمال مغرب میں پونچھ کا علاقہ اور شمال مغرب میں رام نگر کا علاقہ بھی برطانوی حکومت کی طرف سے دے دیا گیا۔

پونچھ کا مخصوص سیاسی پس منظر

سترھویں صدی کے آخر سے لے کر ۱۸۲۷ء تک پونچھ پر وہ مسلمان راجے حکومت کرتے رہے جو کہ تحصیل حویلی کے علاقہ لوران سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے بعد حکومت پنجاب نے پونچھ کا علاقہ راجوری کے ایک راجہ فیض طالب خان کے حوالے کر دیا اور پھر ۱۸۴۶ء میں پونچھ کا یہ علاقہ بھی (جو لاہور کا ضلع تصور کیا جاتا تھا) جموں کے ساتھ ہی راجہ گلاب سنگھ کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ اور راجہ گلاب سنگھ نے چبال (CHIBAL) اور پونچھ کے علاوہ بعض دوسرے علاقے بھی اپنے بھائی دھیان سنگھ کے بیٹوں جواہر سنگھ اور موتی سنگھ کے حوالے کر دیئے۔ پونچھ کے راجہ کو ایک گھوڑا سونے کے سازوسامان سمیت تحفے کے طور پر مہاراجہ جموں و کشمیر کی نذر کرنا پڑتا تھا اور پونچھ کا یہ راجہ اپنے علاقے کے نظم ونسق میں بھی مہاراجہ جموں و کشمیر کی منظوری کے بغیر کوئی ردوبدل نہ کر سکتا تھا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں راجہ ہری سنگھ نے جو گلاب سنگھ کا لڑکا تھا، طاقت کے ذریعے پونچھ کے راجہ کو اپنی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر کے پونچھ کا علاقہ اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ مگر ڈوگرہ مہاراجوں کے لئے پونچھ کے عوام پر حکومت کرنا نہایت دشوار ثابت ہوا اور لوگوں نے ان کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ڈوگرہ مہاراجوں کو ہمیشہ ظلم و تشدد کے ذریعے ہی وہاں کے عوام کو زیر کرنا پڑا اور مقامی

باشندے عرصے تک حکمران طبقے کے خلاف نبرد آزما رہے۔ آخرکار جب ڈوگرہ حکمرانوں نے اس عوامی بغاوت کو پوری طرح کچل دیا تو اس بغاوت کے ذمہ دار افراد کو پکڑ کر سرِ بازار ان کی کھال کھینچ دی گئی اور وہ مقامات جہاں یہ انسانیت سوز سزائیں دی گئیں آج بھی جموں اور کشمیر کے عوام کے لئے اپنی جدوجہد آزادی کی ناقابل فراموش علامتیں بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء میں جب وادیٔ کشمیر کی تاریخ نے اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر دہرایا تو کشمیر کے حریت پسند عوام ڈوگرہ شاہی کی چیرہ دستیوں کے خلاف صف آرا ہوچکے تھے اور کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کی یہ تاریخ اس سازشانہ معاہدۂ امرتسر کے ذکر کے بغیر تو نامکمل رہے گی جس کے ذریعے برطانوی حکومت نے ۱۸۴۶ء میں وادیٔ جموں و کشمیر پچھتر لاکھ روپے کے عوض راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کردی تھی معاہدۂ امرتسر جس کے ذریعہ راجہ گلاب سنگھ جموّں و کشمیر کا مطلق العنان راجہ بنا دیا گیا کی اہم شرائط درج ذیل ہیں :۔

شرط نمبر ۱۔ حکومت برطانیہ معاہدۂ لاہور جس پر ۹ مارچ ۱۸۴۶ء میں دستخط ہوئے کی شق نمبر ۱۲ کے تحت مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے نرینہ وارثوں کو ریاست جموّں و کشمیر کا خودمختار حکمران قرار دیتی ہے۔ مذکورہ ریاست کی حدود میں تمام پہاڑی علاقہ اور اس کے ملحقات بھی شامل ہیں اور جو مشرق کی جانب دریائے سندھ تک اور مغربی جانب دریائے راوی تک واقع ہے۔ چمبہ کا علاقہ بھی ریاست کی حدود میں شامل کیا جاتا ہے۔ جبکہ لاہول کا علاقہ ریاست کی حدود سے خارج ہے۔

شرط نمبر (۳) محولہ بالا شرائط کے تحت جس کے ذریعے مہاراجہ گلاب سنگھ اور اس کے وارثوں کو وادیٔ کشمیر کا مالک و مختار قرار دیا گیا ہے، کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ حکومت برطانیہ کو پچھتر لاکھ نانک شاہی روپے ادا کرے گا۔ اس رقم میں سے پچاس لاکھ روپے معاہدہ کی توثیق کے وقت اور باقی پچیس لاکھ روپے یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء کو یا اس سے قبل ادا

کئے جائیں گے۔

شرط نمبر (۹) برطانوی حکومت بیرونی حملہ آوروں سے ریاست کو محفوظ رکھنے کے لئے مہاراجہ گلاب سنگھ کی مدد کرے گی۔

شرط نمبر (۱۰) مہاراجہ گلاب سنگھ ، ریاست پر برطانوی حکومت کی بالادستی تسلیم کرے گا اور تحفے کے طور پر سالانہ ایک گھوڑا ، بارہ بہترین نسل کی بھیڑیں جن کی اون شال بنانے کے کام آسکے اور جن میں سے چھ نر اور چھ مادہ ہوں گی اور کشمیری شالوں کے تین جوڑے پیش کیا کرے گا۔

معاہدۂ امرتسر کی رُو سے ضلع ہزارہ گلاب سنگھ کی ریاست میں شامل کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس علاقے کا تبادلہ پنجاب کے منڈیر ، دادھی ، ھکتوعہ اور سجیت گڑھ کے علاقوں سے کر لیا گیا۔ اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ معاہدے میں کے داخلی نظم و نسق کے بارے میں کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ گلاب سنگھ کو ریاست کے داخلی امور میں مکمل خود مختاری حاصل تھی اور وہ علاقے میں اپنی من مانی کارروائیاں کر سکتا تھا۔ اگرچہ برطانوی حکام کو بعد میں ریاست ایک ہندوستانی راجے کے سپرد کر کے بہت افسوس بھی ہُوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب معاہدۂ امرتسر طے پایا تو اس وقت جو انگریز حکام یہ معاہدہ طے کر رہے تھے ، انہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہ تھا کہ یہ وادی اپنی دفاعی اور دوسری خصوصیات کے لحاظ سے برصغیر میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے معاہدۂ امرتسر کو اپنے لئے ناگزیر سمجھا۔ کیونکہ اس وقت پنجاب کے سیاسی حالات بڑے ابتر تھے اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور افغانستان کے حالات بھی بہت غیر مستقل تھے اور ان حالات میں کشمیر کے جھگڑے سے گلو خلاصی حاصل کرنے میں ہی برطانوی حکومت کو اپنی بہتری نظر آئی اور انہوں نے سوچا کہ گلاب سنگھ بہر طور شمالی ہندوستان میں ہمارا ایک اچھا اور قابل اعتماد

دوست ہے۔

ایک مصنف ڈریو (DREW) لکھتا ہے کہ:

ریاست جموں وکشمیر کا معاملہ مہاراجہ گلاب سنگھ سے طے کرتے وقت برطانوی گورنر جنرل کے پیش نظر ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ ریاست میں مہاراجہ گلاب سنگھ کی حکومت قائم کرنے سے سکھوں کی طاقت کم ہو جائے گی۔ کیونکہ ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک ایسی طاقت ان کے سر پر مسلط ہو جائے گی جو پنجاب کی سکھ حکومت کی طرف سے بے نیاز رہ کر برطانوی حکومت کی طرف جھکی رہے گی اور حکومت برطانیہ اپنے اس مقصد میں یہاں تک کامیاب بھی ضرور ہو گئی کہ اس کے بعد سکھوں اور انگریزوں کے درمیان آخری معرکے میں گلاب سنگھ کو پنجاب کی سکھ حکومت کی مدد کرنے سے باز رکھا گیا۔ حالانکہ اس سے پیشتر گلاب سنگھ پنجاب کی سکھ حکومت کا ایک وفادار دوست تھا۔

معاہدۂ امرتسر سے واضح ہوتا ہے اس میں یہ شرط بھی نہیں رکھی گئی تھی کہ ریاست میں برطانوی ریذیڈنٹ کا تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ چنانچہ جب حکومت برطانیہ نے کشمیر میں اپنے ریذیڈنٹ کے تقرر کا سوال اُٹھایا تو مہاراجہ نے اس کی سخت مخالفت کی۔ بالآخر کافی عرصے کی بحث وتحیص کے بعد ۱۸۵۱ء میں برطانوی حکومت ریاست میں اپنا ریذیڈنٹ مقرر کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

ڈوگرہ شاہی اقتدار کے دور میں ریاست میں جو بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں ہوتی رہیں اور ریاست کے عوام پر جو ظلم وستم ڈھائے جاتے رہے ان کا تفصیلی ذکر کرنا تو اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں ہے تاہم کے۔ ایم۔ پانیکر جیسے شخص کو بھی جو یقیناً راجہ گلاب سنگھ کا دشمن نہیں تھا یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہمیشہ ایسی ناجائز اور قابل اعتراض کارروائیاں کرتا رہا جیسے

ریاستی عوام مجبوراً برداشت کرتے تھے اور ان کے خلاف کچھ نہ کر سکتے تھے مزید براں اس نے اپنے اقتدار کو بہر صورت قائم رکھنے کے لئے نہ صرف چالاکی و مکاری سے کام لیا بلکہ طاقت کے استعمال کے علاوہ ہر قسم کی بد دیانتی و بے ایمانی کو بھی روا رکھا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گلاب سنگھ نے ایک ایسے متعصبانہ ماحول میں پرورش پائی تھی جس میں عوام سے غیر انسانی سلوک کرنے اور عیارانہ ہتھکنڈوں سے کام لینے کو سیاست کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا۔

ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی دور میں تو کشمیری عوام کو سخت تکلیفوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاہدۂ امرتسر نے کشمیری عوام کو غیر ملکی حملہ آوروں کے اقتدار سے تو نجات دلا دی اور ریاست میں داخلی طور پر امن قائم ہو گیا لیکن یہ امن و امان بھی ریاست کے مقتدر طبقہ سے تعلق رکھنے والے عوام کے لئے ہی فائدہ مند ثابت ہو سکا۔ ریاست کے حقوق یافتہ ہندو طبقے نے تو ریاستی مسلمانوں کا استحصال کر کے دن بدن اپنی حالت بہتر بنانی شروع کر دی اور اپنی تجوریاں سونے چاندی سے بھرنے لگے۔ مگر کشمیری عوام کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی اور ڈوگرہ دور اقتدار میں ان کی اقتصادی اور سماجی حالت بہتر ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہا

گلاب سنگھ اور رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں

ریاست کے کاشتکار طبقہ کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی اور ڈوگرہ حکومت نے زمین پر بھاری لگان عائد کر رکھا تھا۔ جو جنس کی صورت میں ہر فصل کے موقع پر پیشگی ہی وصول کر لیا جاتا تھا۔ لگان کی وصولی کا یہ کام پولیس کے سپاہیوں کے سپرد تھا اور چونکہ ان سپاہیوں کو کئی کئی ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے وہ دیہاتوں میں لگان کی وصولی کے

بہانے لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے تھے۔ پھر ریاست میں کئی عجیب و غریب قسم کے ٹیکس بھی عائد کر رکھے تھے۔ مثال کے طور پر گھوڑے کی فروخت پر پچاس فیصد ٹیکس جبری طور پر وصول کیا جاتا تھا۔

ریاست کے ہر سرکاری دفتر میں بدعنوانیوں کی بھرمار تھی اور ان کی تمام بدعنوانیوں کا بوجھ غریب کشمیری کسانوں کے سر پر آپڑتا تھا۔ راجہ کے تمام سرکاری افسر خاص طور پر محکمہ مال کے افسر انتہا درجے کے بددیانت اور لالچی تھے۔ وہ اپنی بدعنوانیوں اور بدعملیوں کے ذریعے دولت جمع کر کے معاشرے میں اپنے لئے ایک باعزت اور بلند مقام پیدا کر لیتے تھے اس لئے ان بدعنوانیوں کے انسداد کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو سکتا تھا۔

ڈوگرہ حکومت کا سب سے زیادہ شرمناک فعل عوام سے بیگار لینا تھا اور قانونی طور پر ریاستی افسر بھی کسی دیہاتی کو بیگار کرنے پر مجبور کر سکتے تھے۔ غریب دیہاتی عوام کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال لیا جاتا تھا اور غلاموں کی طرح ان سے بھاری وزن اٹھوا کر دور دراز کی مسافت طے کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ دیہاتی عوام کو بیگار کے دوران اجرت تو کجا خوراک بھی نہ دی جاتی تھی۔ بلکہ انہیں بیگار پر جاتے وقت خشک روٹی بھی گھر سے باندھ کر ساتھ لے جانا پڑتی تھی اور کشمیری عوام سے بیگار لینے کا یہ سلسلہ ماضی قریب تک جاری رہا۔

ڈاکٹر آرتھر نیو (DR. ARTHUR NEVE) لکھتا ہے۔ "میں اسلام آباد میں ہیضہ کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا۔ جو صفائی کے ناقص انتظام کی وجہ سے اس علاقے میں پھیل گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ نواحی علاقوں سے بیگار لینے کے لئے قلی اکھٹے کئے جا رہے ہیں جو

پاؤں میں گھاس کی جوتیاں پہنے۔ کاندھوں پر کمبل۔ رسی اور ٹوکریاں اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ اور میں نے ایک ایسا مقام بھی دیکھا جہاں مسجد کے سامنے ایک سرسبز میدان میں بیگار کے لئے جانے والے مزدوروں کو رخصت کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے اکثر بلند آواز سے آہ و بکا کر رہے تھے جبکہ ایک امام مسجد ان کے سامنے الوداعی انداز میں دعائیہ کلمے پڑھ رہا تھا اور وہ خود بھی گویا ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے ہی دردناک لہجے میں ایک اس قسم کا الوداعی گیت اونچی سروں میں الاپ رہے تھے:۔

ہمارے کھیت اب کون بوئے گا؟

اور ہماری اس طویل غیر حاضری میں
ہمارے بیوی بچوں پر کیا کچھ نہ گزرے گی؟
گلگت کے پہاڑی علاقے میں،
برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑی راستوں پر،
ان غریبوں کو کن کن آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا؟

نائٹ (KNIGHT) نے بھی بیگار لینے کے غیر انسانی طریق کو نہایت دردناک الفاظ میں پیش کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ شمالی سرحد پر متعین فوج کو اناج مہیا کرنے کے لئے نقل و حمل کے وسیع انتظامات کی ضرورت ہے لیکن کشمیری حکام کو مال برداری کی خدمات انجام دینے والے ان بیگاری مزدوروں کے آرام اور خوراک کا قطعی طور پر کوئی احساس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ انہیں ان مزدوروں کی جان تک کی کوئی پروا نہیں ہے جنہیں ان کے گھروں سے زبردستی نکال کر جان لیوا اور دشوار گزار راستوں پر کبھی بھی نہ ختم ہونے والا فاصلہ طے کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جہاں یہ بیگاری مزدور بھوک

پیاس سے نڈھال ہو کر سڑکوں پر گر جاتے ہیں اور سینکڑوں مزدور جن کے تن بدن پر کپڑا بھی نہیں ہوتا ، برف پوش راستوں پر چلتے ہوئے سردی سے اکڑ اکڑ کر مر جاتے ہیں۔ مگر وہاں ان کا کوئی پرسان حال بھی نہیں ہوتا۔ جب کسی مزدور کو بیگار کے لئے لے جایا جاتا ہے تو اُس کے بیوی بچے اس سے لپٹ لپٹ کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے۔ اور جب کوئی سپاہی اناج کے بوجھ سے لدے ہوئے مزدوروں کو موسم گرما میں استور اور گلگت کے درمیان سفر کرنے پر مجبور کر رہا ہوتا ہے تو بالکل سائبریا کے ریگستانوں کا دردناک منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مگر ڈوگرہ شاہی کشمیر اور زار شاہی سائبریا کے ان مناظر میں اتنا فرق پھر بھی ضرور باقی رہ جاتا ہے کہ زار شاہی دور کے سائبریا میں صرف سزا یافتہ مجرموں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاتا تھا۔ جبکہ ڈوگرہ شاہی میں مہاراجہ کے وفادار اور بے گناہ مسلمان کاشتکاروں سے یہ بہیمانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا۔"

مندرجہ بالا سطور میں نائٹ نے بڑے دردناک الفاظ میں کشمیر عوام سے بیگار لینے کے طریقوں کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کے لئے ایک بڑی مصیبت یہ بھی تھی کہ زراعت پیشہ دیہاتی عوام کو بیگار کرنے پر اس وقت مجبور کیا جاتا تھا جب کہ انہیں اپنی زمینوں پر کام کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا ان کی عدم موجودگی میں ان کی فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ پھر جب مال افسر کسی ضلع میں مالیہ وصول کرنے جاتا تھا تو صرف اس شخص کو بیگار سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا جو کہ مالیہ ادا کر دے اور باقی سب کاشتکاروں کے نام بیگار کرنے والوں کی فہرست میں درج کر لئے جاتے تھے۔ اس لئے جب کسی دیہات

کے باشندوں کو قبل از وقت کسی مال افسر کے آنے کی اطلاع مل جاتی تھی تو وہ بیگار کی مصیبت سے بچنے کے لئے اپنے دیہات سے بھاگ کر کہیں روپوش ہو جاتے تھے۔ غرضیکہ مہاراجہ کشمیر کے دور اقتدار میں مظلوم عوام سے بیگار لینے کی یہ انسان سوز اور بربریت پسندانہ داستانیں سن کر سنگدل سے انسان کا جگر بھی پانی پانی ہو جاتا ہے۔

۱۸۷۷ء میں ریاست جموں و کشمیر میں ایک ایسا خوفناک قحط پڑا کہ ہزاروں افراد موت کا شکار ہو گئے اور ریاست کے بہت سے دیہات تو مکمل طور پر تباہ ہو کر رہ گئے۔ اس قحط کے اسباب سے قطع نظر بھوک سے مرنے والے ان ہزاروں کشمیری عوام کے خون ناحق کا الزام بھی تاریخ میں کشمیر کی ڈوگرہ حکومت کے سر رہے گا۔ جنہوں نے سسک سسک کر دم توڑ دیا مگر ان کے لئے خوراک کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا۔ پھر ریاست کے عوام ابھی قحط کی مصیبت سے سر بھی نہ اٹھانے پائے تھے کہ ۱۸۸۵ء میں ایک قیامت خیز زلزلہ ریاست میں آیا جس سے ہزاروں افراد موت کی ابدی نیند سو گئے اور ہزاروں لوگ زلزلے سے منہدم ہونے والی عمارتوں کے ملبے تلے دبے ہوئے سسک سسک کر دم توڑتے رہے مگر انہیں بچانے کے لئے ریاست کی طرف سے کوئی توجہ نہ دی گئی اور جو لوگ زلزلے کی آفت سے جان بچانے میں کامیاب ہو گئے انہیں پھر سے بسانے کے لئے مالی امداد دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔

مہاراجہ جموں و کشمیر ایک مطلق العنان حکمران تھا۔ جس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے متعین افسر نہایت بددیانت راشی اور نااہل ہوتے تھے اور خود راجہ بھی کبھی عوام کی مشکلات اور ان

کے مسائل حل کرنے کی طرف متوجہ ہونے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ جس کے باعث بیرونی دنیا کی ترقی ریاستی عوام کی سماجی و اقتصادی زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو پاتی تھی۔ ایک زمانے میں تو انہیں اخبار بینی کی بھی اجازت نہیں تھی مبادا کہ وہ بیرونی دنیا کے حالات سے آنکھیں روشن کر کے اپنی حالت پر غور و فکر کرنے کے عادی نہ ہو جائیں۔

مہاراجہ کے سامنے عوامی مشکلات کی شکایت کرنا ایک ایسا جرم تھا جس کی سزا کے طور پر شکایت کنندہ کو ریاست بدر کیا جا سکتا تھا اور بے شمار لوگوں کو اسی قسم کے جرائم کی پاداش میں ریاست سے نکالا بھی جا چکا تھا۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد ریاست میں انتہائی متعصب ہندو انتظامیہ کو مضبوطی سے اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا اور اسی دور میں ریاست کے مسلمان خاندانوں کے چند افراد بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر کے ریاست میں واپس آ چکے تھے مگر متعصب ہندو انتظامیہ ریاست کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو فساد کی جڑ اور ریاست میں ان کے وجود کو مداخلت بے جا تصور کرنے لگی تھی۔ پھر پہلی جنگ عظیم کے دوران ریاست کے عوام فوج میں بھرتی ہو کر ایران، عراق اور فرانس تک گئے۔ جہاں سے واپسی پر انہیں ریاست کے حالات اور بیرونی دنیا کے بدلے ہوئے حالات کا فرق واضح طور پر محسوس ہوا۔ آخر دوسری جنگ کے بعد جو ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی ریاست میں حالات یکسر تبدیل ہو چکے تھے اور جو کشمیری فوجی اس جنگ عظیم کے بعد ریاست میں واپس آئے وہ اتنے سادہ لوح نہیں تھے کہ آسانی سے حکمرانوں کی بیگار کرنے پر آمادہ ہو جائیں وہ نہ

صرف بیگار کرنے سے انکار کرتے تھے بلکہ ایسی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر بھی تل جاتے تھے جو انہیں بیگار کرنے پر مجبور کرے پھر جب ۱۹۴۷ء میں انہوں نے دیکھا کہ ڈوگرہ حکام انہیں نت نئے طریقوں سے اپنے ظلم و ستم کا شکار بنا رہے ہیں اور ان کے بال بچوں کو ذبح کرنے کے درپے ہیں تو انہوں نے ریاست کے کونے کونے میں ظالم ڈوگرہ شاہی کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت نے کیا صورت اختیار کی ہے! اس کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

(۲)

کشمیری عوام میں سیاسی شعور کی بیداری

موجودہ صدی کے آغاز سے ہی کشمیری عوام میں سیاسی بیداری پیدا ہونے لگی تھی اور انہوں نے یہ بات واضح طور پر محسوس کرنا شروع کر دی تھی کہ کشمیری مسلمانوں کو حکومت کے محکموں میں قطعی طور پر کوئی نمائندگی حاصل نہ تھی۔ کیونکہ سرکاری محکموں میں ملازمتیں حاصل کرنے کے لئے سرکاری امور میں تعلیم یافتہ کشمیری عوام کی بہت کمی تھی۔ اس لئے حکومت زیادہ تر باہر کے لوگوں کو ہی ریاست میں ملازم رکھتی تھی اور یہ باہر کے ریاستی ملازمین حکومتی محکموں پر اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ انہوں نے ریاست کی تمام اہم مرتبے کی ملازمتوں پر خصوصیت سے اپنا اجارہ دارانہ قبضہ جما رکھا تھا۔ ایک زمانے میں کشمیری پنڈتوں کی طرف سے جو کہ ریاست بھر میں تعلیم یافتہ لوگوں کا واحد طبقہ تھا۔ حکومتی اداروں کی تمام اہم ملازمتوں پر بیرونی لوگوں کے ناجائز تصرف کے خلاف سخت احتجاج بھی کیا گیا تھا۔ تاہم سیاسی بیداری کے اس مخصوص دور میں ریاستی مسلمانوں نے اپنے بیرونی

مسلمان بھائیوں کی ریاستی محکموں میں تعیناتی کا خیر مقدم کیا کیونکہ ریاست میں ایسے تعلیم یافتہ مسلمان نہ ہونے کے برابر تھے جو کہ حکومت کے اہم شعبوں میں متعین کئے جا سکتے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز اپنی کتاب "اندرونِ کشمیر" (INSIDE KASHMIR) میں اس صورتِ حال کے بارے میں یوں رقمطراز ہے!

"اس صدی کے شروع میں کشمیری عوام کو ایک اور مصیبت جس کا سامنا کرنا پڑا وہ یہ تھی کہ غیر کشمیری افراد نے ریاست کے تمام اہم سرکاری عہدوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ لہٰذا اس دور میں کشمیری عوام کی ان غیر کشمیری ملازموں کے خلاف اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد نے ایک واضح صورت اختیار کر لی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے کشمیری عوام کے لئے ریاست میں ترقی کے تمام راستے مسدود ہو گئے تھے۔ اور مفلوک الحال کشمیری عوام گوناگوں اقتصادی مشکلات، افلاس اور ٹیکسوں کے ناقابل برداشت بوجھ تلے دبے ہوئے کراہ رہے تھے اور ریاست کا تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کے ہر شعبہ میں غیر ریاستی حکام کی بالادستی کی وجہ سے بے چینی اور پریشانی کا شکار تھا۔ ان کٹھن حالات میں کشمیری عوام کے سینوں سے صدیوں کا دبا ہوا جذبات و احساسات کا لاوا پھوٹ کر بہہ نکلا۔ جس نے ان کے لئے ایک سیدھا اور واضح راستہ اختیار کرنے کا موقع بھی فراہم کر دیا لیکن کشمیری عوام کے اس جذبۂ نفرت و حقارت نے ابھی تک سرکاری حکمرانوں اور ریاستی حکومت کی براہِ راست مخالفت کا روپ نہ دھارا تھا۔ چنانچہ کشمیر کے تعلیم یافتہ طبقہ نے حکومتِ ہندوستان کو اپنی اس حق تلفی اور غیر ریاستی حکام کی بالادستی کے خلاف احتجاجی یادداشتیں پیش کرنے کی ایک مہم شروع کر دی جس کے نتیجہ میں اس

صورتِ حال پر قابو پانے کے لئے گزشتہ صدی کے اواخر میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے دربارِ کشمیر کے نام ایک مراسلہ میں مہاراجہ کو ہدایت کی کہ ریاستی ملازمتوں میں کشمیری عوام کو غیر ریاستی افراد پر ترجیح دی جائے اور حکومت کی اس ہدایت پر سختی سے عمل کیا جائے۔"

کشمیری عوام کی طرف سے بیرونی افسروں کی بالادستی کے خلاف یہ احتجاجی مہم ۱۹۱۲ء تک جاری رہی۔ جبکہ ریاست کے حکومتی عمّال کی تعیّناتی کے مسئلے کو پہلی بار ایک اصولی صراحت و وضاحت سے پیش کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس دور میں کشمیری عوام کو یہ مسئلہ بھی درپیش تھا کہ ان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی بہت کمی تھی۔ اور کشمیری مسلمان اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ محض اپنی تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے ان کے لئے حکومتی ملازمتوں میں مناسب نمائندگی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس شدتِ احساس کے بعد انہوں نے بڑے زور و شور سے تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے کی جدوجہد شروع کر دی اور یہ سلسلہ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ جبکہ اسی سال ہندوستان کی برطانوی حکومت کا کمشنر تعلیم "مسٹر شارپ" ریاست کے سرکاری دورے پر آیا تو اس نے ریاستی مسلمانوں کے مطالبات و مشکلات کی بھی چھان بین کی۔ جس کے بعد اس نے حکومتِ کشمیر کو اس معاملے میں چند ہدایات بھی دیں۔ مگر ان پر بعد میں کوئی عمل درآمد نہ ہوا اور نہ ہی اس بارے میں کوئی قابلِ ذکر توجہ دی گئی۔

۱۹۲۴ء میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے ریاست کا دورہ کیا تو اس موقع پر کشمیری مسلمانوں نے اس کے سامنے بھی ایک یادداشت پیش کی جس میں ایک بار پھر یہ مطالبہ دہرایا گیا کہ ریاست کی ملازمتوں میں کشمیری مسلمانوں کو مساوی حقوق دیے جائیں اور بیگار لینے کا سلسلہ قانونی طور پر فوراً

ختم کیا جائے۔ اس یادداشت میں ان کے علاوہ اور بھی کئی بنیادی مطالبات شامل تھے۔ اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ یادداشت پر ریاست کے دو جاگیرداروں اور دو میرواعظوں نے بھی دستخط کئے تھے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ریاستی مسلمانوں کے مطالبات و مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی قائم کر دی گئی مگر اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ کشمیری مسلمانوں کے یہ مطالبات بے جان اور فضول ہونے کی بنا پر قابل منظوری نہیں۔ علاوہ ازیں ڈوگرہ حکومت نے اس یادداشت پر دستخط کرنے والے کئی افراد کو ریاست بدر بھی کر دیا اور ۱۹۲۹ء تک حالات جوں کے توں رہے۔

آخر ریاست میں جب زیادہ بے چینی بڑھنے لگی تو مہاراجہ کی نام نہاد کابینہ کے ایک وزیر "سر البئین بنیرجی" (SIR ALBION BANERJi) نے اس صورت حال کی سخت مذمت کی اور اپنی وزارت سے مستعفی ہو گیا۔ مسٹر بنیرجی نے جو دو سال تک مہاراجہ کی کابینہ میں شامل رہا احتجاج کے طور پر اپنا استعفیٰ پیش کرتے ہوئے "ایسوسی ایٹڈ پریس" کو اپنا مندرجہ ذیل بیان برائے اشاعت دیا اور اس بیان نے بعد میں تاریخ کشمیر میں ایک اہم دستاویزی حیثیت اختیار کر لی۔

"ریاست جموں و کشمیر کے عوام بے شمار آلام و مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے کراہ رہے ہیں۔ اور محنت و مشقت کی سخت اذیتیں برداشت کر کے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کشمیری عوام کی کثیر تعداد جو مسلمانوں پر مشتمل ہے تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہے اور وہ انتہائی ناسازگار اقتصادی حالات میں زندگی کے دن جوں توں کر کے گزار رہے ہیں۔ ڈوگرہ حکومت ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتی ہے۔ ریاستی حکومت کا اپنے عوام

سے کوئی رابطہ نہیں اور چونکہ عوام کو حکومت کے سامنے اپنے مطالبات وشکایات پیش کرنے کا بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس لئے حکومت کی انتظامی کارکردگی کو دورِ حاضر کے تقاضوں اور معیار کے مطابق ڈھالنے کی اشد ضرورت ہے"

رائے عامہ کا ذکر کرتے ہوئے بنیرجی لکھتا ہے کہ ریاست میں رائے عامہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے پوری ریاست میں سرے سے کوئی اخبار ہی موجود نہیں ہے۔ اور یہ اس بات کا ایک بیّن ثبوت ہے کہ ریاست کی حکومت اپنے خلاف عوام کی تنقید برداشت کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہے۔

ریاست کے دوسرے حصّوں میں بسنے والے عوام کے مقابلے میں ریاست جموّں کے عوام کو کسی قدر سیاسی آزادی حاصل تھی اور انھوں نے "ڈوگرہ سبھا" کے نام سے ایک سیاسی جماعت بھی وہاں قائم کر رکھی تھی مگر اس میں بھی ریاست کے تقریباً تمام سابق سرکاری ملازم اور اسی طبقے سے تعلّق رکھنے والے دوسرے افراد شامل تھے۔ پریم ناتھ بزاز اپنی تصنیف "اندرونِ کشمیر" کے صفحہ نمبر ۹۲ پر اس ڈوگرہ سبھا کے متعلق لکھتا ہے "یہ ڈوگرہ عوام کے نام پر اونچے طبقے کے ڈوگرہ خاندانوں کے مفادات کا تحفّظ کرتی تھی۔ اور اس جماعت کی حکومت نوازی کا ثبوت اس امر سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سرکاری ملازمین کو بھی اس میں شمولیّت کی کھلی اجازت تھی"

بزاز بیان کرتا ہے۔ جب ڈوگرہ شاہی کی مطلق العنان حکومت نے یہ محسوس کیا کہ اب عوام کو فریب میں مبتلا رکھنے کے لئے انتظامی امور میں زیادہ بڑے پیمانہ پر سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرنے کی ضرورت ہے تو اس نے جموّں

میں ڈوگرہ سبھا کے نام سے ایک ایسی جماعت کے قیام کی اجازت دے دی جو حکومت کے خلاف فعّال اور خطرناک عوامی تحریکوں کو ایک اُبال کی مانند ابھار کر خارج کر دے تاکہ ان عوامی تحریکوں کو پوشیدہ طور پر حکومت کے خلاف سرگرم عمل رہنے کا موقع نہ مل سکے۔ اور پھر جب ۱۹۲۰ء کے بعد وادیٔ کشمیر میں کشمیری عوام کے اعلیٰ طبقہ میں بھی بے اطمینانی اور بے چینی کے آثار نمایاں ہونے لگے تو اس ڈوگرہ سبھا کی ایک شاخ ریاست کشمیر میں قائم کر دی گئی۔"

ریاست کشمیر میں بھی ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ لیکن ان پابندیوں کے باوجود وہاں علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں نے "ریڈنگ روم" قائم کر لیا تھا جو فتح کدل ریڈنگ روم کے نام سے موسوم تھا۔ اور اس "ریڈنگ روم" کے ذریعے وہاں سیاسی سرگرمیوں کا خفیہ طور پر آغاز کر دیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ جگہ مسلمانوں کا ایک اچھا مرکز بن گئی تھی جہاں ریاست کے سیاسی حالات اور خاص طور پر ریاست کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے حصّے اور حق تلفی کے متعلق سوچ بچار کیا جانے لگا تھا اور آخر کار آگے چل کر دراصل علی گڑھ کے انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن دماغ نوجوان مسلمانوں نے ہی ریاست میں حقیقی معنوں میں سیاسی سرگرمیوں کی داغ بیل ڈالی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۳۰ء میں فتح کدل ریڈنگ روم میں جمع ہونے والے ان مسلمان نوجوانوں کے ایک وفد نے ریاست کی نام نہاد وزارتی کونسل سے ملاقات کی اس وفد میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل تھے۔ جو ابھی ابھی علی گڑھ سے ایم ایس سی کی ڈگری لے کر کشمیر واپس آئے تھے۔ اس ملاقات کے موقع پر مہاراجہ کی

نام نہاد وزارتی کونسل کے تمام ارکان اور ریاست کے انگریز وزیر اعظم "مسٹر ویک فیلڈ" بھی موجود تھے۔ اور انہوں نے وفد کے سامنے سرکاری ملازمین کا تقرر کرنے والے بورڈ کے اصولوں پر روشنی ڈالتے ہوئے وفد کو اس امر کا یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ یہ بورڈ تعلیم یافتہ طبقے کے حقوق کا تحفظ کر رہا ہے۔ لیکن کشمیر کے انگریز وزیر اعظم کے یہ دلائل وفد کے ذہین ارکان کو مطمئن نہ کر سکے۔ اور وہ مایوسی کی حالت میں واپس لوٹے۔ جس کے بعد ریاست کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں میں ان کی مشکلات اور مسائل نے مضبوطی سے جڑیں پکڑ لیں۔ چنانچہ کشمیر اور جموّں کے مسلمان نوجوانوں نے بڑی تندہی اور مستقل مزاجی سے ریاست میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل کا کام شروع کر دیا۔

اس سے قبل ریاست جموّں میں بھی اسی قسم کا نقطۂ نظر رکھنے والی ایک جماعت "ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن" کے نام سے معرض وجود میں آچکی تھی۔ اور ۱۹۳۰ء تک پنجاب کے اخبارات کے ذریعے جموّں اور کشمیر کی مسلمان سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے کے اغراض و مقاصد کا پوری طرح علم ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک کل جموّں و کشمیر سیاسی تنظیم کے قیام کے لئے ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کشمیر میں ان سیاسی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "ہم دیکھ چکے ہیں کہ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان غیر مطمئن ہیں اور اپنے مطالبات منوانے کے لئے مصروف عمل ہیں۔ اب وہ اپنے آپ کو ریاست گیر سطح پر منظم و متحد کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور اس وقت سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے خواہشمند کشمیری مسلمان نوجوانوں کے شاید وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ وقت اور حالات کے تقاضے ان سے ریاست کے سیاسی ڈھانچے میں آگے چل کر ایک انقلاب عظیم

لانے کا بنیادی کارنامہ سرانجام دلوانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اپنی جس جدّوجہد کا آغاز کر رہے ہیں۔ نہ صرف اس کے لئے بلکہ ریاست بھر میں ایک ہمہ گیر عوامی تحریک کے لئے بھی فضا ساز گار ہو چکی ہے۔"

ان حالات میں سری نگر اور جموں میں کام کرنے والی دو اہم جماعتوں کا اشتراکِ باہمی اور ایک سیاسی جماعت کا قیام ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس دور میں مختلف سیاسی تحریکوں کے دوران میں ایک ایسی جماعت کے قیام کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی جو کشمیری عوام کی راہنمائی کر سکے۔ اور آخر کار ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ کشمیر میں مسلم کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کا اوّلین مطالبہ ریاست میں زرعی اصلاحات نافذ کرنے کا تھا۔ مگر مہاراجہ نے برطانوی فوج کی مدد سے اس ابھرتی ہوئی تحریک کو کچل ڈالا۔ اور کشمیری مسلمان وہ نصب العین حاصل نہ کر سکے جسے وہ ۱۹۳۱ء کی تحریک سے لے کر آگے بڑھے تھے۔ البتہ اس سے کشمیر میں مسلم کانفرنس کی اس تحریک آزادی کو ضرور تقویت حاصل ہوئی جو ریاست میں آئینی اور عوامی حکومت قائم کرنے کے لئے ایک قانون ساز جماعت کی تشکیل کا نعرہ لے کر اٹھی تھی۔ اور اس تحریک آزادی میں پنجاب کی دو جماعتوں مجلسِ احرار اسلام اور احمدیہ کمیٹی نے اہم کردار ادا کیا اور جب ۱۹۳۱ء میں ڈوگرہ حکومت کی عوام کش پالیسی کے خلاف اس تحریک آزادی کا آغاز ہوا تو مجلسِ احرار اسلام نے کشمیری مسلمانوں کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے ان کی امداد کے لئے پنجاب سے کشمیر کی طرف اپنے رضاکارانہ دستے روانہ کئے۔ لیکن انہیں پنجاب کی سرحد پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ دوسری طرف کشمیر کی جدّوجہدِ آزادی میں مصروفِ عمل کشمیری مجاہدین کی امداد کے لئے احمدیہ کمیٹی کے سربراہ کی صدارت میں ایک کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ تاکہ کشمیری عوام کو

ان کے جائز سیاسی حقوق دلوانے کے لئے عملی امداد کی جا سکے پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے۔

"جماعت احمدیہ اور مجلس احرار اسلام باہمی طور پر کسی متحد لائحہ عمل کے ذریعے کشمیری مسلمانوں کی کوئی مدد نہ کر سکیں۔ لیکن انہوں نے اپنی الگ الگ حیثیت میں ضرور کشمیری مسلمانوں کی ہر ممکن امداد کی۔ مگر پنجاب کی دونوں جماعتوں کی باہمی ناچاقی کے بہت دور رس اثرات ہوئے اور ان کی اس ناچاقی و نااتفاقی سے کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی پر بہت مضر اثر پڑا۔ اس پر آئندہ صفحات میں تفصیل روشنی ڈالی جائے گی مگر یہاں صرف یہ بیان کر دینا ہی کافی ہے کہ اس صورت حال سے ریاست میں انتہائی فرقہ وارانہ فضا پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ خود پنجاب کی سیاست پر بھی اس کے نتیجے میں بہت مضر اثرات رونما ہوئے۔"

ان دو جماعتوں کے علاوہ ہندوستان میں کل ہند مسلم لیگ اور کل ہند مسلم کانفرنس جیسی سیاسی جماعتیں اور متعدد مسلمان سیاسی راہنما بھی جن کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہ تھا سیاسی میدان میں سرگرم عمل تھے۔ جنہوں نے کشمیر کے سیاسی حالات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی اور جونہی کشمیر میں تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ وہ اس تحریک میں کود پڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ ان کے مذہبی جذبات بیدار ہو گئے۔ اگرچہ ان سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں نے تحریک آزادی کشمیر میں اس قدر بڑھ چڑھ کر حصہ تو نہ لیا جس قدر کہ مجلس احرار اسلام اور جماعت احمدیہ نے تاہم تحریک کشمیر میں اُن کا کردار بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ریاست کے ڈوگرہ اور ہندو باشندے مسلمانوں کی اس تحریک آزادی کے شروع سے ہی سخت مخالف تھے۔ کیونکہ ریاستی ہندو سمجھتے تھے اگر مسلمانوں

کی یہ سیاسی تحریک کامیاب ہوگئی اور ریاست میں ایک عوامی حکومت قائم ہوگئی تو ان کے ذاتی مفادات پر کاری ضرب لگے گی۔ ان ریاستی ہندوؤں کا بڑا حصہ جاگیرداروں پر مشتمل تھا۔ جو انتہائی متعصب اور رجعت پسند تھے۔ اور وہ ہر اس تحریک کی سختی سے مخالفت کرتے تھے جس کے ذریعے اکثریت سے تعلق رکھنے والے ریاستی مسلمانوں کی حکومت قائم ہو سکے۔ اسی طرح کشمیری پنڈتوں کا طبقہ بھی ریاستی مسلمانوں کی تحریک آزادی کی مخالفت کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ریاست کے تمام کلیدی عہدوں پر قابض تھے اور انہیں یہ خدشہ تھا کہ اگر ریاستی مسلمانوں کی نمائندہ حکومت قائم ہوگئی تو وہ اپنے طبقاتی اقتدار کے مفادات سے محروم ہو جائیں گے۔ اور ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ ہمیشہ مسلمانوں کی طرف سے ریاست میں ایک نمائندہ عوامی جماعت کے قیام کے مطالبے کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

ریاست کے مسلمان وسیع پیمانے پر اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی یہ سرگرمیاں ریاست میں اخبارات نہ ہونے کی وجہ سے کشمیری عوام اور بیرونی دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہتی تھیں۔ اور ریاست میں اگر کوئی اخبار تھا بھی تو اسے حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیوں کی اطلاعات شائع کرنے کی کوئی جرأت نہ تھی۔ آخرکار کشمیر کے مسلمان راہنماؤں نے اپنی سرگرمیاں اور مسائل بیرونی دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے لاھور کے اخبارات "انقلاب" اور "زمیندار" میں مضامین شائع کروانے شروع کر دیئے اسی دوران "ریڈنگ روم" میں بیٹھنے والے مسلمان نوجوانوں نے کشمیر کے دو میرواعظوں کی ہمدردیاں بھی حاصل کر لیں۔ ان میں سے ایک جامع مسجد کے میرواعظ مولانا احمد اللہ صاحب بھی تھے۔ جن کا انتقال ۱۹۳۱ء میں ہوا اور مولانا یوسف شاہ ان کے جانشین بن گئے جو ان دنوں پاکستان میں جلاوطنی

کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

۱۹۳۱ء میں کچھ ایسے واقعات بھی ریاست میں رونما ہوئے جن سے ریاستی مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر اور زیادہ زد پڑتی تھی۔ لہٰذا ان واقعات نے سری نگر کے "ریڈنگ روم" میں بیٹھنے والے مسلمان نوجوانوں کو ایک سیاسی جماعت میں منظم و متحد ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ اور انھوں نے ریاست کے مسلمانوں کو ساتھ لے کر اپنے مطالبات منوانے کے لئے از سرِ نو ایک تحریک شروع کر دی ریاست کے نام نہاد وزیرِ اعظم مسٹر ویک فیلڈ (WAKE FIELD) نے کشمیری مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے کچھ نمائندے ، ریاست کے دوسرے علاقوں میں آباد مسلمان باشندوں کے نمائندوں کے ہمراہ بات چیت کے لئے سری نگر بھیجیں اور مہاراجہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کریں۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد نے مہاراجہ سے ملاقات کر کے اپنے مطالبات پیش کر دیئے۔ مسلمان نمائندے راجہ سے ملاقات کر کے اس کے محل سے باہر نکل رہے تھے کہ عین اسی موقع پر عبدالقادر نام کے ایک پستہ قد پٹھان نے وہاں پہنچ کر اشتعال انگیز تقریر شروع کر دی اور نہ صرف ریاست کے ہندو باشندوں بلکہ مہاراجہ کو بھی سخت سُست کہا اور ان کے رویے کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ عبدالقادر شمال مغربی سرحدی صوبے کا ایک پٹھان تھا اور ایک یورپی باشندے کے ساتھ باورچی کے طور پر کام کرنے کے لئے سری نگر میں مقیم تھا۔ یہ اشتعال انگیز تقریر کرنے پر اُسے ۲۵ رجون ۱۹۳۱ء کو موقع پر ہی گرفتار کر کے اس پر مہاراجہ اور اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ جب ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کو سنٹرل جیل سری نگر میں ہی عبدالقادر کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو کشمیری مسلمان کثیر تعداد میں جیل کے

باہر جمع ہو گئے۔ اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں عبدالقادر کے خلاف مقدمے کی کارروائی سننے کے لئے جیل کے اندر جانے دیا جائے۔ مگر ریاستی حکام نے ان کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس پر وہ زبردستی جیل کی عمارت کے اندر گھس گئے۔ اور پولیس نے ان پر گولی چلا دی جس سے متعدد کشمیری مظاہرین شہید اور زخمی ہو گئے۔ اور آج تک کشمیری مسلمان اپنی تحریک آزادی کے اس اوّلین المناک حادثے کی یاد میں "یوم شہدائے کشمیر" مناتے ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کے احتجاج پر اس حادثے کی تحقیقات کے لئے "بی جے گلینسی" کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ جس نے حکومت کے سامنے اپنی رپورٹ میں کئی قسم کی اصلاحات نافذ العمل کرنے کی سفارش کی۔ مگر ان میں سے صرف چند ایک سفارشات پر ہی عمل درآمد کیا گیا۔ اس کمیشن کی سفارش پر ریاست میں پہلی بار ایک نام نہاد قانون ساز اسمبلی کی تشکیل بھی کر دی گئی۔

اس طرح سے ریاست میں ایک بالکل ابتدائی قسم کی سیاسی تنظیم وجود میں آئی۔ پریم ناتھ بزاز اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے۔

"۱۹۳۲ء میں گلینسی کمیشن کی رپورٹ کے فوراً بعد کشمیر کے مسلمان راہنماؤں نے محسوس کیا کہ ریاستی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک نمائندہ سیاسی جماعت کا قیام اب نہایت ضروری ہو گیا ہے۔ بزاز لکھتا ہے کہ اس وقت ریاستی مسلمانوں کے پیش نظر صرف اعلیٰ اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے مفادات ہی تھے۔ چنانچہ کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد اسی ضرورت کے پیش نظر رکھی گئی۔ جس کا پہلا سہ روزہ اجلاس سری نگر میں ۱۵۔۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوا۔ اور کشمیر کے ہزاروں مسلمانوں نے اس میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں یوسف شاہ

اور شیخ محمد عبداللہ کے حامی دھڑوں کو جو کہ اس دور میں اعلیٰ کشمیری طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے اہم مقام حاصل تھا۔ اس کانفرنس کا اجلاس منعقد کرنے میں اگرچہ عبداللہ کے حامیوں نے زیادہ حصّہ لیا۔ مگر میر واعظ یوسف شاہ اور ان کے حامیوں نے بھی بڑی گرمجوشی سے شرکت کی۔ اور بعد میں میر واعظ اور عبداللہ کے حامیوں کے درمیان بعض اختلافات نے ایسی سنگین صورت حال اختیار کر لی کہ میر واعظ اور ان کے حامیوں نے کانفرنس کی آخری نشستوں میں شمولیّت سے انکار کر دیا۔

کُل جموّں وکشمیر مسلم کانفرنس جون ۱۹۳۸ء تک سرگرم عمل رہی اور اس دوران میں اس کے چھ سالانہ اجلاس منعقد ہوئے جن میں سے پہلا۔ دوسرا۔ پانچواں اور چھٹا اجلاس شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں بالترتیب سری نگر میرپور۔ پونچھ اور جموّں کے شہروں میں ہوا۔ جبکہ تیسرا سالانہ اجلاس سوپور میں زیر صدارت میاں احمد یار اور چوتھا اجلاس سری نگر میں چودھر غلام عباس کی صدارت میں ہوا۔ آخر جون ۱۹۳۸ء میں شیخ محمد عبداللہ اور چودھری غلام عباس نے ”کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس“ کا نام تبدیل کر کے نیشنل کانفرنس رکھنے اور اس کے سیاسی ڈھانچے کو تبدیل کر کے ”کل ہند نیشنل کانگریس“ کے سیاسی ڈھانچے کے مطابق ڈھالنے کا فیصلہ کیا۔ اور جون ۳۸ء کے سری نگر اجلاس میں مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی۔

”کل جموّں وکشمیر مسلم کانفرنس کی اس مجلس عاملہ کیلئے اس کی رائے میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ ملک کی تمام ترقی پسند سیاسی طاقتیں ایک ہی جھنڈے تلے جمع ہو کر ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کریں لہٰذا مجلس عاملہ کانفرنس کی جزل کونسل سے سفارش کرتی ہے کہ ”مسلم کانفرنس“

کے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کا نام تبدیل کر کے جماعت کے منشور میں بھی ترمیم و تنسیخ کی جائے تاکہ جو شخص بھی چاہے ۔ رنگ و نسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر اس کانفرنس کا رکن بن کر ریاست کی سیاسی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کر سکے ۔"

مگر ۱۹۴۱ء میں اس فیصلے کے دو سال بعد ہی سب سے پہلے ریاست جموں کے اکثر مسلمانوں نے مسلم کانفرنس کے اس فیصلے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا اور مسلم کانفرنس کی از سر نو تنظیم کی طرف متوجہ ہو گئے تھے ۔ تاکہ ریاستی مسلمانوں کے بنیادی مسائل حل کئے جائیں ۔ اور ان کی سیاسی و اقتصادی حالت بہتر بنائی جا سکے ۔ کیونکہ ریاست کے ہندو اس قدر تنگ نظر تھے کہ وہ ریاست میں ہندو مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت کا خاتمہ کسی صورت بھی برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ اگرچہ شیخ محمد عبداللہ ۱۹۵۳-۵۴ء تک جب تک کہ اسے ریاست کی وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے گرفتار نہ کر لیا گیا ۔ کل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس" کے سربراہ رہے ۔ لیکن انہیں ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں ہمیشہ سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور خاص طور پر ان کے ہندو ساتھی ریاست میں ڈوگرہ راج ختم کرنے کے سوال پر کبھی ان کے ہم خیال نہ بن سکے ۔ اس لئے ریاست کے ہندو باشندے بھی نیشنل کانفرنس کو اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے ایک مسلمان جماعت ہی قرار دیتے رہے ۔ مسلم کانفرنس کی بحالی کا کام سردار گوہر رحمان اور ان کے ساتھیوں کے سپرد کیا گیا ۔ اور چوہدری غلام عباس نے بھی بعد میں اس بحال شدہ مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کر لی ۔ کیونکہ اس دوران میں وہ نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے ۔ اس تشکیل نو کے بعد

"مسلم کانفرنس" نے اپنے اغراض و مقاصد کو بھی برصغیر کی مشہور جماعت مسلم لیگ کے نصب العین کے مطابق ڈھال لیا۔

ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے پہلے عام انتخابات ۳۴-۱۹۳۳ء میں منعقد ہوئے۔ جس میں مسلم کانفرنس نے ۱۶ نشستیں حاصل کر لیں۔ جبکہ اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے کل ۲۱ نشستیں رکھی گئی تھیں۔ ریاست میں دوسری مرتبہ ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات ہوئے۔ اور ان میں بھی مسلم کانفرنس نے جماعتی حیثیت سے نمایاں کامیابی حاصل کر لی۔ پھر ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کے تمام کے تمام اراکین اسمبلی اپنی نشستوں سے مستعفی ہو گئے اور اس نئی صورتِ حال سے پیدا ہونے والے سیاسی بحران پر غالب پانے کے لئے از سرِ نو انتخابات کروانے کا انتظام کیا گیا۔ مگر ان نئے انتخابات میں بھی مسلم کانفرنس نے دوبارہ مسلمانوں کے لئے محفوظ کل ۲۱ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔

۱۹۴۶ء میں شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس نے "کشمیر چھوڑ دو!" کی تحریک شروع کی۔ جس طرح کہ کل ہند نیشنل کانگریس نے 'ہندوستان سے نکل جاؤ!' کی تحریک برصغیر میں شروع کی تھی۔ اس تحریک کا مقصد ریاست کے ڈوگرہ اور انگریز نوکر شاہی کے خلاف جدوجہد کر کے انہیں ریاست سے نکال باہر کرنا اور وہاں کی حکومت عوام کے سپرد کر دینا تھا۔ چنانچہ ریاست کے راجہ اور حکمران گروہ کو الٹی میٹم دے دیا گیا کہ ریاست چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر "کشمیر چھوڑ دو!" کی یہ سیاسی تحریک بہت جلد ریاست میں سرد پڑ گئی اور شیخ عبداللہ کو بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا کر قید کر دیا گیا۔

مسلم کانفرنس نے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے بعد بھی ریاست

میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کے اپنی جدّوجہد آزادی جاری رکھی اور بڑی تیزی کے ساتھ کشمیری عوام میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ آخر جون ۱۹۴۶ء میں مسلم کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کشمیری مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ اپنا نصب العین حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میدانِ عمل میں نکل آئیں۔ "مسلم کانفرنس" کا سالانہ اجلاس بھی اکتوبر ۱۹۴۶ء میں منعقد کیا جانا تھا۔ لیکن ڈوگرہ حکومت نے اس پر پابندی عائد کر کے مسلم کانفرنس کے تمام سرکردہ اراکین کو جن میں کانفرنس کے صدر چودھری غلام عباس بھی شامل تھے گرفتار کر لیا۔ اور اگرچہ کانفرنس کے اکثر ممتاز راہنما گرفتار تھے۔ اس کے باوجود کانفرنس نے ۱۹۴۷ء کے عام انتخابات میں حصّہ لیا اور کشمیر اسمبلی کی ۲۱ میں سے ۱۵ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ باقیماندہ چھ نشستوں کے لئے مسلم کانفرنس کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے گئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان چھ نشستوں کے انتخابات نہیں کروائے گئے جبکہ نیشنل کانفرنس نے ان انتخاباب کا ویسے ہی سرے سے مقاطعہ کر رکھا تھا۔

پھر ۱۹۴۷ء کے تاریخی سن میں عوام کی ایک طویل جدوجہد کے بعد جب برطانوی حکومت نے برصّغیر ہند و پاک کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا تو برصغیر کی ریاستوں کو بھی یہ حق دیا گیا کہ وہ ۱۵ اگست کے بعد اپنی مرضی کے مطابق پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی کے ساتھ بھی اپنا الحاق کر سکتے ہیں۔ لیکن ریاست جمّوں و کشمیر کا راجہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق نہ کر سکا۔ کیونکہ ۱۵ اگست کو قیام پاکستان کے ساتھ ہی ریاست میں مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام پاکستان کی حمایت میں ایک مظاہرہ کیا گیا۔ جس کے ذریعے عوام کی طرف سے پُرزور

مطالبہ کیا گیا کہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ کیا جائے ——— "مسلم کانفرنس" اس سے پیشتر ۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک قرارداد کے ذریعہ ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا مطالبہ اور اعلان واضح طور پر کر چکی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ :۔

(۱) "کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس" کی یہ کنونشن اس قرارداد کے ذریعے قیام پاکستان پر اپنے اطمینان قلبی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے قائداعظمؒ کو اپنی مبارکباد پیش کرتی ہے۔"

(۲) برصغیر کی ریاستوں کے عوام کو اُمید تھی کہ وہ بطانوی ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے دوش بدوش قومی آزادی کے مقاصد کو حاصل کریں گے اور تقسیم ہندوستان کیساتھ جہاں برطانوی ہندوستان کے تمام باشندے آزادی سے ہمکنار ہوتے، وہاں ۳ر جون ۱۹۴۷ء کے اس اعلان نے برصغیر کی نیم مختار ریاستوں کے حکمرانوں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے ہیں اور جب تک یہ مطلق العنان حکمران وقت کے جدید تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کر دیں گے۔ ہندوستانی ریاستوں کے عوام کا مستقبل بھی بالکل تاریک رہے گا۔ ان حالات میں ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے سامنے صرف تین راستے ہیں۔

(i)۔ ریاست کا بھارت سے الحاق

(ii) یا ریاست کا پاکستان سے الحاق

(iii) یا کشمیر میں ایک آزاد و خود مختار ریاست کا قیام

مسلم کانفرنس کی یہ کنونشن بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ جغرافیائی اقتصادی، لسانی و ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ریاست کی آبادی کا ۸۰ فیصد حصہ مسلمانوں

پر مشتمل ہے۔ اور پاکستان کے تمام بڑے دریا جن کی گذر گاہ پنجاب ہے، کے منبعے وادیٔ کشمیر ہی ہیں۔ ریاست کی سرحدیں تو پاکستان کی سرحدوں سے پہلے ہی ملحق ہیں اور ریاست کے عوام بھی پاکستان کے عوام کے ساتھ مذہبی و ثقافتی اور اقتصادی رشتوں میں مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کیا جائے۔"

مندرجہ بالا قرارداد میں آگے چل کر مہاراجہ کشمیر سے یہ بھی پرزور مطالبہ کیا گیا ہے کہ کشمیری عوام کو داخلی طور پر مکمّل خود مختاری دی جائے اور مہاراجہ ریاست کے آئینی سربراہ کی حیثیت اختیار کرتے ہوئے ریاست میں ایک نمائندہ قانون ساز اسمبلی کی تشکیل کرے۔ قرارداد میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ دفاع۔ مواصلات اور امور خارجہ کے محکمے پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیئے جائیں۔ اس تاریخی قرارداد میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر حکومتِ کشمیر نے ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے اور مسلم کانفرنس کے اس مشورے پر کسی داخلی یا خارجی دباؤ کے تحت عمل نہ کیا گیا۔ اور ریاست کا الحاق ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی کے ساتھ کر دیا گیا تو کشمیری عوام اس فیصلے کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہونگے اور اپنی تحریک آزادی پورے جوش و خروش سے جاری رکھیں گے۔

ریاست جمّوں و کشمیر میں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے علاوہ بعض دوسری سیاسی جماعتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی۔ کسان مزدور کانفرنس کشمیر ڈیماکریٹک یونین۔ کشمیر سوشلسٹ پارٹی۔ پرجا پریشد پارٹی اور ریاست کشمیر کے پنڈتوں کی کانفرنس وغیرہ قابل ذکر جماعتیں ہیں۔ کسان مزدور کانفرنس کشمیر کے کسانوں اور مزدوروں کے طبقے کی جماعت تھی۔ یہ جماعت بڑی منظم اور مضبوط تھی اور ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کرتی تھی۔ کسان

مزدور کانفرنس کے سربراہ کو شیخ عبداللہ کی حکومت کے دوران میں پاکستان کی حمایت میں سرگرم عمل ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ کشمیر ڈیماکریٹک یونین بھی کسان مزدور کانفرنس کے نقشِ قدم پر چلتی ہوئی کام کر رہی تھی۔ اس جماعت کے سربراہ پریم ناتھ بزاز ہمیشہ سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ریاست کا الحاق عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اور اگر کشمیری عوام کی اکثریت پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتی ہو تو ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہی ہونا چاہیئے۔ مگر ۱۹۴۷ء میں پریم ناتھ بزاز کو گرفتار کر لیا گیا اور شیخ عبداللہ کی حکومت نے ۳/۴ سال تک قید رکھنے کے بعد رہا کیا۔ مگر بعد میں ریاست سے نکال دیا گیا۔ پریم ناتھ بزاز کا شمار ریاست کے چوٹی کے راہنماؤں میں ہوتا ہے۔ وہ ترقی پسندانہ سیاسی روش کا مالک ہے اور ریاستی عوام کی فلاح و بہبود کا زبردست حامی ہے۔ اگرچہ پریم ناتھ بزاز کشمیر کے پنڈت خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جو نہایت متعصّب خیال کیئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ سیاسی نقطۂ نظر کے لحاظ سے کشمیر کے تمام سیاسی راہنماؤں سے آگے ہے۔

پرجا پرشید پارٹی ایک ایسی جماعت ہے جو جمّوں اور لداخ کے علاقوں کو (جہاں اس جماعت کے سربراہوں کے خیال میں ہندوؤں کی اکثریت ہے) ہندوستان میں شامل کر کے ریاست کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ گزشتہ سالوں میں شیخ عبداللہ نے جو مقبوضہ کشمیر کے سابق کٹھ پتلی وزیر اعظم تھے تسلیم کیا تھا کہ جب ان کی نام نہاد قانون ساز اسمبلی نیا قانون مرتّب کرے گی تو جمّوں کے عوام کو ثقافتی بنیادوں پر داخلی خود مختاری دے دی جائے گی۔

(۳)

ریاست کشمیر ۱۹۴۷ء کے آئینے میں

برصغیر کی تاریخ میں اگست ۱۹۴۷ء کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے کیونکہ حکومتِ برطانیہ نے اگست ۱۹۴۷ء میں برصغیر کو ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے نتیجے میں سو سالہ غلامی کے بعد آزادی سے ہم کنار ہونے کا موقع دیا تھا۔ اور برصغیر کو تقسیم کر کے دو آزاد و خود مختار حکومتیں قائم کر دی گئیں جو پاکستان اور بھارت کے نام سے موسوم ہیں۔

برصغیر کی تقسیم کا واقعہ نہ صرف برصغیر کے مستقبل کی تاریخ میں بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ تحریک قیام پاکستان کی تاریخ اگرچہ بڑی مختصر ہے مگر یہ تاریخ بڑی مثالی اور تابناک ہے۔ یہاں میں قیام پاکستان کی تاریخ کا تفصیلی ذکر کرنا نہیں چاہتا اور نہ میں اپنے آپ کو اس قابل پاتا ہوں کہ تاریخ پاکستان کے اس شاندار باب پر روشنی ڈال سکوں۔ میری ناچیز رائے میں جس طرح پاکستان کا قیام ایک معجزے سے کم نہیں۔ اسی طرح قائدِ اعظم محمد علی جناح کی شخصیت بھی دنیائے سیاست میں ایک معجزنما شخصیت کی

حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ میں ایسی غیر معمولی شخصیتیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں جو اپنے محدود ذرائع کے باوجود اپنے ہر قسم کے مخالفین سے تن تنہا نبرد آزما رہی ہوں۔ اور ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے دور میں برصغیر کا کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ جو کسی نہ کسی صورت میں قائدِ اعظم کی اس عظیم جد و جہد سے متاثر نہ ہوا ہو۔ قائدِ اعظم کی تحریکِ آزادی اور برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک آزاد مملکت کے قیام کے پروگرام نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی محدود اقلیت کے باوجود غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ اور برِصغیر سے باہر بھی بہت کم ایسے افراد ملیں گے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ قائدِ اعظم برِصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کروانے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کے قیام میں کامیاب ہو سکیں گے۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا معرضِ وجود میں آجانا اسلامی ممالک کے لئے بھی ایک حیرت انگیز طور پر خوش گوار واقعہ تھا۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ قیام پاکستان کے موقع پر ان اسلامی ممالک کو بھی اسی قسم کی مسرت حاصل ہوئی ہوگی جس طرح کہ برصغیر کے مسلمانوں کو انڈونیشیا میں آزاد اسلامی مملکت کے قیام پر ہوئی ہوگی۔ اور یہ بھی ایک امرِ حقیقت ہے کہ بھارت نے عرب ملکوں اور خاص طور پر مصر میں یہ شر انگیز پراپیگنڈا بڑے زور شور سے کیا کہ قائدِ اعظم مرحوم برطانوی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں ورنہ وہ خود بھی قیامِ پاکستان کے مطالبے میں اس قدر سنجیدہ نہ تھے۔ جس قدر کہ انہیں سمجھا جاتا رہا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کی سرحدوں سے ملحق ایک وسیع و عریض اور متحد و منظم اسلامی مملکتِ پاکستان کے قیام نے کشمیری مسلمانوں کے دلوں میں بھی امید کی ایک نئی کرن پیدا کر دی اور وہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور خود

اپنی زندگی کے بارے میں ایک نئے نقطۂ نظر سے سوچنے لگے۔ کیونکہ ریاست جموں وکشمیر کے ۳۲ لاکھ باشندے (جن کی تعداد اب ۵۰ لاکھ ہو چکی ہے) تقریباً ایک سو سال کے طویل عرصے سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی ہر مصیبت اور معاشرتی ذلت کا نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اور ڈوگرہ شاہی کے بدترین مظالم بڑی حوصلہ مندی اور جرأت سے برداشت کرتے رہے۔ ڈوگرہ حکمرانِ ریاست کے مظلوم مسلمان باشندوں کو اپنی طاقت کے بل پر ہندوؤں کے تعصب کی بدولت اسلامی شعائر کی بے حرمتی کر کے اپنے ظلم وستم کا نشانہ بناتے رہے۔ مختصر یہ کہ ریاستی مسلمان ہٹ دھرم اور سفّاک ڈوگرہ خاندان کے مطلق العنان حکمرانوں کی چیرہ دستیوں کا ایک عرصے تک نشانہ بنے رہے۔ اور انہیں سیاسی وسماجی طور پر بھی اچھوت بنائے رکھا گیا۔ اس کے علاوہ اقتصادی اور تعلیمی لحاظ سے بھی انہیں زیادہ سے زیادہ پسماندہ اور مفلوک الحال رکھنے کی پوری کوشش کی گئی۔ اس طرح سے ریاست کے ڈوگرہ حکمرانِ ریاستی مسلمانوں کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتے رہے۔

مگر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کا اثر ریاستی مسلمانوں پر تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی صورت میں براہِ راست بڑی شدت سے رونما ہوا اور یہ ایک ایسی ابھرتی ہوئی تحریک تھی جس کے راستے میں طاقت کے ذریعے رکاوٹ پیدا کرنا یا اسے کچل ڈالنا اب ڈوگرہ شاہی کے ہتھکنڈوں کے بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ کشمیر کے چالیس لاکھ مسلمان ڈوگرہ شاہی کی زوال پذیر قوت سے خائف ہو کر اس کی غلامی کا جوآ اب زیادہ دیر تک اپنے کندھوں پر برداشت کرنے کیلئے آمادہ نہ تھے۔ اور ریاست کی سرحدوں سے باہر برِصغیر کے ہر صوبے میں بھی ایک ایسا عظیم سیاسی اور ذہنی

انقلاب جنم لے رہا تھا۔ جس نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں اکھاڑ کر رکھ دی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ریاست کے عوام بھی سیاسی و ذہنی طور پر اب اتنے پسماندہ اور خوابیدہ نہ رہے تھے کہ برصغیر میں رونما ہونے والے ان سیاسی حالات کا اثر قبول نہ کرتے۔ برصغیر میں مسلم لیگ اور نیشنل کانگریس کے درمیان سیاسی کشمکش نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ سیاسی طور پر بیدار کر کے ان میں ایک نئی قسم کا نظم و ضبط اور اتحاد پیدا کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں میں یہ سیاسی بیداری پیدا کرنے کے اسباب میں مسلم لیگ کی اپنی جدوجہد سے زیادہ کانگریس پارٹی اور اقلیتی صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کی غلط حکمت عملیوں اور کانگریس کی مسلمان کش پالیسی کو زیادہ دخل تھا۔

چنانچہ اس دور میں مسلم لیگ کو ان صوبوں میں زیادہ حمایت حاصل ہوئی جن صوبوں میں مسلمان اقلیتی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس طرح برصغیر کے مسلمانوں نے قیامِ پاکستان کے مطالبے کو اپنا ایک قومی مقصد بنا کر ہی دم لیا۔ حالانکہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو تحریک قیام پاکستان کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح کشمیر پر بھی جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ لیکن وہ ڈوگرہ شاہی کے چنگل میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے تحریک قیام پاکستان کا نمایاں اثر ہوا اور کشمیری مسلمان سوچنے لگے کہ قیام پاکستان کے بعد انہیں اپنا نصب العین حاصل کرنے اور ریاست کو ڈوگرہ شاہی کے چنگل سے نجات دلوانے میں بہت مدد ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست میں تحریک پاکستان کی پُرزور تائید و حمایت کی جانے لگی۔ اور ڈوگرہ حکمرانوں نے قیام پاکستان کی حمایت میں نعرہ لگانے کو بھی حکومت کے خلاف بغاوت کے مترادف قرار دے کر پابندیاں عائد کر دیں۔ پھر جب قیام پاکستان کا خواب ایک

ناقابلِ تردید حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آگیا تو ریاست میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم بھی اپنی انتہا کو پہنچ گئے۔ اور ڈوگرہ حکمرانوں نے پونچھ۔ میرپور اور مظفرآباد کے اضلاع میں (جو اب آزاد کشمیر کا حصہ ہیں) مسلمانوں کو اپنی قتل و غارت گری کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اور ڈوگرہ حکومت کی مسلمان کش پالیسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاست کی راشٹریہ سیوا سنگھ جماعت نے بھی اپنے کل پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ اس جماعت نے جموں میں اپنا صدر دفتر قائم کر کے ریاست کے تمام اہم شہروں میں اپنی منظم شاخیں بھی قائم کر دیں اور جموّں میں اس دہشت پسند تنظیم کا ایک خفیہ مرکز بھی قائم کر کے دہشت پسند ہندو نوجوانوں کو وسیع پیمانے پر فوجی تربیّت دینی شروع کر دی۔ تاکہ وہ مسلمان حریّت پسندوں کے مقابلے میں صف آرا ہو سکیں۔ ڈوگرہ حکومت کو ہندوؤں کی راشٹریہ سیوا سنگھ جماعت کی ان جنگی تیاریوں کا بخوبی علم تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ دہشت پسند ہندو جماعت کٹھوعہ اور مظفرآباد کے راستے سے ریاست میں ہتھیار سمگل کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہندو مہاسبھا کی نگرانی میں جموں کے علاقہ میں کئی منظم تربیتی اداروں کے ذریعے بھی ہندو دہشت پسندوں کو فوجی تربیّت دے کر ہتھیار تقسیم کئے جاتے رہے۔ اور ہندو دہشت پسند جماعت راشٹریہ سیوا سنگھ کی ان جنگی سرگرمیوں نے جموں۔ کٹھوعہ اور اودھم پور کے علاوہ ریاست کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں میں بھی خوف و ہراس کی ایک لہر پیدا کر دی۔

جس بات نے ریاست کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ دہشت پیدا کی وہ یہ تھی کہ ڈوگرہ فوج پونچھ۔ میرپور اور مظفرآباد کے سرحدی اضلاع میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ سارے علاقوں میں پھیل گئی تھی۔ اور ضلع

پونچھ کے تو تمام اہم مقامات پر فوج متعین کر دی گئی تھی - اس کے بعد ریاستی فوج کے مسلمان افسروں کا تبادلہ ریاست کے دور دراز علاقوں میں کر دیا گیا۔ جس سے ریاستی مسلمانوں کے خلاف ڈوگرہ شاہی کی ایک بھیانک سازش ظاہر ہو جاتی ہے اور ریاست کے سرحدی اضلاع میں ڈوگرہ فوج کی نقل و حرکت بھی ڈوگرہ شاہی کی اسی سوچی سمجھی سازش کا ایک واضح ثبوت تھی - اس موقعہ پر ریاستی فوج کے برطانوی چیف آف اسٹاف بریگیڈیر اسکاٹ نے اگرچہ فوری طور پر ڈوگرہ سازش کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی اور مسلمان فوجی افسروں کے تبادلے پر بھی اپنی کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کیا - مگر بعد میں اس نے ڈوگرہ حکومت کی اس خطرناک سازش میں حصہ لینے سے انکار کر دیا - اور ریاست کے چالیس لاکھ مسلمانوں کا قتل عام کرنے کی ڈوگرہ شاہی سازش کا آلہ کار نہ بن سکا - بلکہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر ریاست کو خیرباد کہہ گیا - اسی طرح ریاستی پولیس کے برطانوی انسپکٹر جنرل کو بھی مستعفی ہونے یا اس سازش کا آلہ کار بننے پر مجبور کیا گیا تو اس نے بھی اس سازش میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور اپنے عہدے سے استعفا دے کر ریاست کو چھوڑ دیا - چنانچہ ریاستی فوج کے چیف آف اسٹاف اور پولیس کے انسپکٹر جنرل کے عہدے ڈوگرہ حکومت نے اپنے ڈوگرہ خاندان کے دو افراد کے سپرد کر دیئے - یہ نئے ریاستی عہدے دار کسی انتظامی صلاحیت سے بالکل کورے تھے اور انہیں مسلمانوں کے معاملے میں صرف بغض اور تنگ نظری رکھنے کی بنا پر یہ اعلیٰ عہدے تفویض کر دیئے گئے تھے - لہٰذا ان کا یہ تقرر ریاستی مسلمانوں کے بارے میں ڈوگرہ شاہی حکومت کی آئندہ پالیسی کی وضاحت بھی کرتا ہے -

خوف و ہراس اور دہشت پسندی کے اس ماحول میں جہاں ہر طرف ریاستی مسلمانوں کے قتل عام کے منصوبوں کی افواہیں گرم تھیں، سری نگر میں سردار محمد ابراہیم خان کی رہائش گاہ پر کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا وہ تاریخی کنونشن منعقد ہوا جس میں کانفرنس کے کم از کم دو سو راہنماؤں اور کارکنوں نے شرکت کی جو ریاست کے اطراف و اکناف سے آکر یہاں جمع ہوئے تھے۔ جموں و کشمیر اسمبلی کے ان تمام ارکان نے بھی اس کانفرنس میں شمولیت اختیار کی جو جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے اسمبلی میں نمائندے تھے۔ اور آخر کار اس کنونشن نے ایک طویل غور و خوض کے بعد متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق غیر مشروط طور پر پاکستان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چودھری حمید اللہ خاں اور ان کے رفقائے کار نے اس بات پر زور دیا کہ ریاست میں پاکستان اور بھارت دونوں کی بالادستی سے الگ ایک آزاد و خود مختار حکومت قائم کی جائے۔ آزاد ریاست کے قیام کا مطالبہ کرنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ انہوں نے یہ مؤقف کل ہند مسلم لیگ سے مشورہ کے بعد اختیار کیا ہے۔ لیکن ان کے اس دعوے کی تصدیق کبھی خود قائد اعظم مرحوم کی زبانی سے نہ ہو سکی اور ریاست کے پاکستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ ہی بعد میں ایک تاریخی حیثیت اختیار کر سکا۔ پھر جب ۱۹۴۸ء میں مسئلہ کشمیر کا قضیہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے سامنے پاکستان کی طرف سے پیش کیا گیا تو کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی یہ تاریخی قرارداد بھی اس بات کے ثبوت کے لئے پیش کی گئی کہ کشمیر میں چونکہ مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ اس لئے وہ ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق ایک ناگزیر امر سمجھتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کشمیر کے تمام مسلمانوں نے خواہ وہ

ریاست کی کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہمیشہ مسلم کانفرنس کے اس فیصلے کی بھرپور حمایت کی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کا پاکستان سے الحاق ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہاں تک کہ شیخ محمد عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کے مسلمان ارکان بھی اس مسئلے پر مسلم کانفرنس کے فیصلے پر ہی متفق تھے۔ اور اپنے اسی مؤقف پر کاربند تھے کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ صرف ریاست کے عوام ہی کر سکتے ہیں۔ تاہم نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں نے اس مسئلے کو یہ نئی صورت دی کہ ریاست کی قانون ساز اسمبلی جو ان کے خیال میں ریاست کے عوام ہی کی منتخب و نمائندہ ہے ریاست کے الحاق کا جو بھی فیصلہ کرے وہ اسے تسلیم کر لیں گے۔ مگر دوسری طرف مسلم کانفرنس کا واضح طور پر یہ مؤقف تھا کہ چونکہ ریاست میں مسلمان باشندوں کو نمایاں اکثریت حاصل ہے۔ اس لئے ریاست کا الحاق فوری طور پر پاکستان سے کیا جانا ضروری ہے۔ اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس مسئلے پر بعد میں ریاست کے عوام کی بھی رائے لے لی جائے۔

جموں وکشمیر مسلم کانفرنس نے ریاست کے مہاراجہ کو بھی کنونشن کے اس فیصلے سے جو کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں منعقد ہوا تھا، آگاہ کر دیا تھا۔ اور اس فیصلے کی ایک کاپی "کل ہند مسلم لیگ" کو بھی ضروری کارروائی کے لئے بھیج دی گئی۔ کنونشن میں شریک ہونے والے نمائندہ ارکان کی روانگی سے پہلے سری نگر میں سردار محمد ابراہیم کے مکان پر کشمیر کے چوٹی کے مسلم راہنماؤں کا ایک خفیہ اجلاس بھی منعقد ہوا تاکہ پونچھ میں ڈوگرہ فوج کی تعیناتی سے پھیل جانے والے خوف و ہراس اور ریاست کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کے خلاف ڈوگرہ حکومت کی خطرناک سازشوں اور جوڑ توڑ کا سدِ باب کرنے

کے لئے بھی غور و خوض کیا جا سکے۔

اُدھر پنجاب میں بھی فرقہ وارانہ فسادات نے سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کا اثر پنجاب سے متصل سرحدی علاقے پونچھ پر پڑنا لازمی تھا۔ اور ان خفیہ مذاکرات میں مصروف مسلمان رہنما اس امر سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ پونچھ ہی ایک ایسا علاقہ ہے کہ جہاں سے ڈوگرہ شاہی کے خلاف کسی مؤثر تحریک کا آغاز کیا جا سکتا ہے اور اگر ڈوگرہ فوج نے پونچھ کے عوام کو ایک مرتبہ کچل ڈالا تو پورے کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف کسی سیاسی تحریک کا آگے بڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نازک صورت حال پر پوری طرح غور و فکر کرنے کے بعد کشمیری راہنماؤں نے پونچھ کے سیاسی کارکنوں کو یقین دلایا کہ اگر ڈوگرہ حکومت نے ان میں سے کسی ایک کو کسی مقام پر بھی گرفتار کیا تو مرکز میں ریاست کے پاکستان سے الحاق کی تحریک فوراً شروع کر دی جائے گی۔ اس اجلاس میں شریک تمام مسلمان راہنماؤں نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یہ حلف بھی اٹھایا کہ وہ عوام سے کئے ہوئے اپنے یہ وعدے بہر صورت پورے کریں گے۔

بعد ازاں حالات میں اچانک بڑی تیزی سے کچھ ایسی ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ کوئی بھی سیاسی راہنما صورتِ حال کا صحیح جائزہ لینے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پونچھ کے علاقے میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اور امن و سلامتی کی آڑ میں وہاں کے مسلمانوں پر ڈوگرہ فوج نے انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ کوئی بھی سیاسی راہنما یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ پونچھ میں ڈوگرہ فوج کے ظلم و ستم کا جواب کس طرح دیا جائے۔ مگر سب نے وہاں کے عوام کی امداد کے لئے اپنی بساط کے مطابق کوششیں شروع کر دیں —— اس کے کچھ عرصے بعد ہی سری نگر میں مسلم کانفرنس کی از سر نو تشکیل کا کام شروع کیا گیا

لیکن کانفرنس کے اخراجات کیلئے چندہ جمع کرنے کا کام ان حالات میں نہایت مشکل ثابت ہوا - چند پاکستانیوں نے کچھ امداد کی پیش کش ضرور کی - مگر وہ بھی بہت ناکافی تھی - لہذا مسلم کانفرنس کی تنظیم نو کی یہ مہم بھی کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اب مسلم کانفرنس بھی دو اختلافی گروہوں میں بٹ چکی تھی - اور جب تک ان دھڑوں کے یہ اختلاف ختم نہ کر دائے جاتے کسی ٹھوس اور منظم طریق کار کی توقع نہ کی جا سکتی تھی - پاکستان کے بعض سیاسی راہنماؤں نے مسلم کانفرنس کے اختلافی گروہوں کے درمیان اختلافات ختم کروانے کی کوششیں بھی کیں - لیکن چونکہ یہ اختلاف نظریاتی اور اصولی نہیں بلکہ ذاتی قسم کے تھے اور کانفرنس کا ہر راہنما کارکن اقتدار کا خواہاں تھا - اس لیئے تحریک آزادی کشمیر کے پاکستانی دوست بھی کشمیری راہنماؤں کے اختلافات ختم کروانے میں کامیاب نہ ہو سکے -

دوسری طرف اچانک اور غیر متوقع طور پر ڈوگرہ حکومت نے شیخ عبداللہ کی "نیشنل کانفرنس" پر سے پابندی ختم کر کے انہیں اپنی جماعت کو از سر نو منظم کرنے کی اجازت دے دی - اور کشمیر کے قوم پرست راہنما جو اب تک روپوش تھے - پھر میدان عمل میں کود پڑے - ادھر ڈوگرہ حکومت نے شیخ عبداللہ کو جموں جیل سے سری نگر میں منتقل کر کے ان سے ریاست کے مستقبل کے بارے میں سیاسی مذاکرات شروع کر دیئے - یہ بات ابھی تک مشکوک بھی تھی کہ شیخ عبداللہ ریاست کا الحاق کرنے کے مسئلے پر بھارت کی مکمل حمایت کریں گے - کیونکہ اُنکے حامیوں نے ابھی تک اس مسئلے پر کسی فریق کی بھی حمایت نہ کی تھی - جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈوگرہ حکومت نے ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق کا فیصلہ بڑی عجلت میں نہایت رازداری سے کیا تھا - تاہم مسلم کانفرنس کے راہنماؤں کو

سری نگر کے سیاسی حلقوں سے بات چیت کے بعد اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ شیخ عبداللہ اور ان کے حامی ریاست کے پاکستان سے الحاق کرنے کے فیصلہ کے مخالف بھی نہیں ہیں۔

ریاست کے سیاسی حالات ہر لمحے ایک نئی شکل اختیار کر رہے تھے۔ لہذا کشمیر کے وزیر اعظم پنڈت رام چند کاک کانگریسی راہنماؤں سے بات چیت کے لئے نئی دلی روانہ ہو گئے۔ جہاں انہوں نے قائد اعظم (مرحوم) اور ہندوستان کے آخری وائسرائے سے بھی ملاقات کے دوران بات چیت کی اور سری نگر واپس پہنچنے کے بعد پنڈت کاک نے مہاراجہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس موقع پر بالکل غیر جانبدار رہیں اور ہندوستان و پاکستان دونوں کے ساتھ بیک وقت اس امر کا معاہدہ کر لیں کہ فی الحال ریاست کے الحاق کا کوئی فیصلہ ان کی طرف سے نہ کر کے حالات کو جوں کا توں رکھا جائے گا۔

پنڈت کاک نے مہاراجہ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ڈاک اور تار کے محکموں کے انتظامات حکومت پاکستان کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اور ریاست کے الحاق کے مسئلے پر کشمیری عوام کی بعد میں رائے معلوم کر لی جائے اگر ریاست کے عوام پاکستان کے ساتھ الحاق کی رائے ظاہر کریں تو ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہی کر دیا جائے۔ لیکن مہاراجہ نے پنڈت کاک کی یہ تجاویز مسترد کر دیں اور انہیں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر کے ان کی جگہ شاہی خاندان کے ایک فرد جرنیل جناک سنگھ کو وزیر اعظم نامزد کر دیا۔ اور اس کے بعد مہاراجہ نے کانگریسی راہنماؤں کو کشمیر آنے کی دعوت دی۔ جن میں مہاتما گاندھی اور کل ہند نیشنل کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی بھی تھے۔ سری نگر میں ان ہندو راہنماؤں کی آمد سے کشمیری عوام پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مہاراجہ

ریاست کا بھارت سے الحاق کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اور اس صورت حال نے کشمیری مسلمانوں میں اور زیادہ بے چینی و بے اطمینانی کی لہر پیدا کر دی۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈوگرہ حکمرانوں نے بھی مسلمان عوام پر سختیوں میں اضافہ کر دیا۔ ڈوگرہ فوج نے پونچھ میں مسلمانوں پر جبر و تشدد کا بازار گرم کر دیا اور ریاست بھر کے مسلمان راہنما گرفتار کیے جانے لگے۔ اس طرح ظلم و تشدد کے ذریعے مسلمانوں کو دبانے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں۔ اور راقم الحروف کی گرفتاری کے فوری طور پر احکام جاری کر دیئے گئے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب پاکستان کی ایک آزاد مملکت معرض وجود میں آئی تو پاکستان کے حامیوں نے ریاست میں ایک شاندار ضیافت کا انتظام کیا جس میں کشمیری مسلمان راہنماؤں کے علاوہ کچھ سربرآوردہ پاکستانی راہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر راقم الحروف نے حاضرین کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ریاست کے پیش پا افتادہ الحاق کے مسئلے پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی اور مہاراجہ سے ایک بار پھر یہ مطالبہ کیا کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ عوام اور صرف عوام کی مرضی کے مطابق کیا جائے یا کم از کم اتنی اہمیت کے حامل فیصلہ سے قبل ریاست کے مسلمان راہنماؤں سے کوئی فیصلہ کن مشورہ ضرور کر لیا جائے۔ اس ضیافت کی تقریب کے موقع پر ریاستی مسلمان راہنماؤں کے پیش کیے گئے خیالات اور تقریب کی جملہ کارروائی سے مہاراجہ کو بھی آگاہ کر دیا گیا جس کے بعد راقم الحروف کی گرفتاری اور بھی زیادہ یقینی امر ہو گئی۔ اور اس نے تحریک آزادی کشمیر کو جاری رکھنے کے پیش نظر ریاست کو چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور جب سری نگر سے جان بچا کر وہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں ایک اور بھی قیامت صغریٰ کا منظر پیش آیا۔ کیوں کہ

ہندوستان سے جان بچا کر آنے والے زخمی پناہ گزین ہر طرف بے یار و مددگار پڑے ہوئے تھے اور ان میں سے ہر مسلمان مہاجر بھارت کے متعصب اور سنگدل ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام اور لوٹ مار کی ایک لرزہ خیز داستان اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھا۔ اور اس بات کا اندازہ کرنا کچھ آسان نہ تھا کہ جس نوزائیدہ ملک کو ساٹھ ستر لاکھ لٹے پٹے خانماں برباد اور بے سہارا مہاجرین کو پناہ دے کر از سرِ نو آباد کرنے کا نازک مسئلہ درپیش ہو اس کا وجود کس طرح برقرار رکھا جا سکے گا۔ لاہور میں پناہ گزینوں کے کیمپ ایک حشر خیز منظر پیش کر رہے تھے اور پاکستان کی تمام مسلمان فوج دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد سے اب تک ہندوستان کے دور دراز علاقوں اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں پڑی ہوئی تھی اور صرف ایک بلوچ رجمنٹ ہی اس تمام جدوجہد سے عہدہ برآ ہونے کیلئے مصروفِ عمل تھی۔ یہاں تک کہ اس نازک وقت میں قائدِ اعظم جیسا یقین محکم رکھنے والا انسان بھی مایوس اور دل شکستہ نظر آ رہا تھا۔ اور پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خان جو خاص طور پر مہاجرین کی آمد کے انتظامات کا معائنہ کرنے کے لئے لاہور آئے ہوئے تھے، اس قیامت خیز منظر کی تاب نہ لا سکے اور انہیں دل کا دورہ پڑ گیا۔ ایک طرف تو پاکستان میں کوئی ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جو اس نوزائیدہ مسلمان مملکت کا وجود برقرار رکھنے کی جدوجہد کے بارے میں پُر امید ہوا ور دوسری طرف خود غرض مفاد پرست اور ہوس کار مسلمان پاکستان سے ترکِ وطن کر کے جانیوالے ہندوؤں اور سکھوں پر بزدلانہ حملے کرنے اور ان کے مال و اسباب پر ہاتھ صاف کرنے میں لگے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں مشرقی پنجاب میں جس طرح مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا، پاک پنجاب اور صوبہ سرحد

سے ترکِ وطن کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں سے مقابلتاً اس کا عشرِ عشیر بھی نہ گیا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس قیامتِ صغریٰ کے دونوں پہلو ہمارے آنے والے مؤرخین ہی غیر جانبداری کے ساتھ قلم بند کرسکیں گے۔ کیونکہ مستقبل میں شاید اس گھناؤنے اور قابلِ نفرت دور کے کھائے ہوئے زخم سینوں میں مندمل ہو چکے ہوں گے۔ تاہم اس ماحول میں حکومتِ پاکستان سے کشمیری حرّیت پسندوں کیلئے کسی قسم کی امداد طلب کرنا اہلِ کشمیر کیلئے باعثِ ندامت تھا۔ البتہ پاکستان کے مخیر حضرات کشمیری حرّیت پسندوں کی عملی امداد کرسکتے تھے۔ لیکن آٹھ کروڑ پاکستانیوں کو مسئلہ کشمیر اور تحریک آزادئ کشمیر کی تفصیلات سے آگاہ کرنا بھی ایک نہایت دقّت طلب مسئلہ تھا۔ کیونکہ پاکستان کے ہر باشندے کو اپنے ہی اس قدر مسائل درپیش تھے کہ جن سے نپٹنے کیلئے ایک طویل عرصے تک جدوجہد کرنے کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں اس وقت پاکستان میں کوئی ایسی فعال اور سرگرمِ عمل سیاسی جماعت بھی موجود نہ تھی جو کشمیری عوام کی جنگ آزادی میں کوئی ٹھوس اور عملی امداد کرسکتی۔

(۴)

کشمیر میں ۴۷ء کی داستانِ مظالم

۴۷ء کے دوران برِ صغیر کے سیاسی حالات میں لمحہ بہ لمحہ سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور قیامِ پاکستان کا خواب ایک زندۂ جاوید حقیقت کا روپ دھار رہا تھا - اس صورتِ حال سے ریاست جموں و کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں کے اوسان خطا ہونے لگے تھے - اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف شدید جابرانہ کارروائیاں کرنی شروع کر دی تھیں - جموں کے ہندو افسر انتہا پسند ہندو مہاسبھائیوں کی حوصلہ افزائی کرنے پر کمربستہ تھے جو ریاست کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلنے کے منصوبے باندھ رہے تھے - ڈوگرہ حکومت اور ہندو افسروں کے اس رویّے سے جموّں کے مسلمانوں میں غم و غصہ اور خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ گئی تھی - جس کی وجہ سے ریاست میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کشیدگی دن بدن بڑھنے لگی تھی - ریاست کے مسلمانوں نے ڈوگرہ حکومت اور انتہا پسند ہندو جماعتوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے وسیع پیمانے پر قتلِ عام کی سازش کے باوجود، دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے

کا فیصلہ کر لیا۔ اور ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کا نعرہ ۔جسے ڈوگرہ حکومت کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ کشمیر کے گوشے گوشے میں گونجنے لگا۔ ریاستی مسلمانوں کی اس پُر عزم جد وجہد کے سامنے ڈوگرہ حکومت کو بالآخر جھکنا ہی پڑا اور اس نے مسلمان سرکاری افسروں پر سے مسلم لیگ کے روزنامہ ڈان دہلی کے مطالعہ کی پابندی اٹھالی ۔ لیکن ڈوگرہ حکومت خفیہ طور پر ان تمام مسلمان افسروں کی ایک فہرست تیار کرتی رہی جو روزنامہ ڈان پڑھتے تھے اور ریاست کا پاکستان سے الحاق کروانے کے حامی تھے ۔چنانچہ جونہی ڈوگرہ حکومت کے ہاتھ ذرا مضبوط ہوئے ۔ اس نے ریاست کے ان تمام مسلمان افسروں کو گرفتار کر لیا ۔جو کسی نہ کسی صورت میں ریاست کی تحریک آزادی کے حامی تھے ۔ اور قیام پاکستان کے بعد جو مسلمان افسر جان بچا کر پاکستان یا آزاد کشمیر میں پناہ نہ لے سکے انہیں ڈوگرہ حکمرانوں کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کرنا پڑیں ۔

۳ جون ۴۷ء کو حکومت برطانیہ نے برِصغیر کی آزادی کا اعلان کرتے ہوئے ۔ یہاں کے چالیس کروڑ باشندوں کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔ اور آزاد ہندوستان کے ساتھ ہی پاکستان کی آزاد و خود مختار مملکت بھی معرض وجود میں آگئی ۔ اس موقع پر برطانوی حکومت نے برِصغیر کی تمام نیم خود مختار ریاستوں کے سربراہوں کو بھی یہ اختیار دیا کہ وہ ۱۵ راگست ۴۷ء کو یا اس کے بعد پاکستان یا ہندوستان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کر کے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکتی ہیں ۔ مگر حکومت برطانیہ نے اس کے ساتھ ساتھ ان ریاستوں کے سربراہوں کو یہ بھی ہدایت کی کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ اپنا الحاق کرتے ہوئے اس امر کا بھی

لحاظ رکھیں کہ ریاستوں کے عوام کس ملک کے ساتھ اپنی ریاست کا الحاق چاہتے ہیں اور ان ریاستوں کے اقتصادی و معاشی حالات اور جغرافیائی محل وقوع کس ملک کے ساتھ ان کے الحاق کا تقاضا کرتے ہیں مگر برطانوی حکومت کے اس اعلان کے ساتھ ہی ریاست جموں و کشمیر کے ڈوگرہ حکمرانوں نے ایک منظم سازش کے تحت بھارت کے کانگریسی رہنماؤں سے گٹھ جوڑ شروع کر دیا۔ سب سے پہلے یکم اگست ۱۹۴۷ء کو مہاتما گاندھی نے ریاست کا دورہ کیا اور مہاراجہ سے طویل مذاکرات کیئے۔ اس کے فوراً ہی بعد کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی نے بھی سری نگر پہنچ کر مہاراجہ سے اس ضمن میں خفیہ بات چیت کے ذریعے اسے اپنا ہم نوا بنانے کی کوششیں شروع کر دیں بظاہر تو ڈوگرہ حکومت ریاست کے مسلمانوں کو یہی یقین دلاتی رہی کہ کانگریسی راہنماؤں کے یہ دورے اور خفیہ بات چیت ریاست کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ کانگریسی راہنما مہاراجہ کو ریاست کا پاکستان سے الحاق کرنے پر پیش بندی کے طور پر خطرناک حالات سے خوف زدہ کر رہے تھے اور ریاست کے پاکستان سے الحاق کی صورت میں ڈوگرہ راج کے ختم ہو جانے کا خدشہ ظاہر کر رہے تھے۔ کانگریسی راہنماؤں نے مہاراجہ کے سامنے اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی کہ پاکستان اقتصادی اعتبار سے اس قابل ہی نہیں ہے کہ آئندہ چھ ماہ تک بھی اپنا وجود قائم رکھ سکے۔

کانگریسی حکمرانوں کے ساتھ اس خفیہ گٹھ جوڑ کے فوراً بعد ریاست میں مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کی بھیانک سازش کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا گیا اور ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب ہر طرف ہندو اور سکھ دہشت پسند گروہوں نے مسلمانوں کا ریاست میں قتل عام شروع کر دیا تو ہزاروں ریاستی مسلمانوں نے

ریاست سے کوچ کر کے پاکستان میں پناہ لینی شروع کر دی۔ ڈوگرہ حکومت نے اپنی اس خونی سازش پر پردہ ڈالنے کے لئے پاکستان اور بھارت دونوں کے ساتھ ایک نئے معاہدے کی پیش کش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ فی الحال نہ کیا جائے بلکہ موجودہ صورت میں الحاق کے معاملے کو جوں کا توں قائم رکھا جائے۔ بھارتی حکومت نے مہاراجہ کی یہ تجویز مسترد کر دی۔ لیکن حکومتِ پاکستان نے مہاراجہ کے ساتھ اس نئے مگر عارضی معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ جس کے ذریعے ریاست میں پاکستان کو اصولی طور پر ایک قسم کی فوقیت حاصل ہو گئی۔ کیونکہ اس معاہدے کی رُو سے پاکستان ریاست کے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے انتظامی امور کرنے کا ذمہ دار قرار پاتا تھا۔ چنانچہ پاکستان ریلوے نے ریاست کی ریلوے کے انتظامات اور پاکستان کے محکمۂ ڈاک و تار نے ریاست کے محکمۂ ڈاک و تار کے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اگر ریاست کے پاکستان سے تعلقات خراب نہ ہوتے تو پاکستان ریاست کے دفاع اور امور خارجہ کے معاملات بھی اپنے ذمہ لے لیتا۔ ریاست کے مسلمان باشندوں کا خیال تھا کہ یہ معاہدہ ریاست کے پاکستان کے ساتھ باقاعدہ الحاق کا ایک پیش خیمہ بن جائے گا۔

ریاست کے مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کر کے اگرچہ وقتی طور پر ریاست کے مسلمانوں کو مطمئن کر دیا۔ تاکہ وہ مسلمانوں کا صفایا کرنے کے لئے اپنی نئی سازش کا تانا بانا تیار کر سکے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے منظم قتل عام نے مہاراجہ پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ طاقت کے ذریعے ایک اکثریتی طبقے کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اپنی طاقت کے بل پر

ریاستی مسلمانوں کو کچلنے کے بعد ریاست کا بھارت کے ساتھ بآسانی الحاق کرسکتا ہے۔ لہٰذا اس نے ریاستی مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کیلئے ریاست کے راشٹریہ سیوا سنگھی دہشت پسندوں کو اکسانا اور ابھارنا شروع کردیا اور ان کی مدد کیلئے بیرون ریاست سے سکھوں کے مسلح گروہ بھی منگوانے شروع کردیئے۔ اگست ۱۹۴۷ء کے وسط میں یہ تشدد پسند اور منظم گروہ اپنی ہولناک سرگرمیاں شروع کرنے کیلئے ریاست کی حدود میں داخل ہونے لگے۔ مہاراجہ کو معلوم تھا کہ ریاست کے مسلمان ان مسلح گروہوں کا مقابلہ کر کے اپنی حفاظت کرنے کے لئے ہتھیار سنبھال لیں گے۔ اور اس طرح وہ مسلمانوں کے اس دفاعی اقدام کو ڈوگرہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نام دے کر بھارتی فوج کو ریاست میں داخل ہونے کی اجازت آسانی سے دے سکے گا۔

اس سے پیشتر جولائی ۴۷ء میں وادی کانگڑہ کے راجوں نے بھی سری نگر میں ڈوگرہ حکومت سے مل کر ریاست بھر میں مسلمانوں کا وجود ختم کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ جس کے مطابق امرتسر سے راشٹریہ سیوا سنگھ کے مسلح گروہوں کو ریاستی مسلمانوں کے قتل عام کے لئے کشمیر میں آنے کی دعوت دی گئی اور اس منظم سازش میں ڈوگرہ فوج بھی برابر کی شریک کار تھی چونکہ انہیں معلوم تھا کہ پونچھ میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ زور ہے۔ لہٰذا اس علاقے میں سب سے پہلے ڈوگرہ فوج تعینات کی گئی جس نے تمام اہم مقامات پر ڈیرے ڈال دیئے۔ دریائے جہلم کے کنارے تمام اہم پلوں پر ان کی چوکیاں قائم کردی گئیں اور دریائی آمدورفت کی تمام کشتیوں پر بھی ڈوگرہ فوج نے قبضہ کرلیا۔

پھر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست کے مغربی حصے کے علاوہ۔ گلگت اور لداخ میں بھی مسلمانوں نے ڈوگرہ شاہی اقتدار کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے۔ اور ریاستی مسلمانوں کی بغاوت کی آگ دیکھتے ہی دیکھتے ریاست کے اطراف واکناف میں پھیل گئی۔ ڈوگرہ شاہی کے خلاف مسلمانوں کی اس عظیم جنگِ آزادی کی سب سے بڑی وجہ ریاستی مسلمانوں پر ڈوگرہ فوج کے ظلم وتشدد کے وہ بیشمار واقعات ہیں۔ جن کا ذکر کرنے کیلئے ایک الگ اور ضخیم کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ ریاست کے تمام ہندو اور سکھ باشندے مسلمانوں کے خلاف ڈوگرہ فوج کی جاسوسی کرنے کا کام کر رہے تھے! اور ڈوگرہ فوج جو ریاستی عوام کے جان ومال کی حفاظت کیلئے عوام پر بھاری ٹیکس لگا کر قائم کی گئی تھی۔ ریاست کے مسلمانوں کا خون بہانے اور ان کی عزت وناموس پر ڈاکہ ڈالنے میں مصروف تھی۔ ڈوگرہ فوج کے سروں پر صرف یہی ایک بھوت سوار تھا کہ وہ ریاست کے ایک حکمران طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اسے عوام کے خلاف ہر جائز و ناجائز اقدام کرنے کا حق حاصل ہے۔ ڈوگرہ فوجیوں کا آئے دن ریاست بھر میں مسلمانوں کا خون بہانا، ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنا اور مسلمان خواتین کی آبروریزی کرنا اور قرآن مجید کے نسخوں کو نذرِ آتش کرنا معمولی باتیں تھیں ریاست کے مسلمان راہنماؤں نے ڈوگرہ فوج کے ان انسانیت سوز مظالم کے خلاف متعدد بار مہاراجہ سے احتجاج کیا لیکن مہاراجہ نے کبھی مسلمان راہنماؤں کے ان احتجاجات اور شکایات کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔

ریاست جموں کے تمام علاقوں میں مسلمان باشندے انتہائی

خوف وہراس محسوس کر رہے تھے - اگرچہ یہاں مسلمانوں کی تعداد ۴۰ فیصد تھی - لیکن جموّں شہر - کٹھوعہ اور اودھم پور کے شہروں میں ہندوؤں کو اکثریت حاصل تھی جہاں زیادہ تر راجپوت - ڈوگرہ اور برہمن ذاتوں کے ہندو آباد تھے - جو اپنے سیاسی نظریات کے لحاظ سے کٹر مہاسبھائی تھے - اور ریاستی قوانین کی رُو سے انہیں ہر قسم کا آتشیں اسلحہ بغیر لائسنس کے رکھنے کا اختیار تھا - ہر ہندو باشندہ اپنے پاس کوئی نہ کوئی مہلک ہتھیار ضرور رکھتا تھا - ریاست سے باہر پنجاب بھر میں بھی اس وقت فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی ہر طرف قتل وغارت گری اور لاقانونیّت کا بازار گرم تھا - پنجاب کی سرحدی پولیس حالات پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی تھی اور امرتسر سے سکھوں اور راشٹریہ سیوا سنگھ دہشت پسند ہندوؤں کے مسلح گروہ بلا روک ٹوک ریاست میں داخل ہو کر خون خرابہ کر رہے تھے - ریاستی حکام جموّں بھر میں مسلمانوں کا صفایا کرنے پر تلے ہوئے تھے اور دہشت پسند جماعت راشٹریہ سیوا سنگھ کی تمام شاخوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کیلئے بھاری تعداد میں گولہ بارُود اور اسلحہ فراہم کیا جا رہا تھا -

اسی دوران سابق صوبہ سرحد سے سکھوں نے بھی مظفر آباد کے راستے وادئ کشمیر میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا - جو اپنے ہمراہ کافی تعداد میں اسلحہ اور گولہ بارُود سرحد سے وادئ کشمیر میں لے جاتے تھے - ریاستی پولیس کو سکھوں کی ان سرگرمیوں کا بخوبی علم تھا - مگر وہ ہمیشہ جان بوجھ کر ان کی اسلحہ فراہم کرنے کی سرگرمیوں کو نظر انداز کرتی رہی - سرحد سے آنے والے سکھ یہ اسلحہ مظفر آباد اور بارہ مولا کے گوردواروں

میں جمع کرتے رہے۔ جہاں ان کی حیثیت مضبوط تھی۔ یہ سکھ صوبہ سرحد میں مسلمانوں کے ظلم وستم اور لوٹ مار کی داستانیں جن میں سے اکثر من گھڑت ہوتی تھیں ریاست میں آکر بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ جس سے ان علاقوں کے باشندوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بارہ مولا اور پونچھ کے علاقوں میں سکھوں کی یہ فرقہ وارانہ سرگرمیاں روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھیں اور سابق صوبہ سرحد سے اسلحہ و گولہ بارود وسیع پیمانے پر اسمگل کر کے ریاست میں لانے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اور جولائی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے دوران ہی سکھوں نے کشمیری مسلمانوں پر قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے جموں کے دوسرے علاقوں میں بھی ڈوگرہ فوج اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے کشت و خون کا خطرہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ادھم پور، کٹھوعہ اور جموں میں ڈوگرہ فوج۔ دہشت پسند راشٹریہ سیوا سنگھی ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر دن دہاڑے قاتلانہ حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور نومبر ۱۹۴۷ء تک ان علاقوں میں مسلمانوں کا خون بہایا جاتا رہا۔

پونچھ کے مسلمان بھی ڈوگرہ فوج اور دہشت پسند ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو چکے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ڈوگرہ فوج نے پونچھ کے مسلمانوں کو ڈوگرہ حکومت کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کرنے یا پناہ لینے کے لئے پاکستان کی طرف راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کرنے کیلئے مسلمانوں کے قتل و غارت، لوٹ مار اور عورتوں کی عصمت دری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس سے تنگ آکر ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو پونچھ کے مسلمانوں نے ہتھیار سنبھال لئے اور ۲۲ اکتوبر کو قبائلی علاقوں کے پٹھان مجاہد بھی کشمیری مسلمانوں کی مدد کرنے

کے لئے مظفر آباد پہنچ گئے۔ جس کے بعد ڈوگرہ فوج اور مجاہدین آزادی کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ اور چند ہی روز میں مجاہدین نے ڈوگرہ فوج کے کئی دستوں کا صفایا کر دیا۔ چنانچہ قبائلی مسلمان مجاہدین کشمیری مسلمانوں کی مدد سے ڈوگرہ فوج کا صفایا کرتے ہوئے ۲۴، ۲۵ اکتوبر کو سری نگر کے گرد ونواح میں داخل ہو گئے۔

پونچھ کے عوام اس سے قبل جون ۴۷ء کے شروع میں ہی ڈوگرہ حکمرانوں کو ٹیکس نہ ادا کرنے کی مہم کا آغاز کر چکے تھے۔ پونچھ کے جاگیرداروں اور مہاراجہ کے درمیان کافی عرصہ سے اس معاملے میں ایک تنازعہ چل رہا تھا جس میں آخر کار مہاراجہ کامیاب ہوا۔ اور اس نے ان علاقوں کو اپنے مرکزی نظم ونسق میں شامل کر کے یہاں کے عوام پر بھاری ٹیکس لگانے شروع کر دیئے جس کے خلاف یہاں کے عوام نے احتجاج کی مہم شروع کر دی اور مہاراجہ نے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان احتجاج کرنے والے مظاہرین کو کچلنا اور دبانا شروع کر دیا پھر ۱۲ ستمبر ۴۷ء کو مہاراجہ کی طرف سے مندرجہ ذیل پریس نوٹ جاری کیا گیا:۔

"۱۲ اگست ۴۷ء کو مشتعل عوام کا ایک جم غفیر باغ تحصیل میں جمع ہو گیا اور ۲۵ اگست ۴۷ء کو حکومت کی جانب سے منتشر ہونے کے احکام کے باوجود یہ مشتعل ہجوم جس کی تعداد اب پانچ ہزار تک پہنچ چکی تھی باغ شہر میں داخل ہو گیا۔ آئندہ دو روز تک یہاں جمع لوگوں کے مشتعل احتجاجوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے جو کلہاڑیوں نیزوں اور دوسرے ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ۲۶ اگست ۴۷ء کو اس مشتعل ہجوم اور ڈوگرہ فوج کے درمیان ایک تصادم ہو گیا جس پر فوج نے

برین گنیں استعمال کر کے سینکڑوں احتجاج کرنے والے کسان مسلمانوں کو شہید اور شدید زخمی کر دیا۔ ڈوگرہ فوج کی اس سفاکی کی اطلاع پاکستان پہنچی تو پاکستانی اخبارات نے اس المناک خبر کو نمایاں حیثیت دی اور جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ بہر۲۴۔ ۲۵ اکتوبر کو مسلمان قبائلی پٹھانوں کے لشکر اور کشمیری مجاہدین سری نگر کے گرد و نواح میں پہنچ گئے تو مہاراجہ ہری سنگھ کو اپنی موت نظر آئی اور وہ وہاں سے راہ فرار اختیار کر گیا۔ ڈوگرہ فوج نے مہاراجہ کے فرار میں مدد کرنے کے پٹرول کے تمام ذخائر پر قبضہ کر لیا۔ اور صرف ان لوگوں کو پٹرول مہیا کیا گیا جو راجہ کے ہمراہ سری نگر سے بھاگ رہے تھے۔ راجہ نے اپنے تمام مال و اسباب اور زر و جواہر لاریوں میں لدوائے اور جو سامان لاریوں کی قلت کے باعث ان میں نہ سما سکا اسے تانگوں پر لدوا لیا۔ مہاراجہ اور اسکے ہمراہیوں کا یہ قافلہ رات کی تاریکی میں دو سو میل کے لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ راجہ نے ریاست کا صدر مقام درۂ بانہال کے پار ایک خفیہ مقام پر پناہ لے کر قائم کر لیا۔ اور سری نگر کے عوام کو اپنی ہندو رعایا سمیت مجاہدین جنگ آزادی کے حوالے کر کے راجہ کے تمام اعلےٰ حکام درۂ بانہال کی طرف کوچ کر گئے۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے پونچھ پہنچنے تک راستے میں کئی جگہ رک کر اپنی پولیس اور فوج کو یہ ہدایات بھی جاری کیں کہ ریاست کے ڈوگرہ راج کو مکمل تباہی سے بچانے کے لئے جو مسلمان باشندہ جہاں کہیں بھی نظر آئے اسے بلا دریغ قتل کر دیا جائے۔ اپنی یہ ہدایات اور احکامات جاری کرنے کے لئے راجہ نے بٹوود (BATOOD) اور کھنڈ کے مقامات پر بھی قیام کیا۔ جموں پہنچنے پر راجہ نے اپنی خاص نگرانی میں براہمنوں اور راجپوت

ہندوؤں کو جنگی ہتھیار تقسیم کروائے۔ سری نگر سے فرار کے دوران ہی ایک مرتبہ کٹھوعہ سے جموں جاتے ہوئے راجہ نے سڑک کے کنارے مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے دیکھ کر اپنے دلی اطمینان و مسرت کا بھی اظہار کیا۔ جموں شہر میں نواحی علاقوں اور دوسرے اضلاع سے بھی کثیر تعداد میں مسلمان آ کر پناہ لینے کے لئے جمع ہو گئے تھے اور ان کے اس اجتماع نے ڈوگرہ فوج اور مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہندوؤں اور سکھوں کو یہ موقع دے دیا تھا کہ وہ ان نہتے مسلمانوں کو ایک ہی جگہ جمع پا کر آسانی کے ساتھ بے دریغ قتل کر سکیں۔ چنانچہ جموں میں ڈوگرہ فوج دن دہاڑے دندناتی پھرتی تھی اور ان مسلمانوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے سے بھی نہ چوکتی تھی۔ جموں شہر کی مسلمان بستیوں کے پانی اور بجلی کی فراہمی کا سلسلہ بھی بند کر دیا گیا اور انہیں اشیائے خوردنی دینا بھی بند کر دیا گیا۔ جموں کے مسلمانوں نے جن کی قیادت میاں ناصر الدین احمد کر رہے تھے۔ ڈوگرہ فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور جس قدر بھی ہتھیار جمع ہو سکتے تھے کر لئے اور اگر ان مسلمانوں کو پاکستان پہنچنے والے کشمیری راہنماؤں کی طرف سے بروقت ضروری اسلحہ اور ہتھیار وغیرہ فراہم کر دیئے جاتے تو وہ بڑی اولوالعزمی سے وہاں رہ کر ڈوگرہ شاہی کے ظلم و تشدد کا منہ توڑ جواب دے سکتے تھے۔ آخر جموں کے مسلمانوں کی اپیل پر جب پاکستان سے کافی تعداد میں ہتھیار وہاں کے مسلمانوں کیلئے بھیجے گئے تو آمد و رفت کی دشواریوں اور رکاوٹوں کے باعث وہاں کے عوام کو کشمیری راہنماؤں کی یہ امداد بھی بروقت حاصل نہ ہو سکی۔

کشمیری مسلمانوں اور ڈوگرہ فوج کے درمیان جنگ کے دوران راجہ نے یہ اعلان کیا کہ جو مسلمان ہتھیار ڈال دیں گے انہیں فوج کی حفاظت میں پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ سینکڑوں سادہ لوح اور راجہ کے ظلم و تشدد

کے مارے ہوئے مسلمانوں نے اس اعلان کی صداقت پر یقین کرتے ہوئے ہتھیار ڈال کر خود کو راجہ کی ڈوگرہ فوج کے سپرد کر دیا۔ ان ہتھیار ڈالنے والے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایک کھلے میدان میں جمع ہو جائیں تاکہ انہیں لاریوں میں سوار کر کے پاکستان پہنچا دیا جائے اور جب وہ حکومت کے اس بھرے میں آ کر ایک کھلے میدان میں اپنے بیوی بچوں سمیت جمع ہو گئے تو انہیں کل ساٹھ لاریوں میں سوار کر لیا گیا۔ جو کٹھوعہ کے جنگل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جہاں اس قسم کے پناہ گزینوں کی اور بھی بہت سی لاریاں جمع تھیں۔ پھر یہاں پہنچ کر سکھوں ڈوگروں۔ راجپوتوں اور برہمنوں کے مسلح گروہ ان لاریوں میں بند مسلمانوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے انہیں لاریوں میں سے گھسیٹ گھسیٹ کر تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان ہزاروں مسلمانوں میں سے صرف چند ایک مسلمان ہی جانیں بچا کر بھاگنے اور پاکستان کے سرحدی شہر سیالکوٹ پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ جب ریاست کے مسلمانوں کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ذبح کیا جا رہا تھا۔ تو بھارتی فوج ریاست میں داخل ہو چکی تھی جو ان تمام حادثات قتل و غارت سے بھارت کے شانتی اور لامذہبیت کے بلند بانگ دعوے کرنے والے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کو آگاہ کر رہی تھی اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو کا دامن بھی کشمیر کے بے گناہ اور مظلوم مسلمانوں کے خون سے داغدار ہے اور (پنڈت نہرو آنجہانی) صرف یہ کہہ کر ہی بری الذمہ قرار نہیں دیئے جا سکتے کہ چونکہ شیخ عبداللہ نے ریاست کے سارے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ اس لئے ان پر بالواسطہ مظلوم کشمیری عوام کے قتلِ عام کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ جموں کٹھوعہ اور ادھم پور کے اضلاع سے کم از کم تین لاکھ مسلمان پناہ گزین مغربی پاکستان

میں آ چکے ہیں ۔ اس کے علاوہ جموں کی تحصیل میراں صاحب اور رنبیر سنگھ پورہ میں جو پناہ گزین مسلمانوں کے کیمپ لگائے گئے تھے انہیں بعد میں مشین گنوں کی باڑ مار کر نہایت بے دردی اور سفاکی سے ختم کر دیا گیا ۔ اس طرح مجموعی طور پر جموں کے علاقے میں ڈوگرہ فوج اور متعصب ہندوؤں اور دہشت پسند تنظیموں کے ہاتھوں کم از کم تین لاکھ مسلمان شہید ہو گئے ۔ اور ان علاقوں سے باقی ماندہ مسلمان مغربی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیئے گئے ۔ پاکستان میں کشمیری مہاجرین کے ساتھ جس حسن سلوک اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے ۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ۔ آج لاکھوں مجبور و مقہور اور بے سرو سامان کشمیری مہاجرین بڑے صبر و تحمل سے واپس اپنے وطن جانے کے لئے مسئلہ کشمیر کے فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں ۔ لیکن وہ دن جب وہ اپنے وطنِ عزیز میں واپس جا سکیں گے ۔ آج بھی اسی قدر دور نظر آ رہا ہے جس قدر کہ یہ دن اس وقت انہیں دور نظر آتا تھا جب وہ اپنے گھروں سے نکل کر پاکستان میں پناہ گزین ہوئے تھے ۔

جموں اور اس کے نواحی علاقوں میں مسلمانوں کے قتل عام کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کے ان علاقوں میں جنہیں ڈوگرہ شاہی کے اقتدار سے آزاد کروایا جا چکا تھا ۔ مسلمانوں کے دلوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و تشدد کے خلاف نفرت و انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ۔ اور جوں ہی جموں میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبر یہاں پہنچی مسلمانوں نے اس علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی جوابی کارروائی کے طور پر تہہ تیغ کرنا شروع کر دیا ۔ بعض مقامات پر تو بے گناہ بچے اور عورتیں بھی انتقام کی اس آگ سے نہ بچ سکے ۔ اور آزاد کشمیر کے ان علاقوں میں سکھوں اور ہندوؤں پر کی گئی ان زیادتیوں کو ہم کسی طرح بھی جائز قرار دیتے ہوئے ان کی صفائی نہیں پیش کر سکتے ۔ کیونکہ ظاہر ہے

کہ ان علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کے قتل کی وارداتوں کے ذریعے کٹھوعہ ۔ جموں اور ادھم پور کے اضلاع میں ہندو دہشت پسندوں کے چنگل میں گرفتار مسلمانوں کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی تھی ۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ہم آزاد کشمیر میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں سے حسنِ سلوک اور رواداری سے پیش آتے تو مستقبل کے مؤرخ کی نظر میں ہماری اس جنگِ آزادی کا وقار اور اہمیت بڑھ جاتی ۔ لیکن اُن حالات میں آزاد کشمیر کے مسلمانوں پر جموّں میں مسلمانوں کے قتل و غارت گری کا اثر ہونا ایک لازمی امر تھا ۔

قبائلی مجاہدین نے سری نگر پہنچتے ہوئے کیا کچھ کیا ۔ اس کی صحیح تصویر تو مستقبل کا مورخ ہی غیر جانبداری کے ساتھ پیش کر سکے گا ۔ کیوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جنگ میں فریقین حق گوئی سے بہت کم کام لیتے ہیں ۔ چنانچہ بھارتی اخبارات اور ریڈیو نے بھی اس وقت قبائلی مجاہدین کے ظلم و تشدد اور قتل و غارت کی من گھڑت داستانیں سنانی شروع کر دی تھیں تاہم مظفر آباد میں جو کچھ بھی ہوا اور ۲۲ ۔ ۲۳ اور ۲۴ اکتوبر ۴۷ء کو مسلمانوں نے جو کچھ بھی کیا اس کا بھی کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا ۔ لیکن قبائلی مجاہدوں پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ ذمہ داری تو ان پر عائد ہوتی ہے جو اس تحریکِ آزادی کو چلا رہے تھے ۔

اِدھر حکومتِ آزاد کشمیر نے اپنی تمام مشکلات کے باوجود ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کے لئے کیمپ قائم کئے جو عرصہ تین چار سال تک قائم رہے اور ان میں سے ایک کیمپ تو ۱۹۵۰ء تک بھی ان پناہ گزینوں کو ضروری سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے کام کرتا رہا ہے ۔ ان کیمپوں سے مقبوضہ کشمیر جانے والے ہندو سکھ پناہ گزین حکومت آزاد کشمیر کے سلوک کا

ثبوت دے سکتے ہیں۔ البتہ شروع شروع میں اس ضمن میں پناہ گزینوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ حالات کی ستم ظریفی کی بدولت ناگزیر تھا اور اس سلسلے میں راقم الحروف یہاں صرف ایک واقعہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے جو اسے پیش آیا۔ نومبر ۴۷ئہ میں مجھے میرپور کے دورے پر جانے کا اتفاق ہوا تو میں میرپور سے ۱۵ میل کے فاصلے پر واقع ... علی بیگ کے مقام پر ہندوؤں کے ایک پناہ گزین کیمپ کو بھی دیکھنے گیا جہاں مجھے میرے کئی وکیل ساتھی بھی ملے جو بڑی خراب و خستہ حالت میں تھے۔ میں نے ان سے اپنی دلی ہمدردی ظاہر کی اور ان سے وعدہ کیا کہ میں کسی نہ کسی صورت انہیں پاکستان میں بھجوا دوں گا۔ جہاں سے وہ بڑی آسانی کے ساتھ بھارت جا سکیں گے۔ کیونکہ آزاد کشمیر میں آمدورفت کی مشکلات کے باعث کوئی بڑا کیمپ قائم نہیں کیا جا سکتا تھا اور دو روز کے بعد جب میں دوبارہ انہیں دیکھنے کے لئے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کا معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ اور یہ جان کر مجھے جس قدر ندامت محسوس ہوئی وہ زندگی بھر کبھی محسوس نہ ہوئی ہوگی کہ میرے یہ دوست جن کی میں امداد کرنے کا وعدہ کر آیا تھا میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ میں نے کیمپ کے منتظمین پر بہت لعنت ملامت کی لیکن اس سے ان کے اس شرمناک فعل کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ جس کی بدولت ان بے گناہوں کو موت کی آغوش سے ہم کنار کیا جا چکا تھا۔ اور میرا ضمیر مجھے آج تک اس معاملے میں مطعون کر رہا ہے۔

(۵)

تحریکِ آزاد کشمیر کا پس منظر

مارچ - اپریل ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر اسمبلی کا بجٹ اجلاس شروع ہوا - جس میں راقم الحروف نے بھی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد پہلی بار حصہ لیا - اسمبلی کے انتخابات جنوری ۱۹۴۷ء میں منعقد کئے گئے تھے - جس کے بعد اسمبلی کا یہ پہلا اجلاس تھا - اور جیسا کہ عام طور پر بجٹ اجلاس میں گہما گہمی ہوا کرتی ہے - اس اجلاس کے لئے بھی بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا - اور اسے میری خوش قسمتی کہئے یا بدقسمتی کہ اسمبلی کے منتخب تمام مسلمان ارکان کو مسلم کانفرنس کے اسمبلی گروپ میں شامل کرنے کی ذمہ داری بھی میرے ہی سپرد کی گئی - اگرچہ اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی بیشتر تعداد مسلم کانفرنس کے ٹکٹ پر ہی منتخب ہوئی تھی - لیکن اسمبلی میں ایسے مسلمان ممبر بھی تھے جو دوسری سیاسی جماعتوں کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے - تاہم وہ مسلم کانفرنس کے نصب العین پر بھی یقین رکھتے تھے - لہذا انہوں نے بڑی خوشی سے اسمبلی کے مسلم کانفرنس

گروپ میں شمولیت اختیار کر لی ۔ اسمبلی کے اس اجلاس میں ریاست کی پرجا پریشد پارٹی اور راشٹریہ سیوا سنگھ کی تخریبی سرگرمیوں پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا گیا اور راقم الحروف نے اسمبلی کو واضح طور پر یہ بھی بتایا کہ ریاست کے مختلف حصوں میں کئی نیم فوجی جماعتیں قائم کی جا رہی ہیں جن کا مقصد محض مسلمانوں کا کشت و خون کرنا ہے ۔ اور میں نے اسمبلی کو اس موقع پر جس خطرے سے آگاہ کیا وہ بہت جلد اودھم پور ۔ جموں اور کٹھوعہ میں ایک خوفناک حقیقت بن کر سامنے بھی آ گیا ۔ اسمبلی کے مسلمان ارکان نے پونچھ اور میرپور میں مسلمانوں کے ساتھ ڈوگرہ فوج کے ناروا و ظالمانہ سلوک پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ۔ مسلمان ارکان کی یہ تقریریں دستوری طور پر تو اسمبلی کے ضابطۂ تحریر میں لے آئی گئیں ۔ لیکن انہوں نے ریاست بھر میں جن ہولناک حالات و خطرات کی طرف اشارہ کیا ان کی روک تھام کیلئے عملی طور پر کوئی اقدام حکومت کی طرف سے نہ کیا گیا ۔

آخر اپریل ۴۷ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے ریاست کے سرحدی علاقوں بھمبر ۔ کوٹلی ۔ مناوار ۔ میرپور ۔ پونچھ ۔ راولاکوٹ اور نوشہرہ وغیرہ کا دورہ کیا اور اسے ان علاقوں کے مسلمانوں کی جانب سے ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی تائید و حمایت کرنے پر اسی طرح تشویش و حیرت ہوئی جس طرح کہ اکتوبر ۴۶ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو کو سابق صوبہ سرحد کے دورہ کے بعد وہاں کے مسلمانوں کی طرف سے پاکستان کی حمایت کرنے پر ہوئی تھی اور مہاراجہ کو سب سے زیادہ تشویشناک صورت حال تو اس وقت ہوئی جب راولاکوٹ میں چالیس ہزار کشمیری مسلمانوں کے ایک عظیم اجتماع نے راجہ کا استقبال کرتے ہوئے ریاست کے پاکستان سے الحاق کرنے کی حمایت میں

پرجوش نعرے لگائے ۔ ان مظاہرین میں پونچھ کی باغ اور سدھنوتی تحصیلوں کے سابق فوجی بھی کثیر تعداد میں شامل تھے ۔ مہاراجہ نے اس دورے کے موقع پر اپنے ہندو افسروں کو یہ بھی ہدایت کر رکھی تھی کہ جہاں اور جب بھی ضرورت پڑے ریاست کے ہندو اور سکھ باشندوں کی ہر ممکن امداد کی جائے بعدازاں مہاراجہ نے جموّں کے مغربی اضلاع میں مزید ڈوگرہ فوج متعین کرنے کے احکامات بھی جاری کر دیئے ۔ اس کے علاوہ ڈوگرہ فوج کا ایک میرپور پونچھ بریگیڈ بھی قائم کیا گیا ۔ جس کی چھاؤنی نوشہرہ میں قائم کی گئی ۔ اور اس کے بعد ہی پونچھ بریگیڈ کے نام سے ایک نیا بریگیڈ بھی قائم کر دیا گیا ۔ جس میں ڈوگرہ ہندو سکھ اور گورکھا نوجوان شامل تھے اس کے علاوہ ڈوگرہ فوج کے جو گیریژن اپنی چھاؤنیوں میں مقیم تھے انہیں بھی چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں پھیل جانے اور دریاؤں کے اہم پلوں، بڑی بڑی سرکاری عمارتوں اور ذرائع مواصلات کی حفاظت کرنے پر مامور کر دیا گیا ۔

ریاستی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے بعد راقم الحروف اپنے انتخابی حلقے پونچھ اور خاص طور پر سدھنوتی اور باغ تحصیلوں کے دورے پر روانہ ہو گیا ۔ ریاست جموّں کی یہ دونوں تحصیلیں پاکستان کی سرحد سے متصل تھیں ۔ اور میں نے جموّں سے پونچھ جاتے ہوئے راستے میں جگہ جگہ قیام کر کے کشمیری مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ ایک سیاسی جماعت کی صورت میں منظم و متحدّ العمل ہو جائیں ۔ اپنی ان نجی ملاقاتوں میں، میں نے ان علاقوں کے مسلمانوں کو آئندہ پیش آنے والی ایک خطرناک صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس امر کا بھی شدید خدشہ موجود ہے کہ ڈوگرہ فوج اس علاقے کے مسلمانوں کی نسل کو ہی نیست و نابود کر دے ۔ ان حالات

میں کشمیری مسلمانوں کو میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ ایک فوجی تنظیم کی صورت میں مسلح ہو کر ان نازک حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے کمربستہ ہو جائیں۔ اور ان لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کے لئے میں نے کئی جگہ بڑی مؤثر اور زوردار تقاریر بھی کیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان علاقوں کے مسلمانوں کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ اور وہ ڈوگرہ راج کے ظلم و تشدد کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لئے فوجی تنظیموں کی صورت میں متحد ہونے لگے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی یہ دفاعی اور خود حفاظتی کی سرگرمیاں بالکل صیغۂ راز میں رکھیں۔ لیکن یہاں کے ہندوؤں نے میری تقریروں سے خائف ہو کر ڈوگرہ حکومت کو میرے خلاف انگیخت کرنے والی غیر ذمہ دارانہ تاریں دینا شروع کر دیں اور اسی دوران جبکہ میں راولاکوٹ کے مقام پر ٹھہرا ہوا تھا ایک رات اس علاقے میں کچھ غیر ریاستی لوگ گھومتے ہوئے دیکھے گئے۔ جن کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ وہ پنجاب کے علاقہ سے متعلق ہیں۔ مگر ڈوگرہ فوج نے ان پر مسلمانوں کا حامی ہونے کا شبہ کرتے ہوئے۔ گرد و نواح کے کئی دیہات پر چھاپے مارے اور کئی بے گناہ مسلمانوں کو گرفتار کر کے زد و کوب کرنا شروع کر دیا اور راولاکوٹ کے ایک قریبی گاؤں میں مسلمان خواتین کی بھی سر بازار آبروریزی کی گئی۔ اس شرمناک حادثے کے اگلے روز میں نے راولاکوٹ میں ایک جلسہ عام منعقد کروایا۔ جس میں علاقے کے بیس ہزار مسلمانوں نے جوق در جوق شرکت کی اور اس عظیم الشان جلسے میں ہندوؤں کے مظالم کے خلاف ایک نہایت باغیانہ تقریر کی۔ جس میں، میں نے کشمیری عوام کو بتایا کہ ریاست جموں و کشمیر کی سرحدوں سے ملی ہوئی مسلمانوں کی ایک آزاد و خود مختار مملکت معرض

وجود میں آ رہی ہے - اور قیام پاکستان کا یہ عظیم واقعہ کسی نہ کسی صورت میں ریاست کے مسلمانوں پر بھی اثر انداز ہو گا - لہٰذا میں نے انہیں تلقین کی کہ وہ اپنے حوصلے بلند رکھیں اور ڈوگرہ فوج کے ذلت آمیز سلوک کا منہ توڑ جواب دینے کیلئے تیار رہیں - اس روز کی تقریر کے بعد علاقے کی پُر سکون فضا میں ایک قسم کی ہلچل پیدا ہو گئی -

اسپنی اس تقریر کے بعد میں نے پونچھ کے ایک وزیر سے بھی طویل بات چیت کی تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ فوج کی ان جارحانہ سرگرمیوں کی روک تھام کرنے کا اختیار نہیں رکھتا - تاہم اس نے مجھ سے یہ وعدہ کیا کہ وہ راولاکوٹ کے قریبی گاؤں پر ڈوگرہ فوج کے حملے اور شرمناک حرکات سے ریاست کی مرکزی حکومت کو مطلع کر کے اس صوبیدار کی برطرفی کے احکام حاصل کرنے کی کوشش کرے گا - جس نے اس گاؤں پر چھاپا مارا تھا - پھر میں اپنے اہل و عیال کو لے کر پونچھ سے سری نگر روانہ ہو گیا - جہاں میں نے ریاست کے تمام حکّام کو پونچھ اور اس کے گرد و نواح کی نازک صورت حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی - لیکن مجھے ہر جگہ سے یہی ایک جواب ملا کہ یہ نازک صورت حال پیدا کرنے کی ذمہ داری خود راقم الحروف پر عائد ہوتی ہے - جس نے کشمیری مسلمانوں کے سامنے اس قسم کی تقریریں کیں - چنانچہ جون ۱۹۴۷ء کے آخر میں میری نقل و حرکت پر وہاں پابندی عائد کر دی گئی اور ۲ اگست ۱۹۴۷ء کو میری گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے گئے - لیکن پیشتر اس کے کہ ریاستی پولیس مجھے گرفتار کر سکتی میں جان بچا کر پاکستان پہنچ گیا -

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی آزاد و خود مختار اسلامی مملکت

کا وجود برصغیر کے مسلمانوں کے ایک خواب سے ایک ٹھوس اور ناقابل تردید حقیقت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ جس سے ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی فضا بھی یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ پندرہ اگست ۴۷ء کو سری نگر کے مسلمانوں نے قیام پاکستان پر کھلے بندوں اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کر کے اس بات کا واضح ثبوت پیش کر دیا کہ ریاست کے مسلمان، ریاست کا پاکستان سے الحاق کروانا ضروری سمجھتے ہیں۔ قیام پاکستان کی خوشی میں سری نگر میں جگہ جگہ جلسے منعقد کئے گئے اور بھاری جلوس نکالے گئے۔ شہر کی کم از کم ۵۰ فیصد عمارتوں پر پاکستانی پرچم لہرائے گئے۔ یہاں تک کہ دریائی نقل و حمل کے کام میں لائی جانے والی تمام کشتیوں کے مالکوں نے بھی اپنی کشتیوں پر پاکستانی پرچم لہرائے یہ کشتیاں دریائے جہلم میں بہتی ہوئی ایک قابلِ دید منظر پیش کر رہی تھیں۔ اگرچہ شیخ عبداللہ کی جماعت ابھی تک ریاست کے الحاق کے مسئلہ پر کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی لیکن ریاست کے مسلمانوں کی طرف سے پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی حمایت کے اس عظیم الشان مظاہرے نے شیخ محمد عبداللہ کے حامیوں کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ بدلے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر ریاست کے الحاق کے مسئلہ پر کشمیری عوام کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اکثر خوش عقیدہ کشمیری مسلمانوں کو یقین تھا کہ شیخ عبداللہ جیل سے رہا ہوتے ہی ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی حمایت کا اعلان کر دیں گے۔

دوسری طرف مسلم کانفرنس کے اکثر رہنما جیل میں بند تھے۔ اور جو ڈوگرہ شاہی کی قید و بند سے بچے ہوئے تھے وہ ریاست کے

پاکستان سے الحاق کے مسئلہ پر اتفاق رائے رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے ذاتی اختلافات رکھنے کے باعث کوئی راہ عمل متعین نہ کر سکتے تھے۔ کشمیری مسلمان ریاست کے پاکستان سے الحاق کے لئے ڈوگرہ شاہی تسلط کے خلاف آخری جنگ لڑنے پر آمادہ تھے۔
لیکن مسلم کانفرنس کے راہنما بھی ان کی قیادت کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ آغا شوکت علی نے جو اس وقت مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری تھے پندرہ روز کے لئے پیرول (عارضی رہائی) پر جیل سے باہر آئے ہوئے تھے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس وقت سری نگر میں موجود پاکستانی راہنماؤں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ کیونکہ اس مرحلے پر ہمیں مسلم لیگ کے اہم اور مفید مشوروں کی سخت ضرورت تھی۔ مسلم کانفرنس کے راہنماؤں میں سے کوئی بھی اتنی سیاسی بصیرت نہ رکھتا تھا کہ قیام پاکستان میں مضمر پیچیدگیوں اور ریاست کے سیاسی حالات پر ان کے اثرات کا اندازہ لگا سکے لہٰذا ہم ریاست کے پاکستان سے الحاق کے مسئلہ کو جلدبازی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لے کر زیادہ پیچیدہ اور ناقابلِ حل نہیں بنانا چاہتے تھے۔
اس دوران مسلم لیگ کے چند راہنما سری نگر کے دورے پر آئے لیکن انہوں نے مسلم کانفرنس کے راہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی بجائے شیخ عبداللہ کی "نیشنل کانفرنس" کے راہنماؤں سے بات چیت کی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ سری نگر میں ہی نہیں بلکہ مجموعی طور پر ساری ریاست میں ہی مسلم کانفرنس، نیشنل کانفرنس کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ "نیشنل کانفرنس" کے اکثر راہنما قومی نقطۂ نگاہ رکھنے کے باوجود برِصغیر کی تقسیم کے بعد ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان

سے الحاق ضروری سمجھنے لگے تھے۔ جہاں تک مسلم کانفرنس کی تنظیم کا تعلق ہے۔ جموں اور پونچھ کے علاقوں میں یہ جماعت اب بھی بڑی مستحکم تھی اور ان علاقوں کے مسلمان باشندے ریاست کا پاکستان سے الحاق کرانے کا قطعی طور پر فیصلہ کر چکے تھے اور دنیا کی کوئی طاقت اب انہیں اپنی ترقی کی طرف آگے قدم بڑھانے سے نہ روک سکتی تھی۔

جولائی ۱۹۴۷ء کے آخر میں پونچھ کے ضلع مجسٹریٹ نے پانچ یا اس سے زیادہ افراد کے اجتماع پر پابندی عائد کر دی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ضلع پونچھ اس سے پیشتر ہی مکمل طور پر ڈوگرہ فوج کے حوالہ کیا جا چکا تھا اور اس نے ضلع کے تمام اہم مقامات پر اپنی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ مگر اب پولیس نے اس علاقے کے تمام مسلمانوں سے ہتھیار بھی چھین لئے تھے جو ضلع مجسٹریٹ کی ہدایت پر ڈوگرہ فوج کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ اور اس نے یہ ہتھیار وہاں کے غیر مسلم باشندوں اور خاص طور پر ضلع ہزارہ سے یہاں آئے ہوئے سکھوں میں تقسیم کر دیئے تھے جنہیں اس سے قبل مظفر آباد میں باقاعدہ فوجی تربیت دے کر ضلع پونچھ اور باغ تحصیل کے مسلمانوں میں خوف وہراس پیدا کرنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ ڈوگرہ حکومت اور فوج کے اقدام سے یہاں کے مسلمان باشندوں میں اور بھی زیادہ سراسیمگی پیدا ہو گئی اور انہوں نے چوکنے ہو کر اپنی حفاظت کیلئے از سرِ نو جدوجہد شروع کر دی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے دوران دیہی علاقوں کے مسلمان راہنماؤں اور خاص طور پر سابق فوجیوں نے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ اپنی حفاظت و دفاع کیلئے سابق صوبہ سرحد کے قبائلی پٹھانوں سے ہتھیار خرید کر مقابلہ کر سکیں۔ کیونکہ اب یہاں کے مسلمانوں کو اس بات

کا بخوبی یقین ہو چکا تھا کہ وہ صرف اپنی جرأت و طاقت کے ذریعے ہی مہاراجہ کی مسلّح فوج کا مقابلہ کر کے اپنی جانوں اور عزت و ناموس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس علاقے کے بہت سے مسلمان گرفتاریوں سے بچنے اور اپنے خاندانوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے لئے پاکستان بھی روانہ ہو گئے تاکہ وہاں بیٹھ کر سکون اور دلجمعی کے ساتھ ڈوگرہ شاہی کے خلاف اپنی جدوجہد آزادی جاری رکھنے کی تدابیر پر غور و فکر کر سکیں۔

اسی دوران پونچھ میں ھجیرہ کے مقام پر جامع مسجد میں مسلمانوں کا بہت بڑا جلسۂ عام بھی منعقد ہوا۔ جس سے مقامی مسلمان راہنماؤں کے علاوہ آرونکا کے ایک سکھ خازن سنگھ نے بھی خطاب کیا۔ سکھ مقرر نے اس موقع پر مسلمانوں کے اس عظیم اجتماع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ ریاست میں مسلمانوں کو بھاری اکثریت حاصل ہے اس لئے ریاست کا الحاق اصولی طور پر پاکستان سے ہی ہونا چاہیئے۔ اور ریاست کے مسلمان حکّام کو چاہیئے کہ ریاست کے جو ہندو اور سکھ باشندے ریاست میں رہنا چاہیں۔ ان کے ساتھ مسلمان بھی حسنِ سلوک اور رواداری سے پیش آئیں۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں ریاست کی مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔ عوام کے اجتماعات اور جلسوں پر سے پابندی اٹھالی جائے اور ریاست کا پاکستان سے الحاق کیا جائے اور ریاستی عوام پر لگائے گئے تمام بھاری اور غیر ضروری ٹیکس واپس لئے جائیں۔ ان دنوں باغ کے علاقے

میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف زبردست احتجاجی سرگرمیاں جاری تھیں چنانچہ وہاں کے مسلمانوں کو کچلنے کے لئے پونچھ سے ہجیرہ کے راستے بھاری تعداد میں فوج طلب کرلی گئی ۔ باغ کے مسلمانوں نے فوج کے راستے میں پڑنے والے دیہات کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ وہاں آنے والی فوج کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرکے انہیں پسپا کرنے کی کوشش کریں چنانچہ کھائی گالہ کے مسلمانوں نے راولہ کوٹ کو جانے والی سڑک روک دی اور کلہاڑیاں لے کر ڈوگرہ فوج کے مقابلے پر اتر آئے ۔ لیکن مسلح فوج نے جواب میں ان پر گولی چلا دی جس سے تین مسلمان شہید اور متعدد زخمی ہو گئے ۔ اور فوج سڑک پڑے ہوئے درختوں کے تنے ، گیلیاں اور دوسری رکاوٹیں دور کرکے آگے بڑھ گئی ۔ باغ کے علاقے میں ڈوگرہ فوج اور پونچھ کے سابق مسلمان فوجیوں کے درمیان کئی زبردست جھڑپیں ہوئیں اور ڈوگرہ فوج کے انچارج کپتان بلونت سنگھ نے یہ بات تسلیم کرلی کہ ریاست کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل جائز ہے کہ ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیئے ۔ اور اس نے ایک مسلمان افسر کو کہلا بھیجا کہ وہ ڈوگرہ فوج سے برسرپیکار مسلمانوں کو سمجھائے کہ بلونت سنگھ کی ماتحت فوج ان سے جنگ کرنا پسند نہیں کرتی ۔ چنانچہ وہاں کے مسلمانوں نے اس کے بعد باہمی صلاح مشورہ کرکے فیصلہ کیا کہ باغ کے باہر کیمپ قائم کرکے تمام مسلمان وہاں منتقل ہو جائیں ۔ لہذا اس کے کئی روز بعد تک علاقے میں حالات پرسکون رہے ۔ لیکن ایک روز ڈوگرہ فوج نے پھر اس کیمپ کا محاصرہ کرکے رائفلوں اور برین گنوں سے کیمپ میں گھرے ہوئے مسلمانوں پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع کردی جس سے

بے شمار مسلمان شہید ہو گئے۔

اس وعدہ شکنی کے بعد ڈوگرہ فوج مسلمان اکثریت والے نواحی دیہات پر بھی چھاپے مارنے لگی۔ یہاں تک کہ اس فوج نے ایک قریبی گاؤں پر چھاپہ مار کر وہاں کے مسلمانوں کو دھمکی دی کہ مسلم کانفرنس کے علاقائی راہنما خادم حسین شاہ کو فوج کے حوالے کر دیا جائے ورنہ اس علاقے کے تمام مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ لہٰذا وہاں کے مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج کے قتلِ عام سے بچانے کے پیشِ نظر خادم حسین شاہ نے اپنے آپ کو ڈوگرہ فوج کے حوالے کر دیا اور جب ایک فوجی افسر نے اس سے یہ پوچھا کہ آخر مسلمان چاہتے کیا ہیں تو خادم حسین نے جواب دیا کہ ہم ریاست کی آزادی اور اس کا پاکستان سے الحاق کروانے کے خواہشمند ہیں۔ جس پر اُسے سینے میں سنگین گھونپ کر موقع پر ہی شہید کر دیا گیا۔

ان کارروائیوں کے بعد بھی راولاکوٹ اور پونچھ کے راستے مسلمانوں کو کچلنے اور ختم کرنے کے لئے ڈوگرہ فوج کو کمک پہنچتی رہی اور ریاست کے امن پسند ہندو مال افسر پنڈت رام چندر رینہ نے پونچھ میں مسلمانوں کا کشت و خون بند کروانے کے لئے اس علاقے کا دورہ کیا اور دہشت پسند ہندوؤں اور سکھوں کے ہتھیار چھیننے کی کوشش کی لیکن اس وقت سول حکام کے اختیارات ایک طرح سلب ہو کر ہی رہ گئے تھے۔ کیونکہ پونچھ کا یہ علاقہ جولائی ۴۷ء سے مکمل طور پر ڈوگرہ فوج کے حوالے کیا جا چکا تھا اور مہاراجہ اپنی فوج کو ریاستی مسلمانوں کے خلاف فوجی کارروائیوں کی خفیہ طور پر ہدایات جاری کر رہا تھا اور ریاست کے ہندو افسر بھی ڈوگرہ فوج کی کارروائیوں پر ان کی حوصلہ افزائی کر کے

انہیں اُکسا رہے تھے۔ کہ ریاست کے پاکستان سے الحاق اور ریاست میں خود مختار جمہوری حکومت کے قیام کا مطالبہ کرنیوالے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ باغ میں مسلمانوں کے کیمپ پر بے دردی سے گولی چلانے کے بعد ڈوگرہ فوج کے دستے ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح گروہوں کے ہمراہ مسلمان آبادیوں والے دوسرے دیہاتوں پر بھی تابڑ توڑ حملے کر کے مسلمانوں کا کشت و خون کر کے لوٹ مار کا بازار گرم کر رہے تھے۔ چنانچہ ان دیہی علاقوں کے مسلمان کافی تعداد میں جان بچا کر جنگلوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور مسلح ہندو غنڈوں نے پولیس اور فوج کی مدد سے مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنا۔ انہیں آگ لگانا اور مسلمان خواتین کی بے حرمتی کرنے کے شرمناک مظاہرے شروع کر رکھے تھے۔ راقم الحروف کو بتایا گیا کہ ایک تیرہ سالہ دوشیزہ پر ڈوگرہ فوج کے دس نوجوانوں نے مجرمانہ حملہ کیا اور وہ اس صدمے کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئی۔ ریاست کے مسلمان راہنماؤں کو ان سنگین حالات میں یقین ہو چکا تھا کہ مہاراجہ ریاست کے اسی فیصدی مسلمان باشندوں کی خواہشات کو نظر انداز کرتے ہوئے ریاست کا بھارت کے ساتھ زبردستی الحاق کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور جو شخص بھی اس صورت میں ریاست کے بھارت سے الحاق کرنے کی مخالفت کرے گا اسے بے رحمی سے کچل کر رکھ دیا جائے گا مہاراجہ کے اس منصوبے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مظفر آباد سے لیکر کٹھوعہ تک کے ان علاقوں کو جو پاکستان کی سرحد سے ملحق ہیں، مسلمانوں سے خالی کروا لیا جائے۔ کیونکہ ان علاقوں میں کم از کم دس لاکھ مسلمان باشندے آباد تھے۔

جنہیں ڈوگرہ فوج وہاں سے راہ فرار اختیار کرنے یا فوج کے ہاتھوں نہایت سفاکی سے جام شہادت نوش کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

کشمیری مسلمانوں نے جس طرح ریاست کے پاکستان سے الحاق کی تحریک چلائی اور جس کا آغاز پونچھ کے علاقے سے ہوا، کا ثبوت خود شیخ عبداللہ کے ایک بیان سے ملتا ہے جو انہوں نے ۲۱ اکتوبر ۴۷ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو دیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے اس وقت اپنے اس بیان میں کہا تھا کہ پونچھ میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے ڈوگرہ حکومت ریاست پر اپنی اجارہ داری سمجھتی ہے۔ پونچھ کے عوام پہلے مقامی حکمرانوں کے ظلم و ستم سہتے رہے اور پھر انہیں دربار کشمیر کے ظلم و ستم بھی برداشت کرنا پڑے جو پونچھ کے مقامی حکمرانوں کے بھی آقاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ پونچھ کے مقامی باشندوں نے اس سارے ظلم و تشدد کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا ہے۔ جسے فرقہ پرستی کا رنگ کسی طرح بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ریاستی حکومت نے پونچھ کے علاقے میں اپنی فوج بھیج کر وہاں کے مسلمان عوام میں خوف و ہراس اور سراسیمگی پھیلا دی ہے۔ لیکن وہاں چونکہ زیادہ تر سابق فوجی مسلمان آباد ہیں جو کہ متحدہ ہندوستان کی برطانوی فوج کے ملازم رہ چکے ہیں اور جہلم اور راولپنڈی کے باشندوں سے ان کے خاندانی رشتے ناطے بھی قائم ہیں۔ لہذا ڈوگرہ فوج کی اس علاقے میں آمد پر وہ لوگ سرحد عبور کر کے جہلم اور راولپنڈی کی طرف چلے گئے اور وہاں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر وہیں سے ہتھیار حاصل کر کے واپس آنے کے بعد ڈوگرہ فوج کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے ہیں اور ریاستی

فوج کئی علاقے ان کے سپرد کر کے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی ہے۔

اسی واقعہ کو ہندو کشمیری راہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز اس طرح بیان کرتا ہے۔ "پونچھ کے علاقے میں جہاں ہزاروں کی تعداد میں سابق فوجی مسلمان آباد ہیں۔ مہاراجہ اور اس کی نئی حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے اور بغاوت کی یہ لہر دیکھتے ہی دیکھتے میرپور کے علاقے تک بھی پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ یہ علاقہ بھی سابق مسلمان فوجیوں کا مسکن ہے۔ اور مہاراجہ ہری سنگھ اس بغاوت کی وجوہ معلوم کرنے کی بجائے بھارت کی نئی کانگریسی حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف رہا اور مسلمانوں کی مسلح بغاوت کو کچلنے کے لئے ڈوگرہ فوج کے دستے بھیجتا رہا یا بقول ایک راجپوت کرنل کے ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کی دھن میں لگا رہا۔ جنہیں یہ سابق مسلمان فوجی ڈوگرہ شاہی کے تسلط سے آزاد کروا چکے تھے۔ ڈوگرہ فوج عوام کی مشکلات اور مسائل کو پس پشت ڈال کر ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتی رہی۔ مسلمانوں کے گاؤں نذر آتش کئے جاتے رہے۔ اور بے گناہ مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی۔ سری نگر کے اخبارات کو ڈوگرہ فوج کی ان بہیمانہ کارروائیوں کی اطلاعات شائع کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اور نہ ڈوگرہ حکومت عوام کا خوف و ہراس دور کرنے کے سلسلہ میں کوئی سرکاری اعلان جاری کرنے کی زحمت گوارا کرتی تھی۔ پونچھ کے علاقے میں ڈوگرہ فوج نے یہ تمام ظلم و ستم ستمبر ۴۷ء میں ڈھائے ہیں اور ۲۳ اکتوبر ۴۷ء سے پیشتر کوئی قبائلی ڈوگرہ فوج کے خلاف جنگ کیلئے ریاست میں داخل نہیں ہوتا۔"

سری نگر میں ڈوگرہ حکومت کی بنیادیں ان پے در پے خون ریز حادثات و واقعات کے بعد متزلزل ہو چکی تھیں ریاستی حکام پونچھ میں مسلمانوں کی مسلّح بغاوت کے باعث بوکھلائے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو کچلنے کیلئے سری نگر سے بھی بھاری تعداد میں فوجی کمک پونچھ بھیجی گئی۔ جس سے اس علاقے کے مسلمانوں میں خوف و دہشت انتہائی بھیانک صورت اختیار کر گیا اور مسلمان راہنما یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ڈوگرہ حکومت اب انہیں بالکل ختم کر دینے کا تہیّہ کر چکی ہے ادھر ریاستی حکام کو یہ غلط فہمی بھی تھی کہ پونچھ میں ان تمام حالات کی ذمہ داری راقم الحروف پر عائد ہوتی ہے اور ایک مرتبہ ریاست کے وزیر اعظم ٹھاکر جنک سنگھ نے ایک وفد سے بات چیت کے دوران جس میں میں بھی شامل تھا واضح الفاظ میں اس طرف اشارہ بھی کیا۔ جس کا جواب میں نے پورے ضبط و تحمل کے ساتھ یہی دیا کہ اگر پونچھ کے علاقے سے ڈوگرہ فوج واپس بلالی جائے اور سول حکام کو علاقے کا نظم و نسق سنبھالنے کا موقع دے دیا جائے تو حکومت کو اس علاقے میں امن و امان کے قیام کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ لیکن ریاست کے وزیر اعظم کو میری اس تجویز کی تہہ میں بھی کوئی سازش چھپی ہوئی معلوم ہوئی اور قیام امن کی اس تجویز کو ٹھکرا دیا۔

ڈوگرہ حکومت نے ریاست کے چیف سیکرٹری کے ذریعے میرے نام احکام جاری کئے کہ میں سری نگر سے باہر نہیں جا سکتا اور اگر میں سری نگر کی شہری حدود میں رہوں تو حکومت کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن اگر میں نے پونچھ جانے کی کوشش کی تو

حکومت اسے برداشت نہ کرے گی۔ چنانچہ سری نگر سے پونچھ کے راستے میں پڑنے والے تمام سرحدی شہروں کو ہالہ، بانہال اور درہ حاجی پیر کے متعلقہ حکام کو میرے وہاں جانے کی صورت میں میری گرفتاری کے احکام صادر کر دیئے گئے۔ مگر اس دوران پونچھ میں رونما ہونے والے واقعات کی اطلاع مجھے کسی نہ کسی طرح برابر ملتی رہی وہاں کے مظلوم مسلمان بار بار مجھ سے امداد کا مطالبہ کرتے تھے کیوں کہ میں اس علاقے سے اسمبلی کا رکن بھی منتخب ہوا تھا۔ اسلئے مجھ پر ان بے کس مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کرنے کی قانونی اور اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ جو ڈوگرہ شاہی کے جبر و تشدد کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنی بساط اور ذرائع کے مطابق ان بے یار و مددگار کشمیری مسلمانوں کو ہر ممکن امداد و تعاون پیش کرنے کا فرض انجام دیا۔

۲۰ راگست ۴۷ء کو میں نے مسلم کانفرنس کے جنرل سکریٹری آغا شوکت علی کے ہمراہ جو پاکستان سے رخصت پر آئے ہوئے تھے۔ اور گل مرگ میں مقیم تھے اپنے چند دوستوں سے ملاقات کی تھی۔ ان دنوں جن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس کے پیش نظر یہ نہایت ضروری تھا کہ ہم ایسے باخبر دوستوں سے صورت حال کے بارے میں مشورہ کریں جو پاکستان کے سیاسی حالات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں لہذا پاکستان سے آئے ہوئے ان دوستوں نے ہمیں نہایت مفید اور کار آمد مشورے دیئے اور پاکستان کے متعلق حقائق سے آگاہ کیا۔ ان دوستوں سے ہماری دوسری ملاقات سری نگر میں ڈاکٹر محمد دین تاثیر (مرحوم) کی رہائش گاہ پر ہوئی اور ہم نے انہیں

کشمیر کی صحیح اور مکمل صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں پونچھ میں ڈوگرہ فوج کے ذریعے مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کے واقعات بھی بتائے۔ ان حضرات نے بھی اس وقت یہی خیال ظاہر کیا کہ اگر کشمیری مسلمانوں نے اپنے دفاع اور حفاظت کے لئے اس موقع پر ضروری انتظامات نہ کئے تو ڈوگرہ فوج کے ہاتھوں ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ کشمیر کی تازہ ترین صورت پر ان حضرات نے بھی یہی رائے پیش کی جو ہم اس بارے میں رکھتے تھے۔ پھر ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) کی قیام گاہ پر ایک اور ملاقات کے دوران یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اگر راقم الحروف کی گرفتاری یقینی ہو جائے تو یہ کوشش کی جائے کہ حکومت اسے راولاکوٹ میں گرفتار کرے۔ کیونکہ وہاں پچیس تیس ہزار افراد ایسے موجود تھے جو میری گرفتاری کے فوراً بعد اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر کے حکومت کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر سکتے تھے اور پونچھ کے وزیر نے سری نگر کے حکام کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ پونچھ میں میرا داخلہ نہایت خطرناک صورت حال پیدا کرنے کا موجب ہو گا اور اس علاقے میں میری گرفتاری حکومت کے لئے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دے گی۔ ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) کی قیام گاہ پر اس امر کا فیصلہ بھی کیا گیا کہ میں اب جلد از جلد پاکستان روانہ ہو جاؤں تاکہ دوسرے راستے سے پونچھ میں داخل ہو کر وہاں مسلمان عوام کی قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکوں۔ اسی دوران جموں کانفرنس کے قائم مقام صدر چوہدری حمید اللہ خان نے مجھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے مجھے ہدایت کی اگر ڈوگرہ حکومت انہیں گرفتار کر

لے تو مسلم کانفرنس کی صدارت کی ذمہ داری راقم الحروف سنبھال لے۔ یہ خط مجھے پاکستان آجانے کے بعد موصول ہوا، جسے ذیل میں من و عن پیش کیا جاتا ہے :۔

سری نگر

۱۷ ستمبر ۴۷ء

میرے عزیز سردار محمد ابراہیم خان!

ہم نے یہاں ڈوگرہ حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔ میں یہاں کشمیری عوام کے متعدد جلسوں سے خطاب کر چکا ہوں اور حکومت اب مجھے کسی وقت بھی گرفتار کر سکتی ہے۔ اس لئے میں نے مسلم کانفرنس کے ان ارکان سے مشورہ کرنے کے بعد جو یہاں موجود ہیں۔ اپنی گرفتاری کی صورت میں آپ کو اپنا قائم مقام صدر نامزد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ مسلم کانفرنس کے صدر کا ذمہ دارانہ عہدہ سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور آپ کسی بھی سیاسی جماعت سے باہمی تعاون کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور مسلم کانفرنس کے مستقبل سے متعلق فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ اور اس معاملے میں مسلم کانفرنس آپ کے ہر قول و فعل کی پابند ہو گی جو آپ کانفرنس کی بہتری کے لئے کریں گے مجھے اور میرے ساتھیوں کو یہ بھی یقین ہے کہ یہ جو ذمہ داری

آپ کو سونپی جا رہی ہے۔ آپ اسے نبھانے کے اہل ثابت ہوں گے اور مجھے آپ پر یہ بھی بھروسہ ہے کہ آپ یہ نئی اور اہم ذمہ داری پوری محنت، توجہ اور جانفشانی سے سرانجام دیتے رہیں گے۔ اور مسلم کانفرنس بھی آپ کی قیادت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گی اور اگر آپ کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو جائے تو اس صورت میں آپ بھی یہ ذمہ داریاں کسی اور شخص کو سونپنے کا حق رکھتے ہیں۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

آپ کا خیر اندیش

حمید اللہ خاں (دستخط کنندہ)

قائم مقام صدر کل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس

ذیلی نوٹ:۔ براہ کرم اس بات کو بھی مدنظر رکھیں کہ جب تک حکومت مجھے گرفتار نہ کرے تو آپ اس صورت میں بھی ریاست سے باہر رہ کر مسلم کانفرنس کی تحریک آزادی کے کام کو جاری رکھنے کیلئے میری طرف سے ہر طرح کا حق رکھتے ہیں۔

حمید اللہ خان (دستخط کنندہ)

میں نے آغا شوکت علی کے ہمراہ پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا اور ہم نے روانگی کی تاریخ بھی مقرر کر لی مگر ہم نے سری نگر سے اپنی روانگی کے ارادے کو صیغۂ راز میں رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن ڈوگرہ حکومت کو کسی نہ کسی طرح اس کی اطلاع مل گئی۔ اور جس روز ہمیں روانہ ہونا تھا، ڈوگرہ پولیس نے علی الصبح آغا شوکت علی

کو گرفتار کر کے قیدی بنا لیا اور جب میں صبح سات بجے آغا شوکت علی کے گھر پہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ انہیں گرفتار کر کے ان کے گھر پہ پولیس کا پہرہ لگا دیا ہے۔ پولیس کی اس ناکہ بندی کو دیکھ کر میں نے فوراً روپوش ہو جانے کا فیصلہ کر لیا اس روز میں عدالت میں بھی نہ گیا اور میں نے اپنے منشیوں کے ذریعے یہ افواہ پھیلا دی کہ میں اپنے ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں ایک روز کیلئے اسلام آباد گیا ہوا ہوں۔ پولیس میرے تعاقب میں اسلام آباد تک بھی پہنچی اور میں سارا دن اپنے گھر سے بھی غائب رہا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ پولیس نے میرے مکان کی بھی ناکہ بندی کر رکھی ہے پھر اسی روز ضلع ہزارہ کے حسین علی خاں اور مظفر آباد کے راجہ عبدالحمید خان نے میرے سری نگر سے نکل بھاگنے کیلئے ضروری انتظامات کیئے۔ اور آج مجھے یہ بات ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے کہ میں ان حالات میں سری نگر سے جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کس طرح کامیاب ہو گیا۔

سری نگر سے راہِ فرار اختیار کرنے کے سلسلے میں یہاں میں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ ایک روز جب ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) کی قیام گاہ پہ میرے سری نگر سے بھاگ نکلنے کے متعلق صلاح و مشورہ ہو رہا تھا تو ڈاکٹر تاثیر نے نہایت سنجیدگی سے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ میں برقع پہن کر سری نگر سے نکل جاؤں لیکن میں نے یہ مشورہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ میری نگاہ میں اگر پولیس مجھے برقع پہنے ہوئے گرفتار کر لیتی تو یہ معاملہ ہم سب کے لئے ذلت کا باعث ہوتا۔ میری جانب سے

یہ تجویز مسترد کر دینے کے باوجود یہ افواہ لوگوں میں ایک عرصے تک گرم رہی کہ میں نے برقع پہن کر سری نگر سے راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ خود ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے ۱۹۴۸ء میں اپنے مضمون میں اس معاملے کی واضح طور پر تردید کی تھی کہ میں سری نگر سے برقع پہن کر فرار ہوا تھا۔ حالانکہ جس روز میں سری نگر سے فرار ہوا میرا کمسن لڑکا جاوید بخار میں پھنک رہا تھا اور میرے ایک دوست ڈاکٹر نور حسین نے اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اپنے سر لی تھی اور میں نے اپنی سادہ دل بیوی کو بھی یہی یقین دلایا تھا کہ میں بہت جلد لاہور سے واپس آ جاؤں گا۔ میرے جن دوستوں نے میری خفیہ روانگی کا بندوبست کیا تھا۔ انہوں نے ہی سری نگر میں آخری رات میری پناہ کے لئے ایک (House Boat) یعنی بجرے میں قیام کرنے کا انتظام کیا تھا۔ ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پولیس مسلسل بارش کے باوجود میری تلاش میں مصروف تھی اور میں کسی نہ کسی طرح بحفاظت تمام مظفر آباد کے قریب ڈومیل کے مقام پر پہنچ سکا تھا۔ اگرچہ سری نگر سے ایبٹ آباد تک سفر کے دوران مجھے کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہ آیا۔ مگر بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈومیل کے کسٹم افسر کے پاس میری گرفتاری کے احکام موجود تھے۔ ہماری ٹیکسی جس میں، میں سفر کر رہا تھا کی تلاشی بھی نہ لی گئی حالانکہ اس میں دو مفرور مجرم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ جو سری نگر کی عدالت سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اگرچہ میں نے اس پوری ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا تھا۔ لیکن ڈرائیور نے اپنے ان مفرور مسافروں کو بھی اس ٹیکسی میں پناہ دے دی تھی۔ اور ریاست کی سرحد عبور کرنے کے بعد ان مفرور مجرموں

نے مجھے بتایا کہ وہ پولیس کی حراست سے نکل کر فرار ہوئے ہیں۔ لیکن میں نے انہیں اپنے بارے میں یہ نہ بتایا کہ میں بھی اسی طرح پولیس سے بچ کر راہِ فرار اختیار کر رہا ہوں۔

ایبٹ آباد پہنچنے کے بعد میں نے یہ افسوسناک خبر سنی کہ تحصیل باغ میں ڈوگرہ فوج نے دس ہزار مسلمانوں کے ایک اجتماع پر جو وہاں ایک پناہ گزین کیمپ کی صورت میں تھا۔ نہایت بے رحمی سے بزدلانہ انداز میں گولیاں چلا کر بے شمار کشمیری مسلمانوں کو شہید اور زخمی کر دیا ہے۔ ڈوگرہ فوج کی یہ سفاکی پونچھ کے مسلمانوں کے خلاف ایک کھلا ہوا اعلان جنگ تھا اور مجھے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اس علاقے کے مسلمان اب اپنی زندگی اور موت کی آخری کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اور اگر ہم نے انہیں جلد از جلد ضروری امداد بہم نہ پہنچائی تو ان کی زندگیاں خطرے میں پڑی رہیں گی۔ میں نے ایبٹ آباد میں ایک ہوٹل کے کمرے میں بیٹھ کر (جہاں میں مقیم تھا) پونچھ کے مسلمانوں کے نام تقریباً ایک سو خطوط تحریر کئے، جن میں ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے جان و مال کی حفاظت کیلئے سینہ سپر رہیں۔ میں نے ان خطوط کے ذریعے انہیں یہ بھی یقین دلایا کہ میں جلد از جلد ان کے لئے ہتھیاروں کا بندوبست بھی کر رہا ہوں۔ حالانکہ اس وقت تک میری سمجھ میں یہ بھی نہ آیا تھا کہ میں ڈوگرہ فوج سے نبرد آزما ان نہتے اور بے یار و مددگار کشمیری مسلمانوں کیلئے کیا اور کس طرح ٹھوس امداد فراہم کروں۔ تاہم مجھے اس بات کا ضرور یقین تھا کہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کیلئے حکومت پاکستان یا پاکستانی عوام کی طرف سے عنقریب

کوئی مؤثر امداد پہنچنے والی ہو گی۔ پونچھ میں ڈوگرہ فوج کے محاصرے کے باوجود میرے یہ خطوط ان لوگوں تک پہنچ گئے اور انہوں نے اپنی حفاظت و دفاع کے انتظامات کی ایک نئی جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن انہیں یہ بھی احساس تھا کہ ان کے پاس اپنی حفاظت کیلئے بہت کم ہتھیار اور اسلحہ بارود موجود ہے۔

مگر اسی دوران ڈوگرہ حکومت نے مندرجہ ذیل احکامات جاری کر دیئے :۔

(ا) عوام کے تمام ناجائز ہتھیار بحق حکومت ضبط کر لئے جائیں۔

(ب) پاکستان کی سرحد سے ملحقہ تمام ریاستی علاقے خالی کروا لئے جائیں۔

(ج) ڈوگرہ حکومت کو اس امر کا مجاز قرار دیا جاتا ہے کہ تخریبی سرگرمیوں کے شبہ پر کسی بھی شخص کو فی الفور گولی کا نشانہ بنا کر ہلاک کر سکتی ہے۔

(د) پونچھ اور میرپور میں مارشل لا نافذ کیا جاتا ہے۔

ان حالات میں ۲۸ اگست ۴۷ء کو میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا، جہاں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور کوئی کسی سے یہ پوچھنے والا نہ تھا کہ تم پر کیا گزر رہی ہے۔ چنانچہ میں تانگے والے کو پندرہ روپے لاہور ریلوے اسٹیشن سے انارکلی تک جانے کے لئے ادا کر کے وہاں پہنچا اور ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہوا۔ میں اپنے ساتھ میاں امیرالدین کے نام ایک پیغام لایا تھا۔ جو ان دنوں لاہور کارپوریشن کے میئر تھے۔ میں نے ان سے ملاقات کی اور ان کے ذریعے قائداعظم

محمد علی جناح (مرحوم) سے جو اس وقت پاکستان کے پہلے گورنر جنرل تھے ملاقات کی کوشش کی تاکہ ان کے سامنے کشمیر کی تازہ ترین صورتِ حال پیش کر سکوں۔ لیکن قائدِ اعظم نے مجھے ملاقات کا موقع نہ دیا۔ کیونکہ وہ ریاست جموں و کشمیر کی موجودہ صورتِ حال میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک دوست بی۔ اے ہاشمی، جن سے میری سری نگر میں ملاقاتیں ہو چکی تھیں کے ہمراہ پنجاب ایک مشہور مسلم لیگی راہنما راجہ غضنفر علی سے ملاقات کی جو ان دنوں محکمہ مہاجرین اور آبادکاری کے مرکزی وزیر تھے۔ اور ان سے درخواست کی کہ مجھے قائد اعظم (مرحوم) سے ملانے کا بندوبست کیا جائے۔ راجہ غضنفر علی (مرحوم) نے بھی اس سلسلے میں اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن انہیں قائد اعظم (مرحوم) سے کوئی رابطہ پیدا کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ ان دنوں پاکستان کے حالات کچھ ایسے نامساعد تھے کہ کوئی شخص بھی اس بات کی جسارت نہ کر سکتا تھا کہ قائد اعظم سے ملاقات کرے۔ اور انہیں کشمیر کی نازک صورتِ حال سے آگاہ کر کے وہاں کے لاکھوں بے یار و مددگار اور مظلوم مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج کے وحشیانہ ظلم و تشدد سے نجات دلا سکے۔ کیوں کہ اس وقت بھارت سے ترکِ وطن کر کے پاکستان میں پناہ لینے والے لاکھوں بے سہارا اور خانماں برباد مہاجرین کو پھر سے آباد کرنے اور انہیں روزگار مہیا کرنے کے مسائل ہی حکومت کیلئے ناقابلِ برداشت بوجھ بنے ہوئے تھے۔ اور پاکستان کا بڑے سے بڑا خیر خواہ بھی اس قسم کے شکوک و شبہات میں مبتلا تھا کہ آیا پاکستان آئندہ دو ماہ

تک بھی اپنا وجود برقرار رکھ سکے گا یا نہیں؟

یہاں میں پورے ایک ہفتے تک مختلف سیاسی راہنماؤں اور کارکنوں سے ملاقاتوں میں مصروف رہا تاکہ کسی طرح کشمیری حریت پسندوں کی عملی امداد کرنے کیلئے کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ مگر مجھے ہر جگہ ناکامی کا ہی سامنا کرنا پڑا تھا اور امید کی کوئی کرن دور دور تک نظر نہ آتی تھی میں نے لاہور کے تمام اخبارات کے مدیروں سے بھی ملاقات کی جو کشمیری مسلمانوں کی اپنی طرف سے پوری مدد کرنا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے مسئلہ کشمیر کے معاملے میں کشمیری حریت پسندوں کے مؤقف کی اپنے اخبارات کے ذریعے بھرپور حمایت بھی کی۔ تاہم لاہور کے دوران قیام میں تمام عرصہ مایوسی و ناامیدی کے حالات میں گھرا رہا۔ لہذا ایک ہفتہ کے بعد ہی میں اپنی اس جدوجہد میں ناکام ہو کر بالکل تھک چکا تھا۔ کشمیری مسلمانوں کی عملی امداد کیلئے میں ہر بڑے پاکستانی راہنما کے دروازے پر دستک دے چکا تھا۔ مگر میں ہر جگہ سے بالکل مایوس و ناامید ہو کر لوٹا تھا۔ لاہور کا شور و شغب اور گہما گہمی اب میرے لئے تکلیف دہ حد تک ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ اور مجھے یہاں ہر شخص خود غرض نظر آتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس شہر کے لوگ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ تجارت، گہما گہمی۔ اور حصولِ دولت و جائیداد کی لگن اپنے دامن میں کس قدر ناپائیداری لئے ہوئے ہے۔ آخر یہ لوگ اس بات کا احساس کیوں نہیں کرتے کہ ریاست جموں و کشمیر میں ان کے مسلمان بھائیوں کی ایک پوری قوم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کی فیصلہ کن جدوجہد جاری ہے۔ اور ڈوگرہ فوج ان کے ہم مذہب و نسل کشمیری بھائیوں

کوچن چن کر گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مگر یہ لوگ مال و دولت پیدا کرنے اور غیر مسلم تارکینِ وطن کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات نے میرے دماغ میں ایک قسم کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ اور مجھے کوئی شخص بھی ایسا نظر نہ آتا تھا جو میرے سینے میں چھپے ہوئے ان المناک جذبات و احساس کی داستان سن کر میرا شریکِ غم بن سکتا۔

ہر طرف سے مایوس ہوکر میں نے لاہور سے واپس جانے کیلئے اپنا سامان باندھ لیا۔ کیونکہ مجھے اپنی ان ذمہ داریوں کا شدت سے احساس تھا جو مجھے کچھ عرصہ پہلے اچانک سونپ دی گئی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کا بھی بہت دکھ تھا کہ اب کشمیری مسلمانوں کیلئے کوئی عملی اور ٹھوس امداد یہاں سے حاصل کرنے میں ناکام ہو چکا ہوں۔ مگر ان تمام مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوصف میں لاہور چھوڑنے سے قبل یہاں کے انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر سے آخری ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اور جب میں وہاں جا رہا تھا تو راستے میں نیلا گنبد کے قریب ایک موٹر میرے تانگے کے نزدیک آکر رکی اور موٹر میں سوار ایک صاحب نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ میں تانگے سے اتر کر ان کی موٹر میں آ بیٹھوں۔ چنانچہ میں ان اصرار اور درخواست پر کار میں بیٹھ کر ان کے ہمراہ ماڈل ٹاؤن روانہ ہو گیا۔ جہاں وہ اپنے ایک ہندو دوست کی خیریت دریافت کرنے جا رہے تھے۔ ہمیں ماڈل ٹاؤن جانے اور وہاں سے شہر واپس آنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اور اس مختصر سے

عرصہ میں، میں اپنے اس نئے دوست کو کشمیر کے سارے حالات و کوائف سے آگاہ کر کے کشمیری مسلمانوں کے لئے اس کی ہمدردیاں حاصل کر چکا تھا۔ اور مجھے اس بات کا ہرگز یقین نہ تھا کہ وہ کشمیری مسلمانوں کی امداد کیلئے اتنا کچھ کر سکے گا جتنا کہ اس نے بعد میں عملی طور پر کر دکھایا۔ تاہم میں اس شخص کو جو میری داستان غم سننے کے لئے آمادہ ہو۔ کشمیری مسلمانوں کی یہ المناک اور رحم طلب کہانی سنا کر اُسے اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا۔ میرے اس لاہوری دوست نے مجھے اپنی ہر ممکن امداد و تعاون کا عملی طور پر یقین دلا کر ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ وہ کسی قسم کی امداد فراہم کرنے سے پہلے کشمیر کے پیش آمدہ حالات کا خود مکمل طور پر جائزہ لے گا۔ لہذا اس نے تجویز پیش کی کہ وہ فوراً سری نگر روانہ ہو جائے گا۔ اور وہاں پہنچ کر تازہ ترین صورتِ حال کا مشاہدہ کرے گا۔ میں اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد کیلئے ہر اس تجویز کو قبول کرنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ڈوگرہ شاہی کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہو سکیں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ میں مری جا رہا ہوں اور وہ جب بھی سری نگر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ پہلی فرصت میں میرے پاس مری چلے آئیں۔

اس ملاقات کے بعد میرے اس دوست نے اس مسئلے پر اپنے بعض دوسرے دوستوں سے بھی مشورہ کیا اور میرے مری چلے آنے کے چند ہی روز بعد وہ بھی مری آن پہنچا۔ جہاں اس کی بیوی اپنے علاج معالجے کے سلسلے میں پہلے سے ہی مقیم تھی۔ لہذا وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر مری سے سری نگر روانہ ہو گیا۔ اور

تقریباً ایک ہفتے تک سری نگر میں قیام کر کے وہاں کے حالات و کوائف کا مطالعہ کرنے بعد میرے پاس مری واپس پہنچ گیا۔ اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے معاملے میں مجھ سے پوری طرح متفق ہے۔ اور اسے اس امر کا بھی بخوبی احساس ہے کہ ریاستی مسلمان اس وقت شدید خطرات میں گھرے ہوئے ہیں اور جب تک انہیں باہر سے امداد نہ دی جائے ان کی جان و مال کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔ میں اس بارے میں زیادہ تفصیل سے ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتا لیکن مجھے یہ اعتراف ضرور کرنا چاہئے کہ میرے اس مخلص و ہمدرد دوست نے کشمیری مسلمانوں کی مدد کیلئے اپنی طرف سے پوری دیانت داری اور خلوص کا مظاہرہ کیا میرے اس خیر خواہ اور دوست نے جنہیں میاں افتخار الدین (مرحوم) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جموں و کشمیر کی آزاد حکومت کے قیام کی تحریک کامیاب بنانے میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اور کشمیر کی تحریک آزادی کی وہ صدائے بازگشت جو کشمیر کی وادیوں اور پہاڑوں سے بلند ہوئی تھی دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل کر گونجنے لگی اور آج تک گونج رہی ہے۔ تاہم میاں افتخار الدین (مرحوم) نے جو پاکستان کے چند بڑے راہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے۔ جب سابق صوبہ پنجاب کی وزارت قبول کر لی تو انہوں نے تحریک آزادیٔ کشمیر کی تائید و حمایت سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔

(۶)

تحریکِ آزاد کشمیر کا آغاز

میں ، لاہور سے مری پہنچا تو وہاں میرے چند مہربان دوستوں نے میرے لئے ایک ہوٹل کے کچھ کمرے کرائے پر حاصل کر لئے اور فوجی اصطلاح میں ، میں نے اب مری میں مستقل طور پر اپنی چھاؤنی قائم کر لی تھی - اس ہوٹل کے ان مختصر سے مگر پرسکون کمروں میں بیٹھ کر رات کی تاریکیوں میں تو بہت کچھ کہا سنا جاتا مگر سارا دن یہاں ایک پراسرار سی خاموشی چھائی رہتی - اور کسی کو کانوں بھی پتہ نہ چلتا کہ رات کے تاریک لمحوں میں یہاں کیا منصوبے بنائے جاتے ہیں - یہاں تک پنجاب کی خفیہ پولیس بھی اپنی تمام تر فہم و فراست کے باوصف ہماری ان سرگرمیوں سے بے خبر تھی - کیونکہ ہم نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس کے لئے مری ایک نہایت ہی مفید اور مناسب مقام تھا - یہاں بیٹھ کر سری نگر اور کشمیر کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ رہنا بہت آسان تھا - اس کے علاوہ مظفر آباد ، پونچھ اور میرپور کے ملحقہ علاقوں سے بھی بآسانی رابطہ قائم رکھا جا سکتا تھا - مزید برآں رات کی تاریکی سے

فائدہ اٹھا کر دریائے جہلم کے ذریعے پونچھ کے عوام اور راہنماؤں سے بھی بغیر کسی خاص دقت کے رابطہ قائم رکھا جا سکتا تھا۔ اگرچہ دن کے وقت تو ڈوگرہ فوج ان تمام راستوں کی ناکہ بندی کئے رکھتی تھی لیکن رات کی تاریکیوں میں کشمیری عوام تک اپنا پیغام اور ضروری ہدایات پہنچانا اور پھر وہاں کے حالات معلوم کرنا کسی قدر آسان کام تھا۔

آخر ہم نے حالات کا بخوبی جائزہ لینے کے بعد کشمیری مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کو ڈوگرہ فوج کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے کشمیری عوام کو ڈوگرہ شاہی کے مقابلے پر میدان عمل میں کود پڑنے پر آمادہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر میں یہ اہم فیصلہ کرنے سے پیشتر اپنے سیاسی رفقائے کار سے مشورہ نہیں کر سکا تھا۔ کیونکہ وہاں میرے علاوہ میرا کوئی دوسرا قابلِ ذکر سیاسی رفیق موجود ہی نہ تھا۔ تاہم ڈوگرہ فوج کے خلاف باقاعدہ جنگ کا فیصلہ کرنے سے پیشتر میں نے کشمیر کے چند تجربہ کار اور سابق مسلمان فوجی افسروں سے ضروری صلاح و مشورہ ضرور کر لیا۔ اور انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر کے ان کی مدد طلب کی۔ ان فوجی افسروں نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان کو خطرے میں ڈال کر ڈوگرہ فوج کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کے لئے کئی قسم کی اہم دفاعی معلومات حاصل کیں اور ریاست میں ڈوگرہ فوج کی متعینہ صورتوں کا جائزہ بھی لیا۔ اس طرح رات کی تاریکیوں میں ان فوجی افسروں سے میری خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں میں فراہم کردہ معلومات کی بنا پر جنگ کے نقشے تیار کئے جاتے رہے اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات و خدشات کا پیش بندیوں کے طور پر حل بھی سوچا جاتا رہا۔۔۔

اور آخر کار ہم اپنے ان عظیم دوستوں کی مدد سے کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج اور اس کے دست راست راشٹریہ سیوا سنگھی دہشت پسند و مسلّح جتھوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے ایک واضح اور قابل عمل طریقِ کار مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اِس موقع پر میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس وقت ہمارے ذہن میں قبائلی مجاہدین کی کشمیری مسلمانوں کیلئے امداد و اعانت حاصل کرنے کا وہم و گمان تک نہ تھا۔ اور ڈوگرہ فوج کے خلاف جنگ کا نقشہ تیار وقت تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ قبائلی مجاہدین کی طرف سے بھی کسی قسم کی اعانت کو پیش نظر رکھا جاتا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جب کشمیری عوام کی امداد و اعانت کیلئے قبائلی مجاہدین کی اطلاع ملی تو یہ خبر ہمارے لئے بیک وقت نہایت تعجب خیز اور مسرت آگیں بھی ثابت ہوئی۔

ڈوگرہ فوج کی چیرہ دستیوں کے خلاف باقاعدہ صف آرا ہونے کا فیصلہ کرنے کے بعد ہم ہر قسم کا اسلحہ و بارود جمع کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے تو ہم نے توڑے دار بندوقیں جمع کرنی شروع کیں اور ان کے ساتھ ہی سابق صوبۂ پنجاب کے مختلف شہروں سے بارود اور کارتوس حاصل کرنے کی کوششیں بھی ایک مہم کی طرح جاری رکھی گئیں۔ اس کے بعد ہم نے تحصیل مری میں ماسیاں کے مقام پر کارتوس تیار کرنے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری بھی قائم کر لی۔ آخر اکتوبر ۱۹۴۷ء کے دوران ہم نے رات کی تاریکیوں میں یہ بندوقیں اور خود ساختہ اسلحہ دریائے جہلم کے راستے سے کشتیوں میں بھر کر کشمیری مجاہدین کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ہمارے

لئے اسلحے کا حصول بعض دوسرے ذرائع سے بھی آسان ہو گیا۔ کیونکہ کشمیر میں نہتے مسلمانوں پر ڈوگرہ فوج کے وحشیانہ مظالم کی دہشت ناک داستانیں مغربی پنجاب کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھیں اور تحصیل باغ کے بے شمار کشمیری مسلمان پنجاب کے مختلف شہروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جن کے کئی کیمپ تحصیل مری میں بھی لگے ہوئے تھے۔ اور مری کی بلند و بالا پہاڑیوں سے اس پار وادیٔ کشمیر میں، کشمیری مسلمانوں کے دیہات کو لگائی جانے والی آگ کے شعلے بھی بآسانی دیکھے جا سکتے تھے۔ جبکہ حکومت پاکستان پونچھ کے مسلمانوں پر ڈوگرہ فوج کے جبر و تشدد کے خلاف مہاراجہ کشمیر اور اسکی حکومت سے سخت احتجاج بھی کر چکی تھی۔ ہم نے ضلع راولپنڈی سے فوری طور پر جس قدر بھی ہتھیار فراہم ہو سکتے تھے حاصل کر کے کشمیری مجاہدین جنگ آزادی کو بھیج دیئے تھے۔

مری میں رہ کر ہم کشمیر کے مصیبت زدہ مسلمانوں کے لئے، پاکستانی عوام کی اخلاقی و عملی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بھی نہایت مؤثر طریقے سے کام کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے کشمیری مجاہدین آزادی کیلئے چندہ جمع کرنے کی مہم بھی یہیں سے شروع کی اور اس طرح جس قدر رقم بھی جمع ہوتی تھی اس سے سابق صوبہ سرحد سے وہاں کی ساختہ ایک نالی بندوقیں خرید کر انہیں ہم کشمیری مجاہدین کیلئے بھیج دیتے تھے۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ ہم تھوڑے ہی عرصے میں کافی تعداد میں بندوقیں اور ان کے کارتوس فراہم کر کے

وہاں بھیجنے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر کشمیر کے جس علاقے میں بھی یہ اسلحہ اور ہتھیار بھیجتے تھے وہاں کے عوام کے متعلق پہلے اس بات کا یقین اور ضمانت ضرور حاصل کر لیتے تھے کہ یہ کشمیری عوام ڈوگرہ فوج کے خلاف لڑنے کے لئے منظم و متحد اور آمادہ ہیں یا نہیں ؟

مری کے تحصیلدار راجہ سلطان محمود نے اس سلسلے میں اس وقت ہماری بڑی فراخدلی سے امداد و اعانت کی اور اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال کر بھی ہمیں اپنے اسلحہ کے خفیہ ذخیرے کے لئے اپنا مکان پیش کر دیا، جہاں سے ہم رات کے وقت جب ہر طرف ایک گہرا سناٹا طاری ہوتا تھا یہ اسلحہ خچروں پہ لاد کر دریائے جہلم کے اس کنارے تک پہنچا دیتے تھے جہاں وقت مقررہ پر کشمیری مجاہدین بکریوں کی کھالوں کے بنے ہوئے تھیلے[1] لئے ہمارے منتظر ہوتے اور وہ یہ اسلحہ ان تھیلوں میں بھر کر کشتیوں کے ذریعے دریا کے پار لے جاتے تھے - مری کے تحصیلدار صاحب نے اسلحے کی خفیہ طریقوں سے ترسیل کے لئے نہ صرف اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈالا بلکہ کئی مرتبہ اپنی جان پر کھیل کر بھی دریا کے اس پار اسلحہ بھیجنے کا یہ پوشیدہ سلسلہ نہایت دلیری سے جاری رکھا۔ کیونکہ ہم یہ سارا کام رات کی تاریکی میں نہایت رازدارانہ طریقے سے سرانجام دیتے تھے اور ہم نے کبھی پاکستان پولیس کو بھی اس معاملے میں اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش نہ کی تھی - ایک دفعہ پولیس نے ہمیں اسلحہ لے جاتے ہوئے دیکھ کر پکڑ بھی لیا۔ لیکن ہم نے اسلحہ لے جانے والوں کے ساتھ اپنا کوئی تعلق ظاہر کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر پولیس نے صرف اسلحہ لے جانیوالوں کو حراست میں لیکر اسلحہ

---

[1] مقامی زبان میں ان تھیلوں کو "شینا" کہا جاتا ہے۔

ضبط کر لیا اور ہمیں کافی تعداد میں اسلحہ سے ہاتھ دھونے پڑے۔

ہم نے اپنے اسلحہ کی ترسیل کیلئے مظفر آباد سے جموں تک کے علاقوں کو مظفر آباد سے بھمبر تک اور بھمبر سے جموں تک کے دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا مگر گلگت کا علاقہ ہم نے اپنی سرگرمیوں کیلئے مستثنےٰ قرار دے دیا تھا۔ کیونکہ وہاں کیلئے ایک علیٰحدہ فوجی تنظیم کام کر رہی تھی، جس کی عملی صورت یہ بن گئی تھی کہ ڈوگرہ فوج کے مسلمان افسروں نے بغاوت کر کے اپنی ایک علیحدہ فوجی تنظیم کے ذریعے گلگت کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جس کا تمام بندوبست ڈوگرہ حکومت کیجانب سے گلگت میں متعیّن کیے گئے مسلمان فوجی افسروں اور سپاہیوں نے بغاوت کے بعد خود ہی کر لیا تھا۔ لہٰذا ہم کشمیر کے مختلف علاقوں میں ڈوگرہ شاہی تسلّط کے خلاف نبرد آزما کشمیری مجاہدین کو ان کی ضرورت کے مطابق علیٰحدہ علیحدہ حیثیت میں اسلحہ فراہم کیا کرتے تھے۔ اور ہر علاقے میں جنگِ آزادی کی کمان بھی الگ الگ طور پر مختلف فوجی افسروں کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اسی طرح کشمیر کے سیاسی راہنماؤں نے بھی ڈوگرہ حکومت کے خلاف جہاد اور اپنی سیاسی راہنمائی کی سرگرمیوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے مختلف علاقے اپنے اپنے دائرہ عمل میں لے لئے تھے۔

کشمیر میں باقاعدہ جنگِ آزادی شروع کرنے سے پیشتر ہمیں اس بات پر سوچ بچار کرنے کی بھی اشد ضرورت تھی کہ منظم اور تربیت یافتہ ڈوگرہ فوج کے مقابلے میں ایک مسلح ہجوم کو بھیجنے کی بجائے ایک ایسی تربیّت یافتہ اور فن سپاہ گری سے واقف فوج تیار کر کے مقابلے پر

لائی جائے۔ جو حملہ آور دشمن فوج پر کاری ضربیں لگانے کی اہل ثابت ہو۔ اور ہمیں اس حقیقت و ضرورت کا بھی شروع سے ہی احساس تھا۔ کہ محض ایک مسلّح ہجوم تجربہ کار فوج کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری تھا کہ ہم کشمیری مجاہدین جنگِ آزادی کو باقاعدہ فنِ حرب و ضرب سے آگاہ کرنے کیلئے ان کی مناسب فوجی تربیّت کا بھی بندوبست کرتے اگرچہ مظفر آباد میں اس قسم کی ایک فوجی تنظیم موجود بھی تھی۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر پونچھ یا میرپور میں ہی یہ کام زیادہ مؤثر طریقے پر کیا جا سکتا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پونچھ میں ڈوگرہ فوج نے کشمیری مسلمانوں پر سب سے زیادہ ظلم و تشدّد کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ پونچھ میں سابق مسلمان فوجی افسر بھی کثیر تعداد میں آباد تھے جو اسی علاقے میں رہ کر ہی ڈوگرہ فوج کے مقابلے کے لئے کشمیری مجاہدین کی ایک تربیّت یافتہ اور ناقابلِ شکست فوج تیار کر سکتے تھے اور اس کام کے سلسلے میں خود راقم الحروف نے بھی کئی بار تاریک راتوں میں "شیناؔ" پر سوار ہو کر آنے والے ان نڈر دوستوں کی مدد سے دریائے جہلم عبور کر کے آزاد علاقوں کے ان جانباز مجاہدین سے ذاتی رابطہ پیدا کیا جو ڈوگرہ شاہی کے خلاف اپنی جنگ آزادی میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے نہایت جواں مردی سے جامِ شہادت نوش کر رہے تھے۔ اور ہمارے ان جانفروش دوستوں نے کشمیر کی جنگ آزادی کے آغاز میں ہی اپنی شجاعت اور جوانمردی کے ایسے ایسے جوہر دکھائے تھے کہ ان کی مثال جنگ آزادیٔ کشمیر کی پوری تاریخ میں آج تک نہیں مل سکتی اور ان جانفروش

لہ بکری کی کھال کے بنے ہوتے ہیں بیضوی مشک کی طرح ہوتے ہیں۔ جن میں ہوا بھر کر بوقت ضرورت ان کے ذریعے دریا میں تیرا بھی جا سکتا ہے۔

مجاہدینِ آزادی کی ناقابلِ فراموش قربانیوں کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے اور مجھے تو ان جانثارانِ آزادی کی صحیح تعریف و توصیف کیلئے مناسب الفاظ ہی نہیں ملتے لہٰذا ہم صرف ان شہیدانِ آزادی کیلئے خدا تعالےٰ سے ہاتھ اٹھا کر دعا ہی مانگ سکتے ہیں کہ وہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کی آنے والی نسلوں کو ان کی قربانیوں کا اجرِ عظیم دے۔

ستمبر ۴۸ء کی تاریک راتوں میں تاریخوں کی روشنی میں ان علاقوں میں جا کر ہم نے باقاعدہ آزاد کشمیر کی فوج تیار کرنے کی جدوجہد شروع کر دی جبکہ ڈوگرہ فوج کے کسی بھی وقت حملے کا خطرہ شمشیرِ برہنہ کی طرح ہمارے سروں پہ سوار رہتا تھا اور اسی طرح کے خطرات و خدشات میں گھِر کر ان کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے آزاد کشمیر فوج کے قیام کی کوششیں جاری رکھیں جو اب ایک بے قاعدہ رضاکار فوج سے ایک منظم و متحد صورت میں باقاعدہ فوج بنتی جا رہی تھی۔ پھر ہم نے کوہالہ سے لے کر میرپور تک آزاد فوج کے دستے متعین کرنے شروع کر دیئے اور ہر علاقہ میں متعین فوج کی کمان کے لئے الگ الگ کمانڈر بھی مقرر کر دیا گیا۔ مگر خطرناک سے خطرناک جنگی اسلحہ سے لیس اور تربیت یافتہ ڈوگرہ فوج کے بالمقابل آزاد فوج کے پاس صرف رائفلیں اور ان کے کارتوس ہی تھے اور آزاد فوج کو سامانِ خورد و نوش، کپڑے اور دوسری اشیائے ضرورت فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی صرف ان علاقوں کے مسلمان باشندوں پر تھی، جن علاقوں میں کہ یہ فوج اپنی دفاعی و حفاظتی جنگ لڑنے کے لئے متعین تھی۔ اور کشمیری مسلمانوں نے اس نازک ترین

دورہ میں اپنی جس یک جہتی، اتحادِ عمل اور اولوالعزمی کا ثبوت دیا چند ہفتے پہلے ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ عورتوں اور بچوں تک نے جس طرح اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر فوجی مجاہدین کیلئے اشیائے خوردنی مہیا کیں اور انہیں اسلحہ و بارود محاذ جنگ پر پہنچایا اس کی مثال دورِ حاضر کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ میری اس تعریف و توصیف کو خود ستائی اور جذبانیت پر مبنی قرار دیں لیکن راقم الحروف نے اس ضمن میں جو واقعات و حادثات اپنی آنکھوں سے دیکھے وہ ہر لحاظ سے ایک مثالی اور غیر معمولی نوعیت رکھتے ہیں۔

پھر جونہی آزاد کشمیر فوج نے اپنی جنگِ آزادی کا آغاز کیا، مختلف محاذوں سے ڈوگرہ فوج کے کئی مسلمان افسر اور فوجی جوان بھی ہماری آزاد کشمیر فوج کے ساتھ آملے۔ جس کی بدولت ہماری تحریک آزادی کو بہت تقویت حاصل ہوئی ڈوگرہ فوج کے کئی مسلمان افسروں نے تو آزاد فوج میں شامل ہو کر باقاعدہ ہماری فوج کی کمان بھی سنبھال لی اور ان میں سے کئی ایک جانثارانِ آزادی، ڈوگرہ فوج کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت بھی نوش کر گئے۔ ان مجاہدینِ آزادی نے میرپور کے محاذ کی ڈوگرہ فوج کا خاص طور پر بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا اور دشمن کو عبرتناک شکست دے کر پسپا کر دیا۔ اگرچہ تاریخِ آزادیٔ کشمیر میں ان سب مجاہدین کا ذکر انفرادی حیثیت میں نہیں آسکے گا۔ لیکن جب تک جموں و کشمیر کا وجود دنیا کے نقشے پر موجود ہے، تاریخ ان مجاہدین جنگِ آزادی کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

کچھ عرصے بعد آزاد کشمیر فوج کی کمان کیلئے غیر منقسم ہندوستان کی برطانوی فوج کے مسلمان افسر بھی پاکستان سے یہاں آنے شروع ہو گئے۔ جنہوں نے کشمیر کی جنگِ آزادی میں نہایت قابلِ تعریف کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن بعد میں پھر ان سیاسی افسروں نے سیاست میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور مختلف فوجی افسر مختلف سیاسی گروہوں سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ ان کے سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کا یہ جذبہ ایک بالکل فطرتی قسم کا جذبہ تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر وہ اس کی بجائے اپنا وقت اور قوت آزاد کشمیر فوج کی تنظیم و تربیت کرنے پر صرف کرتے تو آج انہیں کشمیری عوام میں زیادہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ دوسری طرف ان فوجی افسروں کے سیاست میں کود پڑنے سے جنگ آزادی کو ضعف بھی پہنچا مگر بعض مخلص اور انتھک پاکستانی افسر آخری وقت تک بڑی تن دہی سے بے لوث ہو کر اپنے فوجی فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔ مجھے یہاں کسی فوجی افسر کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی میں اسے مناسب خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک لاحاصل بحث چھڑنے کے سوا اور کوئی مفید مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت اس وقت ہم چاہتے یہ تھے کہ جنگِ آزادی کشمیر پوری تیاری کے بعد شروع کی جائے اور ڈوگرہ فوج کے اڈوں پر شب خون مار کر انہیں دور دور تک پسپا کر دیا جائے۔ مگر کشمیری مسلمان ڈوگرہ فوج کے روز افزوں ظلم و تشدد سے اس قدر تنگ آ چکے تھے کہ وہ جلد از جلد ان کے خلاف جنگ شروع کر دینے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ کئی محاذوں پر اس وقت قبل از وقت ہی جنگ کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہمیں کافی نقصان

بھی اٹھانا پڑا تھا۔ کیونکہ ان محاذوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دینے کے باعث ڈوگرہ فوج کو ہماری خفیہ جنگی تیاریوں اور کشمیری مسلمانوں کے عزائم کا بخوبی پتہ چل گیا تھا۔ اور ڈوگرہ فوج نے سری نگر کی مرکزی حکومت کو ریاست میں انقلاب برپا ہو جانے کے خطرے سے آگاہ کر کے مزید فوجی کمک اپنے محاذوں پر طلب کر لی تھی۔ اس کے علاوہ آزاد فوج نے اپنی طرف سے جنگ جاری رکھنے اور اپنے لئے اسلحے کا معقول ذخیرہ جمع ہونے اور مزید فوجی کمک پہنچنے کا انتظار کئے بغیر ہی جنگ شروع کر دی تھی جبکہ اس وقت تک ان کے پاس دستی بم بھی نہیں تھے چنانچہ اپنی عجلت پسندی کی وجہ سے بھی انہیں کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف ڈوگرہ فوج ریاست کے تمام ذرائع مواصلات پر قابض تھی۔ اور بغیر کسی دقت کے اپنی چھاؤنی سے اسلحہ بارود منگوا سکتی تھی۔ مگر مجاہدین آزادی کو رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپا کر، خفیہ راستوں اور کشتیوں کے ذریعے دریائے جہلم کو عبور کر کے اسلحہ بھیجنا پڑتا تھا۔ بعد میں جب انہیں ہمارے اس ذریعے کا علم ہو گیا تو انہوں نے مجاہدین کو اسلحہ پہنچانے والی ان کشتیوں کو بھی نذر آتش کر دیا۔ پھر یہ جنگی سرگرمیاں قبل از وقت شروع ہو جانے کی بنا پر ہم ڈوگرہ فوج کی ان چوکیوں پر بھی قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔ جن کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ ہم اگلے دو روز کے اندر اندر ان پر قبضہ کر لیں گے۔ ہماری جنگی سرگرمیوں سے چوکنے ہو کر ڈوگرہ فوج نے اپنے مورچے مضبوط کر لئے اور آزاد فوج کے مقابلہ پر اپنی تین انچ کی مارٹر توپیں اور برین گنیں استعمال کرنی شروع کر دیں۔ جبکہ ان سے مقابلہ کرنے کیلئے آزاد فوج کے پاس صرف

کی ایک نالی رائفلیں (جو دیسی ساخت کی تھیں) ہی موجود تھیں - ان پے در پے ناسازگار حالات و واقعات نے بھی ہمیں خاصا نقصان برداشت کرنے پر مجبور کیا اور باغ، راولہ کوٹ اور کوٹلی کے محاذوں پر آزاد فوج کے لئے جنگ جاری رکھنی ناممکن ہو گئی - مگر خوش قسمتی سے جب پونچھ کی تحصیل سدھنوتی سے ڈوگرہ فوج پسپا ہو گئی تو آزاد فوج کو پونچھ میں اپنی جنگِ آزادی جاری رکھنے کے لئے ایک ایسا مقام حاصل ہو گیا جہاں وہ نہایت مضبوطی سے اپنے قدم جما کر آگے بڑھ سکتی تھی - ادھر ہم نے تراڑ کھیل میں نئی فوجی بھرتی اور تربیت کیلئے ایک مرکز قائم کر لیا تھا - جہاں کم از کم اتنی فوج ضرور تیار کی جا سکتی تھی کہ پونچھ کے محاذ پر اپنی کمک باقاعدگی سے بھیجی جا سکے - اسی طرح ایک تربیتی مرکز ہم نے تحصیل باغ میں ہری گل کے مقام پر بھی قائم کر دیا - اور اگر ہم اس وقت پونچھ کے تمام علاقے میں ڈوگرہ فوج کی ساری چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے ان پر قابض ہو جاتے تو آزاد فوج یقیناً ایک ماہ کے اندر اندر ڈوگرہ فوج کو پے در پے شکستیں دے کر سری نگر اور جموں کے دونوں اہم ریاستی شہروں پر قبضہ کر لیتی مگر ہماری جنگِ آزادی کے راستے میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہمارے پاس ذرائع مواصلات اور اسلحہ کا فقدان تھا - جو حملہ کرنے کے لئے نہایت ضروری تھا - ہمیں ہر محاذِ جنگ پر بھارتی فوج کی مضبوط چوکیوں پر حملہ کرنا تھا اور بھارتی فوج صرف دفاعی جنگ میں مصروف بھی اس کے علاوہ اب بھارتی فوج اپنے بمبار طیارے بھی میدانِ جنگ میں لے آئی تھی - جس کی وجہ سے مجاہدینِ آزادی کیلئے پونچھ - کوٹلی

اور نوشہرہ کے محاذوں پر دن کے وقت جنگ جاری رکھنا بڑا محال اور ناممکن ہو گیا تھا اور آزاد فوج کے لئے اس بات کا کوئی امکان باقی نہ رہا کہ دن کے وقت بھارتی فوج کے ٹھکانوں پہ بھرپور حملہ کر سکے۔ چنانچہ مجاہدین آزادی نے رات کی تاریکیوں میں بھارتی فوج پہ تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔ مگر بھارتی اور ڈوگرہ فوج ان حملوں کے جواب میں اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتی کیونکہ اسے اس بات کا فکر نہ تھا کہ اس کے پاس گولہ بارود کی کمی پیدا ہو جائے گی بھارتی اور ڈوگرہ فوج ایک منظم اور باقاعدہ فوج کی طرح جنگ کر رہی تھی جس کے پاس کمک حاصل کرنے کے تمام معقول ذرائع بھی موجود تھے اور جنگ کے لئے ہر قسم کا جدید ترین اسلحہ بھی بافراط موجود تھا۔ اس کے برعکس آزاد فوج کے پاس ذرائع نقل وحمل تھے نہ جدید اسلحہ انہیں میسر تھا۔ اور نہ ہی جنگی تربیت کے لحاظ سے وہ بھارتی اور ڈوگرہ فوج کے ہم پلہ قرار دی جا سکتی تھی۔

اِن تمام مشکلات کے باوجود ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء تک آزاد فوج جسے عوامی فوج کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پونچھ شہر کے علاوہ ضلع پونچھ کا تمام علاقہ بھارتی فوج کے تسلّط سے آزاد کرا چکی تھی۔ علاوہ ازیں کھنوئی تک راجوری اور میرپور کے اضلاع ڈوگرہ شاہی کے تسلط سے آزاد کرائے جا چکے تھے۔ اور دشمن اس علاقے میں اب صرف نوشہرہ پہ قابض رہ گیا تھا۔ جہاں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ڈوگرہ فوج نے اپنی چھاؤنی قائم کر کے بڑی مضبوطی سے اپنے قدم جما رکھے تھے مظفرآباد کے محاذ پر آزاد فوج سری نگر تک بڑھتی چلی گئی۔ جسے بعد میں پھر چکوٹی کے مقام تک پسپائی اختیار کرنا پڑی اور آج بھی ہماری فوج

اسی مقام پر موجود ہے۔ ہماری فوج ہندواڑہ تحصیل کا تمام علاقہ ڈوگرہ شاہی سے آزاد کرواتی ہوئی سوپور تک پہنچ گئی تھی۔

دوسری طرف گلگت کے محاذ پر آزاد فوج گلگت کا تمام علاقہ آزاد کروا کر سری نگر سے تیس میل کے فاصلے تک لداخ کا تمام علاقہ بھی بھارتی فوج کے تسلط سے آزاد کروانے میں کامیاب ہو چکی تھی جنگِ آزادی کے دوران جن مجاہدین آزادی نے لداخ کے برفانی علاقوں میں نقل و حرکت کی سہولتوں کے بغیر جنگ جاری رکھی ان کے حوصلے بھی قابلِ صد تحسین ہیں۔ کیونکہ ان برفانی علاقوں میں ایک مستقل فوج کیلئے بھی زیادہ عرصے تک جنگ جاری رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن کشمیر کی جنگِ آزادی کے دوران اکثر ایسے معجزے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ اب یہ ایک الگ بات ہے کہ تاریخ میں اس عظیم جنگِ آزادی کو اس کا صحیح مقام دیا جاتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس مفاد پرست دنیا میں کسی شخص سے بھی کسی قسم کے صلے کی امید رکھنی ایک خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔

(۷)

قبائلی مجاہدین کی سرگرمیاں

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے آغاز کیساتھ ہی، سابق صوبۂ سرحد اور اس سے ملحقہ دوسرے قبائلی علاقوں کے عوام نے بھی اس جنگِ آزادی میں حصہ لے کر اپنے لئے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ متحدہ ہندوستان میں برطانوی دورِ حکومت کے دوران، حکومتِ برطانیہ سرحدی پٹھانوں اور خاص طور پر قبائلیوں کو اپنا اور ملک کا دشمن قرار دیتی رہی اور برطانوی حکومت کو ان علاقوں میں امن قائم رکھنے کے لئے اس صوبے کے سرحدی علاقوں کے ساتھ ساتھ قبائلی خطوں میں بھی بھاری فوج رکھنی پڑتی تھی قیامِ پاکستان کے فوراً بعد حکومتِ پاکستان نے اپنے حکومتی تدبر اور فہم و فراست کا ثبوت دیتے ہوئے ان قبائلی علاقوں کی سرحدوں سے اپنی تمام فوج واپس بلا لی۔ اور قبائلی عوام سے نہایت دوستانہ و برادرانہ رویّہ اختیار کر لیا۔ حکومتِ پاکستان کے رویّے میں اس تبدیلی کی بدولت قبائلی عوام کا طرزِ عمل بھی یکسر تبدیل ہو گیا۔ اور وہ حکومتِ

پاکستان کو اپنا دوست سمجھنے لگے ۔ دوسری طرف حکومتِ پاکستان بھی انہیں اپنا خیر خواہ اور مددگار سمجھنے لگی ۔

قبائلی عوام عموماً اور ان میں سے مہمندی اور محسودی قبائل کے عوام خصوصاً بڑے جنگجو اور دلیر ہیں ۔ ان کے علاوہ افغانستان کے سلیمان خیل قبیلہ سے تعلق رکھنے والے عوام بھی فنِ حرب وضرب میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں ۔ اور یہ بات تمام دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ قبائلی عوام اگر دنیا کے بہترین نشانچی نہیں تو ان کا شمار دنیا کے بہترین نشانچیوں کی صفِ اوّل میں ضرور کیا جا سکتا ہے ۔ کشمیر میں جنگ آزادی کے دوران ان جانباز قبائلیوں نے اپنی شجاعت ودلیری کی محیّر العقول مثالیں پیش کیں مجھے کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران قبائلی مجاہدین کے ذاتی طور پر کئی ایسے حیرت انگیز کارنامے یاد ہیں جن میں انھوں نے اپنی مردانگی اور پامردی کا ناقابلِ فراموش مظاہرہ کیا ۔ اور اگر حکومت پاکستان ان شیر دِل قبائلی مجاہدین سے اسی طرح اپنے حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتی رہے تو یہ قبائلی عوام یقیناً پاکستان کے سچے دوست اور مددگار ثابت ہوں گے ۔

تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر ناقابل برداشت مظالم ڈھانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا تو مسلمانوں پر فرقہ پرست ہندوؤں اور سکھوں کے بہیمانہ مظالم کی داستانیں نہ صرف پاکستان بلکہ دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں ۔ اور ساری دنیا یہ جان گئی کہ بھارت میں متعصّب اور فرقہ پرست ہندو وسکھ مسلمانوں کی جانوں کے لاگو ہو کر انہیں کس طرح تہہ تیغ کر رہے ہیں ۔ کس طرح سربازار مسلمان خواتین کی آبرو ریزی ہو رہی ہے اور مسلمانوں کے معصوم بچّوں کو ان کے ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے کس

قدر شقیق القلبی سے قتل کیا جا رہا ہے۔ جونہی سرحدی پٹھانوں اور قبائلیوں کو بھارتی ہندوؤں اور سکھوں کے ان غیر انسانی مظالم کا علم ہوا وہ اپنے ہتھیار سنبھال کر مغربی پنجاب پہنچ گئے۔ اور حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرنے لگے کہ انہیں سرحد عبور کر کے مشرقی پنجاب جانے کی اجازت دی جائے تاکہ فرقہ پرست ہندوؤں اور سکھوں سے مسلمانوں کے خونِ ناحق کا بدلہ لیا جا سکے مگر حکومت مغربی پنجاب نے نہایت دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان قبائلی مجاہدین کو پنجاب کی سرحد عبور کرنے کی اجازت نہ دی مگر قبائلی و پاکستانی عوام نے حکومتِ مغربی پنجاب کے اس دانشمندانہ اقدام کو کبھی پسند نہ کیا۔

اگست، ستمبر اور اکتوبر ۴۷ء کے دوران مغربی پنجاب کے اخبارات میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر مظالم کے ساتھ ساتھ۔ کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ فوج کے جبر و تشدد کی لرزہ خیز داستانیں بھی شائع ہو رہی تھیں اور یہاں کے اخبارات کی اطلاعات سے ثابت ہوتا کہ کشمیر میں بھی مسلمانوں کا وہی حشر ہو رہا ہے جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا کیا جا رہا ہے۔ ان دنوں ڈوگرہ فوج جموں، اودھم پور اور کٹھوعہ میں مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف تھی۔ ظلم و تشدد کی ان داستانوں سے متاثر ہو قبائلی عوام اور صوبہ سرحد کے پٹھان جن میں ایبٹ آباد اور اس کے نواحی علاقوں کے لوگ شامل تھے۔ ایک بڑے لشکر کی صورت میں مظفر آباد کے راستے کشمیر میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ مظفر آباد میں سکھوں کو اکثریت حاصل تھی۔ اور بارہ مولا ان کا ایک گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے سکھوں نے کثیر تعداد میں اسلحہ بارود جمع کر رکھا تھا۔ علاوہ ازیں سابق صوبہ سرحد

سے آنے والے سکھ بھی جو اپنے ساتھ ہی وہاں سے دیسی ساخت کے کافی ہتھیار لے آئے تھے۔ مظفر آباد اور اس کے گرد و نواح میں جمع ہو گئے تھے۔ اور سکھوں کی اس مسلح جماعت نے یہاں آنے کے بعد نہتے مسلمانوں کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے باعث مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان وادئ کشمیر میں بھی کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ مظفر آباد کے علاقے میں ان ہتھیار بند سکھوں نے مسلمان عوام کے امن و سکون کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اور اس بات کا کسی وقت بھی خدشہ لاحق تھا کہ وہ یہاں مسلمانوں کا خونِ ناحق بہانے پر اتر آئیں۔ ان مخدوش حالات میں سرحدی پٹھانوں اور قبائلی پٹھانوں کا لشکر کشمیری عوام کی امداد کے لئے وادئ کشمیر میں داخل ہو گیا۔ دوسری طرف ڈوگرہ فوج کے مسلمان دستے بھی جنگ کے دوران مجاہدین آزادی سے آملے۔ اور ایک ہفتے کے اندر اندر کوہالہ سے لے کر سری نگر تک کے علاقوں میں ڈوگرہ فوج کا قلع قمع کر دیا گیا۔ ان مجاہدین جنگ آزادی نے فوج اور قبائلی پٹھانوں کی مدد سے سری نگر کے نواحی علاقے شالٹنگ تک کا تمام علاقہ ڈوگرہ فوج کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کروالیا۔ اور بڈگام کے ہوائی اڈے کا بھی محاصرہ کر لیا گیا۔ مگر ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارتی فوج بھی باقاعدہ ریاست میں داخل ہو گئی۔ اور مجاہدین آزادی کو ان کے حملوں کی بدولت اوڑی و چناری تک پسپا ہونا پڑا۔ تحریکِ آزادئ کشمیر کی پوری تاریخ میں ڈوگرہ شاہی جبر و تشدد کے خلاف جنگِ آزادی کے یہ ایام بڑے کٹھن اور فیصلہ کن تھے اور مجاہدین آزادی اگر ان دنوں سری نگر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے جسے مہاراجہ اور

اس کی فوج پہلے ہی مرحلے ہی نہایت بزدلی سے پسپا ہو کر چھوڑ گئی تھی تو کشمیر کی تاریخ آج بہت مختلف ہوتی۔

قبائلی عوام نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہ قبائلی مجاہدین دُور دراز کے قبائلی علاقوں سے یہاں آکر کشمیر کی جنگِ آزادی میں حصہ لے رہے تھے اور سلیمان خیل کے قبائلی افغانستان کے سرحدی علاقوں سے آکر جہادِ کشمیر میں کود پڑے تھے۔ ادھر بھارتی حکومت کشمیر میں قبائلیوں کے جہادِ آزادی کو اس غلط رنگ میں پیش کر رہی تھی کہ حکومتِ پاکستان ریاستی حکومت کے خلاف جنگ کے لئے قبائلیوں کو خود اُکسا کر کشمیر میں بھیج رہی ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ کشمیری راہنما کبھی بھی عوام کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لئے قبائلی علاقوں میں نہ گئے تھے۔ بلکہ یہ قبائلی مجاہدین از خود جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر سر سے کفن باندھے ہوئے وادیٔ کشمیر میں داخل ہو رہے تھے۔

دورانِ جنگ بھارتی حکومت نے کشمیر کی جنگ آزادی میں قبائلیوں کی شرکت کو بالکل غلط رنگ میں پیش کیا اور اقوامِ متحدہ میں بھارت کے نمائندے نے سلامتی کونسل کے نام اپنے احتجاجی مراسلے میں جو یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو بھیجا گیا تھا۔ کشمیر کی صورتِ حال کو مراسلے کے پیرا نمبر ۲ میں اس طرح پیش کیا تھا:۔

"۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو بھارتی حکومت کو معلوم ہوا کہ پاکستان کے صوبہ سرحد سے ۲ ہزار مسلح افراد لاریوں میں سوار ہو کر ریاست جموں و کشمیر میں داخل ہو گئے ہیں اور انہوں نے مظفر آباد پر قبضہ کر کے وہاں کے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور اس کے بعد یہ حملہ آور وادیٔ جہلم

کی سڑک کے ذریعے سری نگر کی طرف بڑھنے لگے ہیں۔ انہوں نے راستے میں پڑنے والے اکثر قصبوں اور دیہاتوں کو جلا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا ہے یہ حملہ آور راستے میں مزاحمت کرنے والے ہر شخص کو بلا دریغ اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں اور جب سری نگر سے پچاسی میل کے فاصلہ پر اوڑی کے مقام پر انہیں ریاستی فوج نے روکا تو انہوں نے اوڑی کا محاصرہ کرنے کے بعد مہوڑہ کے بجلی گھر کو نذر آتش کر دیا۔ یہ بجلی گھر تمام ریاست کو بجلی فراہم کرتا تھا۔"

بھارتی نمائندے نے اپنے مراسلہ کے آٹھویں پیرا میں مزید بیان کیا ہے: "بھارتی حکومت کی بیساں پر بروقت مداخلت نے سری نگر کو حملہ آوروں سے بچا لیا اور انہیں بارہ مولا سے اوڑی تک پسپا کر کے وہاں روک دیا گیا ہے جبکہ اس محاذ پر ریاستی اور بھارتی فوج کو انیس ہزار حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ اور جب سے بھارتی فوج نے ریاست میں حملہ آوروں کے خلاف اپنی سرگرمیاں شروع کی ہیں ان حملہ آوروں نے ریاست کے مغربی اور جنوب مغربی سرحدی علاقوں پر زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ابھی تک اس ضمن میں صحیح اعداد و شمار تو حاصل نہیں ہو سکے مگر ایک اندازے کے مطابق پندرہ ہزار حملہ آور ان علاقوں میں بھارتی حکومت سے برسرپیکار ہیں۔ کئی علاقوں میں حملہ آوروں نے بھارتی فوج کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اور ریاست کے تمام علاقوں میں حملہ آوروں نے قتل و غارت، لوٹ مار اور عورتوں کے اغوا کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا ہے۔ ریاست کے علاقوں سے جو مال و اسباب لوٹا جاتا ہے۔ اس کا کچھ حصّہ قبائلی علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہاں کے عوام کو کشمیر میں جنگ کرنے

پر اکسایا جاسکے - اس کے علاوہ مغربی پنجاب کے مختلف علاقوں میں جو ریاست جموں و کشمیر کی سرحدوں کے قریب واقع ہیں - تقریباً ایک لاکھ قبائلیوں کو فوجی تربیت دی جا رہی ہے اور اس کام میں پاکستان کے اعلیٰ سرکاری اور فوجی افسر بھی برابر کے شریک ہیں - کشمیر میں جنگ کرنے والے قبائلیوں کے لئے اشیائے خورد و نوش، کپڑے، اسلحہ بارود اور ذرائع آمد و رفت کا انتظام بھی باقاعدہ پاکستان کی طرف سے کیا جا رہا ہے غرضیکہ پاکستان کے فوجی اور سرکاری افسران قبائلی حملہ آوروں کی ہر ممکن مدد کر رہے ہیں -

پاکستان کے وزیر خارجہ نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں جو بھارت کی شکایت پر بلایا گیا - بھارت کے ایک ایک الزام کو غلط اور بے بنیاد ثابت کر دیا - اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قبائلی مجاہدین سے سرینگر کی طرف یلغار کرتے ہوئے کئی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں - لیکن اس ضمن میں بھارت نے جو الزامات پاکستان پر عائد کئے تھے ان میں ذرہ بھر بھی حقیقت نہ تھی - قبائلی مجاہدین کے لشکر کے کشمیر میں داخل ہونے کی وجوہ کا اچھی طرح جائزہ لیا جا چکا ہے اور بھارت کے اس الزام کے باوجود کہ حکومت پاکستان کی شہ پر یہ قبائلی کشمیر میں داخل ہوئے تھے، یہ حقائق آج کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں کہ مغربی پاکستان کے عوام کی نازک صورت حال سے پوری طرح متاثر ہو رہے تھے اور یہاں ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ کشمیر کے مسلمانوں کو ڈوگرہ شاہی کے جور و استبداد سے نجات دلانے کے لئے ٹھوس قدم اٹھایا جائے - کشمیری مسلمانوں کے اکثر رشتہ دار سابق صوبہ سرحد اور سابق صوبہ مغربی پنجاب میں آباد تھے - علاوہ ازیں بعض کشمیری مسلمانوں

کے رشتے دار بھارتی علاقوں میں بھی آباد تھے جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے آئے تھے۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کے ان رشتہ داروں نے بھی مجاہدین کے ہمراہ ان کی عملی امداد کے لئے ۲۲ راکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریاست کی سرحد عبور کی اور وادیٔ کشمیر میں ڈوگرہ فوج کے خلاف اپنے کشمیری بھائیوں کے دوش بدوش صفِ آرا ہو گئے۔ ادھر حکومتِ پاکستان نے ریاستِ کشمیر میں قبائلی مجاہدین کے غیر قانونی داخلے کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن پاکستان کی تمام فوج مشرقی پنجاب سے مہاجرین کو بحفاظت پاکستان لانے کے انتظامات اور اپنی شمال مغربی سرحدوں کی حفاظت میں مصروف تھی۔ لہٰذا وہ کسی طرح ریاست میں داخل ہونے والے مجاہدین کے سیلِ رواں کو نہ روک سکتی تھی پھر قبائلی علاقوں میں کشمیر کی نازک صورت حال سے اس قدر ہیجان خیز حالات پیدا ہو گئے تھے کہ وہاں کے عوام کو کشمیر جانے سے روکنے کے لئے ایک مکمل فوج کی ضرورت تھی اور حکومت پاکستان اپنی مشکلات کے باعث قبائلیوں کو کشمیر جانے سے باز نہ رکھ سکی اگر وہ ایسا کرتی بھی تو پاکستان کے عوام حکومت کے اس اقدام پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو سکتے۔

یہ قبائلی مجاہدین کشمیری مسلمانوں کی امداد کے لئے محاذِ جنگ پر پہنچے تو ان کے لئے اشیائے ضرورت کے انتظامات کرنے کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا کیونکہ انہیں جہاد آزادی میں حصہ لینے کے لئے محاذِ جنگ پر اشیائے خوردنی کی بھی اشد ضرورت تھی اور دورانِ جنگ یا سفر کے وقت ان کے لئے کھانے پینے کی ضروریات کا بندوبست کرنا ہنگامی حالات میں ہمارے لئے ایک اہم ترین مسئلہ بن گیا تھا۔ شروع

شروع میں تو آزاد کشمیر فوج کے منتظمین قبائلیوں کی عادات و اطوار اور ضروریات وغیرہ کے بارے میں بھی ناواقف تھے جس کے باعث اور بھی مشکلات پیدا ہو گئیں لیکن رفتہ رفتہ منتظمین کو قبائلی مجاہدین کی عادات اور ضروریات کا اندازہ ہوتا گیا اور انہوں نے مشکلات پر قابو پا لیا۔

مگر جہاں تک قبائلیوں کے طریقِ جنگ اور موجودہ جنگی حکمتِ عملیوں کا تعلق ہے، میری رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ قبائلی عوام کو جدید ترین طریقِ جنگ کی واقفیت دلانا ضروری ہے۔ اور جنگ کے جدید طریقوں اور حکمتِ عملیوں کی باقاعدہ تربیت حاصل کرنا بھی ان شجاع قبائلی جنگجوؤں کے لئے لازمی ہے۔ کیونکہ نئے نئے جنگی طور طریقوں سے آگاہ ہوئے بغیر ان قبائلیوں سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ کسی علاقے کو دشمن کے تسلط سے آزاد کروانے کے بعد اس علاقے پر بعد میں قابض بھی رہ سکتے ہیں۔ اس موقع پر کشمیر کی جنگ آزادی کی کمان کرنے والے افراد سے بھی کچھ ایسی ناقابل تلافی غلطی سرزد ہوئی کہ وہ ان جنگجو قبائلیوں کی پشت پناہی نہ کر سکے۔ اس میں شک نہیں کہ قبائلی عوام کا لشکر آتش فشاں پہاڑ سے نکلنے والے ایک لاوے کی مانند ہوتا ہے جسے کوئی جنگی طاقت بھی اپنے قابو میں نہیں لا سکتی۔ مگر ضروری ہے کہ ان قبائلی جواں مردوں کے دوش بدوش باقاعدہ فوج بھی برابر کا حصّہ لے کر آگے بڑھتی رہے۔ تاکہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے، ان کے دفاع اور وہاں کے عوام کی حفاظت کے لئے فوج ضروری انتظامات کرتی رہے اور یہ علاقے دوبارہ دشمن کے قبضے میں نہ جا سکیں۔

چنانچہ جب قبائلی لشکر سری نگر سے پسپا ہوا تو وہاں باقاعدہ تربیت یافتہ آزاد فوج ان کی مدد کے لئے موجود نہ تھی۔ جو قبائلیوں کی جگہ سنبھال کر اس علاقے کو دشمن کی پیش قدمی سے محفوظ رکھتی اور اگر اس وقت پونچھ یا کسی اور محاذ سے آزاد فوج کے کچھ دستے سری نگر کے محاذ پر پہنچ جاتے تو وہ اردگرد کی پہاڑیوں پر اپنے مورچے مضبوطی سے قائم کر کے بھارتی فوج کا بخوبی مقابلہ کر سکتے تھے۔ پھر یہاں اوڑی کے محاذ پر بھارتی فوج نے بڑی سڑک پر قبضہ کر لیا تھا۔ حالانکہ اردگرد کی تمام پہاڑیاں مسلمان مجاہدین کے قبضہ میں تھیں۔ جس کی وجہ سے بھارتی فوج پونچھ کے علاقے میں محصور بھارتی فوج سے رابطہ قائم نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ ڈوگرہ فوج کئی ماہ تک تک پونچھ کے علاقے میں محصور رہی مگر بالآخر سڑک کے راستے انہیں کمک پہنچ ہی گئی ـــــ لہٰذا جنگِ آزادیٔ کشمیر کے ان اوّلین تجربات سے مستقبل کے مجاہدینِ آزادی کو سبق حاصل کرنا چاہیئے اور یہ بات تو خاص طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ قبائلی مجاہدین وسیع پیمانے دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑنے اور یلغار کرنے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں بشرطیکہ دشمن پسپا ہو رہا ہو یا اس نے ابھی تک جنگ شروع کرنے کے لئے مورچے تیار نہ کئے ہوں۔

اور یہ بہادر قبائلی جنگجو دو باتوں میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ایک تو انہیں دشمن پر شب خون مار کر حملہ کرنے میں کمال حاصل ہے۔ جس میں وہ اکثر کامیاب رہتے ہیں اور دوسرے جب وہ دشمن کے نرغے میں آجاتے ہیں تو اپنے خنجروں سے مقابلہ کر کے دشمن کا صفایا کر ڈالنے میں بھی ان کا جواب نہیں۔ اور اگر قبائلی جنگجوؤں کو یہ معلوم ہو جائے کہ

دشمن کی سینکڑوں لاریاں اسلحہ سے لدی سرتی جارہی ہیں توان کا صفایا کرکے اسلحے کو اپنے قابو میں کرنے کا کام بھی بغیر کسی تردد کے ان کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ غیر معمولی مہارت اور پھرتی کا ثبوت دے سکتے ہیں اور یہ قبائلی مجاہدین اسلحہ لے جانے والے اس قافلے پر اتنی ہشیاری اور برق رفتاری سے حملہ کرتے ہیں کہ دشمن انہیں دیکھنے کے بعد سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ان کے پے در پے اور نہ غلط ہونے والے نشانوں کی زد میں آکر بھونچکا سا ہو کر خاک و خون میں غلطاں نظر آتا ہے اور قبائلیوں کے ناگہاں حملے سے پہلے دشمنوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ قریب ہی کہیں جھاڑیوں، درختوں کے تنوں یا گڑھوں میں چھپے ہوئے حملہ آور موت کا فرشتہ بن کر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔

یہ قبائلی خاموشی کے ساتھ زمین پر لیٹ کر رینگنا شروع کر دیتے اور فوجی قافلہ کے نزدیک پہنچ کر اتنی پھرتی سے اس پر حملہ آور ہوتے ہیں کہ دشمن بوکھلا کر رہ جاتا ہے۔ کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران بھی ان قبائلی مجاہدین نے دشمن کے فوجی قافلوں پر اسی قسم کے شب خون مار کر متعدد بار ان کے راستے میں تباہ کن مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ علاوہ ازیں قبائلی مجاہدین اپنے خنجروں کے ذریعے دست بدست جنگ کرنے میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور یہ قبائلی خود کسی جگہ دشمن کے نرغے میں پھنس جائیں تو وہ خنجروں کے ذریعے دوبدو جنگ کر کے دشمن کی لاشوں کے پشتے لگا دیتے ہیں اور اس طرح دشمن کا محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں منظفر آباد کے محاذ پر پانڈو کی پہاڑیوں پر ان جنگجو اور شیر دل قبائلیوں نے خنجر کی جنگ کا ایک ایسا ہی لاجواب مظاہرہ کر کے کامیابی حاصل کر لی تھی۔

البتہ دشمن پر حملہ آور ہونے کے لئے ان قبائلیوں سے کام لینا ذرا مشکل کام ہے ۔ اگرچہ نوشہرہ کے محاذ پر ضرور سلیمان خیلی قبائلیوں نے دشمن پر ایک بھرپور حملہ کر کے اپنے فن سپاہ گری کا ایک شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ یہ قبائلی مجاہدین عموماً چھوٹے چھوٹے جتھوں میں منقسم ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اور پیٹ کے بل رینگتے ہوئے کسی نہ کسی طرح آگے بڑھتے ہوئے دشمن کے مورچوں تک پہنچ جاتے ہیں ۔ مگر کسی محاذ پر جنگ شروع کرنے سے پہلے دشمن کے خلاف انہیں ذہنی طور پر پوری طرح آمادۂ جنگ کرنا پڑتا ہے ۔ یہ قبائلی مجاہد جنگ شروع کرنے سے پہلے ڈھول پیٹتے ہیں مگر انہیں اس موقع پر اس بات کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا کہ دشمن ڈھول پیٹنے کی صدائے بازگشت سن کر چوکنا ہو جائے گا اور کشمیر کی جنگِ آزادی کے دوران ان قبائلی مجاہدین کو کئی بار اس وجہ سے نقصان بھی اٹھانا پڑا ۔ لیکن دشمن اگر ان کے ڈھول کی گونج سن کر ان پر حملہ کرنے میں پہل بھی کر دے تو اس کے لئے پوری طرح مستعد ہوتے ہیں اور انہیں زیادہ نقصان نہیں برداشت کرنا پڑتا کیونکہ وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں بٹ کر چاروں طرف پھیلے ہوتے ہیں ۔

مگر یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ قبائلیوں کو کشمیر کے محاذِ جنگ سے واپس بلا لیا جاتا یا ان کو جنگ جاری رکھنے کی اجازت دی جاتی ۔ ! کیونکہ اگر انہیں محاذ جنگ سے واپس بلا لیا جاتا تو ڈوگرہ حکومت کے خلاف برسرِ پیکار آزاد کشمیر فوج ان ہزاروں شیر دل قبائلی مجاہدین سے محروم ہو جاتی جو دشمن کے لئے ایک زبردست اور ناقابل مزاحمت خطرات کا موجب بنے ہوتے تھے ۔ علاوہ ازیں محاذ جنگ سے قبائلیوں

کی واپسی کے احکام حکومت پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر گوناگوں پیچیدگیوں سے دوچار کر دیتے۔ اس کے برعکس قبائیلیوں کے اتنے بڑے لشکر کو محاذ جنگ پر برسر پیکار رکھ کر ان کے لیے رسد اور جنگی ضروریات کے دوسرے انتظامات کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور پھر قبائلی جنگجوؤں کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی درپیش تھا کہ ایک غیر منظم اور بڑے لشکر کو کوئی بھی حکومت بغیر کسی فوجی مقصد کے زیادہ عرصے تک محاذِ جنگ پر قیام پذیر نہیں رکھ سکتی۔ جبکہ قبائیلیوں کے معاملے میں یہ صورت حال تھی کہ وہ دشمن کے مقابلے پر خاموشی سے ڈٹے ہوئے تھے مگر پیش قدمی نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے ان قبائیلیوں کو باقاعدہ مستقل فوج کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا جا سکتا اور یہی بات قبائیلیوں اور باقاعدہ فوج کے درمیان بنیادی طور پر ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

تاہم آزاد کشمیر کے عوام اور ان کی آئندہ نسلیں ہمیشہ ان قبائلی مجاہدوں کی شکر گزار رہیں گی کیونکہ انہوں نے کشمیری مسلمانوں کی ایک نہایت نازک دور میں مدد کر کے ان کے دل جیت لیئے تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس جنگ آزادی کے دوران قبائیلیوں سے کئی لغزشیں اور غلط کاریاں بھی سرزد ہوئی ہوں گی۔ مگر ایسی غلط کاریاں تو جنگ کے دوران باقاعدہ فوج سے بھی سرزد ہو ہی جاتی ہیں۔ اور ان کے برعکس کشمیر پر قابض بھارتی اور ڈوگرہ فوج نے ریاستی مسلمانوں کے ساتھ جس جس طرح کی زیادتیاں کی ہیں ان کا ذکر تو کجا ان کا تصور کرنا بھی کشمیری عوام کے لیئے روح فرسا ہے۔ مگر ان قبائلی مجاہدوں ملنا باہمی بھائی چارے اور پُرخلوص دوستی کے جذبات و احساسات بھی

بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ وہ نہایت سادہ دل رکھتے ہیں اور اسلامی اخوت کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ان میں ایک یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ اپنی بے عزتی ہرگز برداشت نہیں کر سکتے اور جو شخص ان کی بے عزتی کرے اسے عمر بھر معاف نہیں کرتے۔

(۸)

آزاد کشمیر کی فوج

تحریک آزاد کشمیر کے دوران ایک مختصر سی فوج تیار کی گئی۔ یہ فوج تیار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ ریاست میں ڈوگرہ فوج مہاراشٹریہ سیوا سنگھ کے مسلح رضاکاروں سے مل کر ایک خطرناک خونی کھیل کھیلنے میں مصروف تھی جس کے لئے اُنہیں ڈوگرہ شاہی کی مکمل پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مگر خوش قسمتی سے ریاست کے مسلمان باشندوں کو ڈوگرہ فوج اور دہشت پسند ہندوؤں کے خطرناک عزائم کا بروقت علم ہو گیا۔ لہٰذا ان حالات میں ریاست کے مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ڈوگرہ راجوں کے لامتناہی سلسلۂ جور و ستم نے ریاست کے مسلمانوں کو اگرچہ بالکل کچل کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے کہ ڈوگرہ فوج انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

تحریکِ آزاد کشمیر نے جن حالات میں جنم لیا اس کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ پہلے کیا جا چکا ہے۔ کشمیر کے مسلمان ظلم وستم کی عادی ڈوگرہ حکومت کے اقتدار کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے، جس نے ریاستی مسلمانوں کے خون سے ڈوگرہ فوج کو ہاتھ رنگنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ لہٰذا کشمیری مسلمانوں کے جان ومال کے تحفظ کے لئے ایک معمولی سی فوج تیار کی گئی جس نے آہستہ آہستہ ایک مستقل اور باقاعدہ فوج کی حیثیت اختیار کر لی اور آخر کار دشمن بھی اسے آزاد کشمیر کی ایک باقاعدہ ومنظم فوج تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس عوامی فوج کی کمان مقامی کمانڈروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی، جن میں سے اکثر ریاست کے سابق فوجی تھے۔ جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے کارہائے نمایاں میں حصہ لے کر اپنی جواں مردی کے جوہر دکھا چکے تھے۔ آزاد کشمیر فوج کی تربیت کا کام انہیں سابق مسلمان فوجیوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ آزاد کشمیر فوج میں ایسے سابق فوجیوں کی بھی کافی تعداد شامل تھی جو دوسری جنگ عظیم کے دوران لیبا، ملایا، برما اور کئی یورپی ممالک میں لڑ کر اپنی شجاعت ومردانگی کا سکہ بٹھا چکے تھے۔ اور انہیں ایسے جانباز وطن پرست سپاہیوں کے ساتھ رہ کر ان کے تجربات جنگ سے استفادہ حاصل کرنے کا بھی موقع ملا تھا جو ہٹلر شاہی اور دوسری فسطائی طاقتوں کے خلاف اپنے وطن عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے فن سپاہ گری کے جوہر نمایاں کر چکے ہیں اور یہ فوجی محض دوسروں کے اشاروں پر ناچنا نہ جانتے بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر وطن کی آزادی کے لئے جنگ کرنے کا جذبہ اپنے سینوں میں موجزن رکھتے تھے۔ آزاد کشمیر

فوج کو کسی صورت میں بھی محض ایک بھاڑے کے ٹٹوؤں کی فوج یا صرف تنخواہ کی خاطر لڑنے والی فوج نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ شروع شروع میں تو کافی عرصے تک انہیں سرے سے کوئی تنخواہ ہی نہ دی گئی تھی لہٰذا آزاد کشمیر فوج کو حقیقی معنوں میں ایک عوامی اور وطن دوست فوج کہا جا سکتا ہے۔ جو عوام کی خواہش کے مطابق ریاست کو ڈوگرہ شاہی کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کروانے کے لئے قائم کی گئی تھی کیونکہ حکومت عوام کی ہمدردیاں کھو کر اپنے خلاف ان کی نفرت و حقارت مول لے چکی تھی۔ اور اب اُنہیں طاقت کے بل پر کچلنے کے لئے نہایت ذلیل اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئی تھی۔

آزاد کشمیر فوج میں بھرتی کے لئے کوئی منظّم یا باضابطہ طریق اختیار نہیں بلکہ اس فوج کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ریاست میں جگہ جگہ ڈوگرہ فوج نے اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اور اس بات کا کسی وقت بھی خطرہ تھا کہ ریاست کی ڈوگرہ فوج کسی وقت بھی ریاستی مسلمانوں کا کشت و خون کرنا شروع کر دے۔ لہٰذا ریاستی مسلمانوں نے اپنی حفاظت کے لئے رضاکاروں کے ایسے چھوٹے چھوٹے مسلح گروہ منظم کرنے شروع کر دیئے جو ضرورت پڑنے پر ریاستی مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج کے ظلم و تشدّد سے محفوظ رکھنے کی جدّوجہد کر سکیں۔ ان حالات میں دیہاتوں اور قصبوں میں ریاستی مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مسلح گروہ رضاکاروں کی صورت میں منظم و متحد ہونا شروع ہو گئے اس کے بعد کئی کئی دیہاتوں پر مشتمل رضاکاروں کے گروہ منظم کر کے ان کا ایک ایک سیکٹر بنا دیا گیا۔ اور ہر سیکٹر کے انتظامات ایک سیکٹر کمانڈر کے ہاتھ میں دیدیئے گئے۔ اور

پھر کئی کئی سیکٹر ملا کر رضا کار فوج کی الگ الگ ایریا کمان یعنی علاقائی فوج قائم کر دی گئی۔ جن کی کمان سب سے زیادہ تجربہ کار سابق فوجیوں کے سپرد کر دی گئی۔ اس طرح سے یہ تمام رضا کار فوجیوں کی تنظیم مختلف علاقائی کمانوں میں تقسیم ہو کر اپنے مختلف محاذوں پر مصروفِ عمل ہو گئی۔ ہر محاذ کے کمانڈر کے پاس رضا کار فوجیوں کی کئی کئی بٹالینیں موجود تھیں۔ لیکن انہیں ابھی تک ایک بریگیڈ کی صورت میں منظم و متحد نہیں کیا جا سکا تھا۔

اس سے رضا کار فوج کو کبھی ایک کمانڈر کی سربراہی میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ رضا کار فوج کو جہاں کہیں بھی ضرورت پیش آتی بٹالینوں یا کمپنیوں کی شکل میں منظم و متحد کر کے ڈوگرہ فوج کے مقابلے میں صف آرا کر دیا جاتا۔ اور فوری طور پر کسی بھی تجربہ کار سابق فوج کے ہاتھ میں ان کی کمان دے دی جاتی۔ مگر جوں جوں جنگ وسعت اختیار کرتی گئی اور مختلف محاذوں پر ڈوگرہ فوج اور آزاد فوج کے درمیان بڑے پیمانے پر جنگ ہونے لگی، آزاد کشمیر فوج کی تنظیم و تربیت کا کام بھی زیادہ وسعت پذیر صورت اختیار کرتا گیا۔ اور ہر محاذ جنگ کے لئے علیحدہ علیحدہ کمانیں مقرر کر دی گئیں۔ اور جنگ شروع ہونے کے تین ماہ بعد ہی آزاد کشمیر فوج کی مشترکہ کمان ایک سابق تجربہ کار جرنیل جناب طارق کے سپرد کر دی گئی۔

رضا کار آزاد فوج کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان کے پاس اسلحہ بارود بہت کم تھا اور جنگی نقل و حمل کے ذرائع بھی ناکافی تھے لہٰذا رضا کار فوج کے لئے اشیائے خورد و نوش کی فراہمی اور محاذِ جنگ تک اس کی ترسیل کی ذمہ داری وہاں کے عوام کے سپرد کر دی

گئی تھی۔ اور آج اگر اس صورت پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے عوام نے کس طرح اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر محاذِ جنگ پر رضاکار فوج کے لئے اشیائے خوردنی پہنچانے کا کارنامہ سرانجام دیتے ہوئے فوج کے ساتھ اپنے تعاون کی مثال پیش کی تھی۔!

ریاست جموں و کشمیر میں اس انقلاب کا جس طرح آغاز ہوا اور عوام نے مہاراجہ ہری سنگھ کی ظالم حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے، اسے مشہور کشمیری راہنما شیخ محمد عبداللہ نے ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے، شیخ عبداللہ نے یہ بیان ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو دیتے ہوئے کہا تھا کہ پونچھ کے علاقے میں ہونے والے فسادات ریاستی حکومت کی پُرفریب پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ پونچھ کے عوام نے جو پہلے ایک عرصے تک مقامی حکام کے علاوہ دربار کشمیر کے جور و ستم بھی برداشت کرتے رہے ہیں۔ اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے ایک انقلابی تحریک کا آغاز کر دیا ہے جسے فرقہ وارانہ تحریک کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔ سری نگر کی ڈوگرہ حکومت نے پونچھ میں اپنی فوج بھیج کر ایک افراتفری کی صورت پیدا کر دی ہے۔ مگر چونکہ پونچھ کے علاقے میں زیادہ تر ایسے سابق مسلمان فوجی آباد ہیں۔ جن کے رشتے دار جہلم اور راولپنڈی میں بسے ہوئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ریاست کی سرحد عبور کر کے اپنے بیوی بچوں کو ان رشتہ داروں کے پاس پہنچا دیا۔ اور پھر وہاں سے ضروری سامانِ جنگ لے کر ڈوگرہ فوج کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے کشمیر واپس پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ ڈوگرہ فوج ریاست میں کئی محاذوں سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

کشمیر کے ہندو راہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ "پونچھ کے علاقے میں جہاں ہزار ہا سابق مسلمان فوجی آباد تھے ریاست کے مہاراجہ اور اس کی ڈوگرہ شاہی کے خلاف، ریاستی عوام نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور کشمیری عوام کی بغاوت کا یہ سلسلہ پونچھ کے نواحی علاقوں سے لے کر میرپور تک پھیل گیا۔ کیونکہ میرپور میں بھی سابق مسلمان فوجیوں کی کثیر تعداد آباد تھی۔ اور مہاراجہ اس بغاوت کی وجوہات معلوم کرنے کی بجائے بھارت کی نئی کانگریسی حکومت اور کانگرسی راہنماؤں سے گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف رہا۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے ڈوگرہ فوج بھیج دی گئی یا بقول ایک مقامی راجپوت کرنل کے ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے ڈوگرہ فوج وہاں روانہ کر دی گئی تھی۔ جو پونچھ کے عوام کی مشکلات و مسائل کو پس پشت ڈال کر وہاں ظلم و تشدد کا بازار گرم کر رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں نذر آتش کئے جا رہے تھے۔ اور مظلوم کشمیری عوام کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی مگر ڈوگرہ فوج کے جور و استبداد سے متعلق سری نگر پہنچنے والی خبریں اخبارات میں شائع نہیں ہونے دی جاتی تھیں۔ اور عوام کا خوف و ہراس کم کرنے کے لئے بھی حکومت کی طرف سے اس معاملے میں کوئی بیان نہیں جاری کیا جاتا تھا —— یہ تمام واقعات ستمبر ۴۷ء میں رونما ہوئے جبکہ قبائلی مجاہدین ۲۳ ر اکتوبر ۱۹۴۷ء سے قبل ریاست کی حدود میں داخل نہ ہوئے تھے۔"

ریاست میں جب وسیع پیمانے پر جنگ شروع کرنے کے لئے ڈوگرہ حکومت نے اپنی ساری فوجی قوت جنگ میں جھونک دی

تو آزاد فوج بھی میدانِ عمل میں آگئی اور دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ کے لئے باقاعدہ نئے نئے محاذِ جنگ قائم ہونے شروع ہو گئے۔ آزاد فوج کو کمک بھیجنے کے لئے بھی نئی فوج کی بھرتی اور تربیت کا کام تیز کر دیا گیا۔ کیونکہ جن علاقوں میں جنگ ہو رہی تھی وہاں مسلمان باشندوں کی تعداد دس لاکھ سے زائد نہ تھی اور اتنی کم آبادی میں سے پچاس ہزار آزاد فوج کو کمک بھیجنے کے لئے نئے جوان حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اور آزاد فوج میں بھرتی کے لئے جو کشمیری نوجوان آرہے تھے ان میں سے اکثر کی عمر پندرہ سولہ سال تھی جو معمولی فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد آزمودہ کار ڈوگرہ فوج کے مقابلہ کے لئے محاذِ جنگ پر جا رہے تھے۔ خود راقم الحروف نے کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران ایسے نوجوان کو بھی میدانِ جنگ میں ڈوگرہ اور بھارتی فوج کا مقابلہ کرتے دیکھا جن کی عمریں بمشکل پندرہ سولہ سال تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے ایک کشمیری مجاہد کو محاذِ جنگ سے واپس آتے دیکھا۔ جس کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی تھی۔ یہ نوجوان ننگے پاؤں، پھٹی پرانی وردی پہنے ہوئے گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور ایک سات ہزار فٹ بلند برف پوش پہاڑی پر کئی روز تک مسلسل جنگ میں مصروف رہنے کے بعد، واپس اپنی چوکی پر آرہا تھا۔ پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اُسے محاذِ جنگ سے واپس بلایا گیا ہے۔ مگر وہ اب بھی اشکبار نگاہوں سے محاذِ جنگ کی طرف دیکھتا ہوا اپنی چوکی کی طرف واپس جا رہا تھا۔ اسی قسم کے سینکڑوں کم عمر نوجوان آزاد فوج میں شامل تھے جو پوری خوراک اور آرام نہ ملنے کے باوجود ڈوگرہ فوج سے نبرد آزما تھے، جبکہ اس وقت

انہیں وردی اور تنخواہ بھی نہ دی جاتی تھی۔

کشمیر کی جنگِ آزادی کے دوران کشمیری مجاہدین نے اپنی جوانمردی وبہادری کے جو کارنامے پیش کئے، انہیں دائرہ تحریر میں لانا یا ان میں سے چند ایک کارناموں کا ہی تفصیل سے ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، تاہم میں چند مجاہدین کی ذاتی طور پر شجاعت اور اولوالعزمی کی کچھ مثالیں ضرور پیش کروں گا، جو میں نے آزاد فوج سے قریبی رابطہ قائم ہونے کی وجہ سے خود دیکھی ہیں۔

پونچھ کی سدھنوتی تحصیل کے شہر "مانگ" سے قریب ہی آزاد فوج کا ایک صوبیدار جو فوج میں بھی رہ چکا تھا، وہاں آزاد فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس علاقے میں دشمن کی یہ آخری چوکی تھی۔ جسے ختم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جارہی تھی۔ ڈوگرہ فوج نے اپنا مورچہ ایک اسکول کی عمارت میں قائم کر رکھا تھا۔ جس میں اسلحے اور گولہ بارود کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود تھا اور چند ڈوگرہ سپاہی جو ہندوؤں میں بہترین جنگجو سمجھے جاتے ہیں اس عمارت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے ڈوگرہ فوج کے پاس کمک بھی پہنچنے والی تھی۔ اور محاذِ جنگ کی طرف سے آنے والی اس تازہ دم فوج نے مسلمانوں کو دیکھ کر دور سے ہی اپنی تین انچ دہانے والی توپوں کے ذریعے مجاہدین پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ آزاد فوج کو اس تازہ دم ڈوگرہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلحے اور گولہ بارود کی سخت ضرورت تھی جو اسی صورت میں اس موقع پر حاصل ہو سکتا تھا کہ اسکول کی عمارت پر قبضہ کر لیا جائے جس میں ڈوگرہ فوج نے اپنے اسلحہ و

بارود کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ ڈوگرہ فوج برین گنیں تھامے ہوئے اس عمارت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اور ان برین گنوں نے ہی اب تک ڈوگرہ فوج کو مجاہدین کا مقابلہ کرنے میں کامیاب بنائے رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں اس وقت تک مجاہدین اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ انہیں بھی برین گنیں حاصل ہو سکیں گی۔ عین اس موقع پر جبکہ ڈوگرہ فوج نے دور سے ہی مجاہدین پر گولہ باری شروع کر رکھی تھی۔ آزاد فوج کا یہ ایک صوبیدار چند جانباز مجاہدین کو ساتھ لے کر زمین پر رینگتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف بڑھنے لگا اور آخر اسکول کی اس کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، جہاں ڈوگرہ فوجی برین گنیں لئے کھڑے تھے۔ اس نے ایک دم عقاب کی طرح جھپٹ کر کوشش کی کہ ڈوگرہ فوجیوں سے ان کی برین گنیں چھین لی۔ مگر دست بدست مقابلہ ہونے سے پہلے ہی ڈوگرہ فوجیوں کی گولیوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا اور وہ جاں بحق ہوکر زمین پر آ رہا۔ صوبیدار کے گرتے ہی اس کے نوجوان بھتیجے عمارت کے محافظوں پر حملہ آور ہونے کے لئے ان پر جھپٹے مگر انہیں بھی ڈوگرہ محافظوں نے شہید کر دیا۔ اور انہیں یکے بعد دیگرے ڈوگرہ محافظوں کی گولیوں سے جام شہادت نوش کرتے دیکھ کر کئی دوسرے مجاہدین بھی جو ان کے پیچھے پیچھے رینگتے ہوئے چلے آئے تھے۔ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ڈوگرہ محافظوں پر یکبارگی نعرے لگاتے ہوئے جھپٹ پڑے، محافظ انہیں اچانک اپنے اس قدر قریب دیکھ کر بوکھلا اٹھے اور گولیاں بھی نہ چلا سکے کہ مجاہدین نے ان سے دست و گریبان ہو کر برین گنیں چھین لیں اور آخر کار ان محافظوں

کو مغلوب کر کے اسلحے و بارود سے بھری ہوئی ساری عمارت پر قبضہ کر لیا۔

اسی طرح ۱۹۴۸ء کے آخری ایام میں بھارتی فوج نے کوٹلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تو صورتِ حال بہت سنگین ہو گئی۔ اس محاذ پر بھارتی فوج اپنے ساتھ ٹینک لے کر بھی آئی تھی۔ اگرچہ پہاڑی راستوں کے باعث محاذِ جنگ پر زیادہ ٹینک نہیں لائے جا سکتے تھے لیکن پھر بھی بھارتی فوج کسی نہ کسی طرح مجاہدین کے مقابلے میں کافی ٹینک لے آئی تھی جبکہ ان کے مقابلہ میں مجاہدین کے پاس نہ تو ٹینک تھے اور نہ ٹینک شکن توپیں تھیں۔ چنانچہ اس موقع پر موت کے خوف سے بے نیاز ہو کر کم عمر کشمیری مجاہدین نے دستی بموں سے ان ٹینکوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کثیر تعداد میں نوجوان مجاہدین دستی بم لے کر ان ٹینکوں کے مقابلے میں کود پڑے اور انہیں ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر اپنے بموں کا نشانہ بنانے لگے۔ اگرچہ ان کم عمر مجاہدین کی نعشیں بھی ٹینکوں کی زد میں آکر قیمہ بن گئیں مگر ان کے دستی بم اپنا کام کر گئے۔ اور بھارتی فوج جو مجاہدین آزادی کو کچلنے کے لئے یہ دیو ہیکل ٹینک لے کر میدانِ جنگ میں آئی تھی، اپنے ٹینکوں کو لوہے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے ڈھیر کی صورت میں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی فوجیوں نے بھی اپنی شجاعت و جوانمردی کے ناقابلِ قیاس کارنامے سر انجام دیئے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کشمیری مجاہدین آزادی کے یہ کارنامے بھی کسی صورت میں کم نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

ضلع میرپور میں بھمبر کے محاذ پر سلیمان خیل قبیلہ کے ایک مجاہد نے بھی اپنی ذاتی شجاعت و جوانمردی کا ایک ایسا ہی شاندار کارنامہ انجام دیا

(۸)

آزاد کشمیر کی فوج

تحریک آزاد کشمیر کے دوران ایک مختصر سی فوج تیار کی گئی۔ یہ فوج تیار کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ ریاست میں ڈوگرہ فوج ماراشٹریہ سیوا سنگھ کے مسلح رضاکاروں سے مل کر ایک خطرناک خونی کھیل کھیلنے میں مصروف تھی جس کے لئے اُنہیں ڈوگرہ شاہی کی مکمل پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ مگر خوش قسمتی سے ریاست کے مسلمان باشندوں کو ڈوگرہ فوج اور دہشت پسند ہندوؤں کے خطرناک عزائم کا بروقت علم ہو گیا۔ لہٰذا ان حالات میں ریاست کے مسلمانوں کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ڈوگرہ راجوں کے لامتناہی سلسلۂ جور و ستم نے ریاست کے مسلمانوں کو اگرچہ بالکل کچل کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے کہ ڈوگرہ فوج انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

تحریکِ آزاد کشمیر نے جن حالات میں جنم لیا اس کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ پہلے کیا جا چکا ہے۔ کشمیر کے مسلمان ظلم وستم کی عادی ڈوگرہ حکومت کے اقتدار کا تختہ الٹ دینا چاہتے تھے، جس نے ریاستی مسلمانوں کے خون سے ڈوگرہ فوج کو ہاتھ رنگنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ لہٰذا کشمیری مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کے لئے ایک معمولی سی فوج تیار کی گئی جس نے آہستہ آہستہ ایک مستقل اور باقاعدہ فوج کی حیثیت اختیار کر لی اور آخر کار دشمن بھی اسے آزاد کشمیر کی ایک باقاعدہ و منظم فوج تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس عوامی فوج کی کمان مقامی کمانڈروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی، جن میں سے اکثر ریاست کے سابق فوجی تھے۔ جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے کارہائے نمایاں میں حصہ لے کر اپنی جواں مردی کے جوہر دکھا چکے تھے۔ آزاد کشمیر فوج کی تربیت کا کام انہیں سابق مسلمان فوجیوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ آزاد کشمیر فوج میں ایسے سابق فوجیوں کی بھی کافی تعداد شامل تھی جو دوسری جنگ عظیم کے دوران لیبا، ملایا، برما اور کئی یورپی ممالک میں لڑ کر اپنی شجاعت و مردانگی کا سکہ بٹھا چکے تھے۔ اور انہیں ایسے جانباز و وطن پرست سپاہیوں کے ساتھ رہ کر ان کے تجربات جنگ سے استفادہ حاصل کرنے کا بھی موقع ملا تھا جو ہٹلر شاہی اور دوسری فسطائی طاقتوں کے خلاف اپنے وطن عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے فن سپاہ گری کے جوہر نمایاں کر چکے ہیں اور یہ فوجی محض دوسروں کے اشاروں پر ناچنا نہ جانتے بلکہ اپنے ضمیر کی آواز پر وطن کی آزادی کے لئے جنگ کرنے کا جذبہ اپنے سینوں میں موجزن رکھتے تھے۔ آزاد کشمیر

فوج کو کسی صورت میں بھی محض ایک بھاڑے کے ٹٹوؤں کی فوج یا صرف تنخواہ کی خاطر لڑنے والی فوج نہیں کہا جا سکتا - کیونکہ شروع شروع میں تو کافی عرصے تک انہیں سرے سے کوئی تنخواہ ہی نہ دی گئی تھی لہٰذا آزاد کشمیر فوج کو حقیقی معنوں میں ایک عوامی اور وطن دوست فوج کہا جا سکتا ہے - جو عوام کی خواہش کے مطابق ریاست کو ڈوگرہ شاہی کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کروانے کے لئے قائم کی گئی تھی کیونکہ حکومت عوام کی ہمدردیاں کھو کر اپنے خلاف ان کی نفرت و حقارت مول لے چکی تھی - اور اب اُنہیں طاقت کے بل پر کچلنے کے لئے نہایت ذلیل اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آئی تھی -

آزاد کشمیر فوج میں بھرتی کے لئے کوئی منظّم یا باضابطہ طریق اختیار نہیں بلکہ اس فوج کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ریاست میں جگہ جگہ ڈوگرہ فوج نے اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے - اور اس بات کا کسی وقت بھی خطرہ تھا کہ ریاست کی ڈوگرہ فوج کسی وقت بھی ریاستی مسلمانوں کا کشت و خون کرنا شروع کر دے - لہٰذا ریاستی مسلمانوں نے اپنی حفاظت کے لئے رضاکاروں کے ایسے چھوٹے چھوٹے مسلح گروہ منظم کرنے شروع کر دیئے جو ضرورت پڑنے پر ریاستی مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج کے ظلم و تشدّد سے محفوظ رکھنے کی جدّوجہد کر سکیں - ان حالات میں دیہاتوں اور قصبوں میں ریاستی مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مسلح گروہ رضاکاروں کی صورت میں منظم و متحد ہونا شروع ہو گئے اس کے بعد کئی کئی دیہاتوں پر مشتمل رضاکاروں کے گروہ منظم کر کے ان کا ایک ایک سیکٹر بنا دیا گیا - اور ہر سیکٹر کے انتظامات ایک سیکٹر کمانڈر کے ہاتھ میں دیدیئے گئے - اور

پھر کئی کئی سیکٹر ملا کر رضا کار فوج کی الگ الگ ایریا کمان یعنی علاقائی فوج قائم کر دی گئی - جن کی کمان سب سے زیادہ تجربہ کار سابق فوجیوں کے سپرد کر دی گئی - اس طرح سے یہ تمام رضا کار فوجیوں کی تنظیم مختلف علاقائی کمانوں میں تقسیم ہو کر اپنے مختلف محاذوں پر مصروفِ عمل ہو گئی - ہر محاذ کے کمانڈر کے پاس رضا کار فوجیوں کی کئی کئی بٹالینیں موجود تھیں - لیکن انہیں ابھی تک ایک بریگیڈ کی صورت میں منظم و متحد نہیں کیا جا سکا تھا۔

اس رضا کار فوج کو کبھی ایک کمانڈر کی سربراہی میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا - کیونکہ رضا کار فوج کو جہاں کہیں بھی ضرورت پیش آتی بٹالینوں یا کمپنیوں کی شکل میں منظم و متحد کر کے ڈوگرہ فوج کے مقابلے میں صف آرا کر دیا جاتا - اور فوری طور پر کسی بھی تجربہ کار سابق فوج کے ہاتھ میں ان کی کمان دے دی جاتی - مگر جوں جوں جنگ وسعت اختیار کرتی گئی اور مختلف محاذوں پر ڈوگرہ فوج اور آزاد فوج کے درمیان بڑے پیمانے پر جنگ ہونے لگی، آزاد کشمیر فوج کی تنظیم و تربیت کا کام بھی زیادہ وسعت پذیر صورت اختیار کرتا گیا - اور ہر محاذِ جنگ کے لئے علیحدہ علیحدہ کمانیں مقرر کر دی گئیں - اور جنگ شروع ہونے کے تین ماہ بعد ہی آزاد کشمیر فوج کی مشترکہ کمان ایک سابق تجربہ کار جرنیل جناب طارق کے سپرد کر دی گئی -

رضا کار آزاد فوج کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ان کے پاس اسلحہ بارود بہت کم تھا اور جنگی نقل و حمل کے ذرائع بھی ناکافی تھے لہٰذا رضا کار فوج کے لئے اشیائے خورد و نوش کی فراہمی اور محاذِ جنگ تک اس کی ترسیل کی ذمہ داری وہاں کے عوام کے سپرد کر دی

گئی تھی - اور آج اگر اس صورت پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے عوام نے کس طرح اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر محاذِ جنگ پر رضا کار فوج کے لئے اشیائے خوردنی پہنچانے کا کارنامہ سر انجام دیتے ہوئے فوج کے ساتھ اپنے تعاون کی مثال پیش کی تھی - !

ریاست جموں وکشمیر میں اس انقلاب کا جس طرح آغاز ہوا اور عوام نے مہاراجہ ہری سنگھ کی ظالم حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے ، اسے مشہور کشمیری راہنما شیخ محمد عبداللہ نے ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے ، شیخ عبداللہ نے یہ بیان ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو دیتے ہوئے کہا تھا کہ پونچھ کے علاقے میں ہونے والے فسادات ریاستی حکومت کی پُر فریب پالیسی کا نتیجہ ہیں - کیونکہ پونچھ کے عوام نے جو پہلے ایک عرصے تک مقامی حکام کے علاوہ دربار کشمیر کے جور وستم بھی برداشت کرتے رہے ہیں - اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے ایک انقلابی تحریک کا آغاز کر دیا ہے جسے فرقہ وارانہ تحریک کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا . سری نگر کی ڈوگرہ حکومت نے پونچھ میں اپنی فوج بھیج کر ایک افراتفری کی صورت پیدا کر دی ہے - مگر چونکہ پونچھ کے علاقے میں زیادہ تر ایسے سابق مسلمان فوجی آباد ہیں - جن کے رشتے دار جہلم اور راولپنڈی میں بسے ہوتے ہیں - لہٰذا انہوں نے اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ریاست کی سرحد عبور کر کے اپنے بیوی بچوں کو ان رشتہ داروں کے پاس پہنچا دیا - اور پھر وہاں سے ضروری سامان جنگ لے کر ڈوگرہ فوج کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے کشمیر واپس پہنچ گئے ہیں - چنانچہ ڈوگرہ فوج ریاست میں کئی محاذوں سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی ہے -

کشمیر کے ہندو راہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ "پونچھ کے علاقے میں جہاں ہزارہ سابق مسلمان فوجی آباد تھے ریاست کے مہاراجہ اور اس کی ڈوگرہ شاہی کے خلاف، ریاستی عوام نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اور کشمیری عوام کی بغاوت کا یہ سلسلہ پونچھ کے نواحی علاقوں سے لے کر میرپور تک پھیل گیا۔ کیونکہ میرپور میں بھی سابق مسلمان فوجیوں کی کثیر تعداد آباد تھی۔ اور مہاراجہ اس بغاوت کی وجوہات معلوم کرنے کی بجائے بھارت کی نئی کانگریسی حکومت اور کانگریسی راہنماؤں سے گٹھ جوڑ کرنے میں مصروف رہا۔ اس بغاوت کو کچل کے لئے ڈوگرہ فوج بھیج دی گئی یا بقول ایک مقامی راجپوت کرنل کے ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے ڈوگرہ فوج وہاں روانہ کر دی گئی تھی۔ جو پونچھ کے عوام کی مشکلات و مسائل کو پس پشت ڈال کر وہاں ظلم و تشدد کا بازار گرم کر رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں نذر آتش کئے جا رہے تھے۔ اور مظلوم کشمیری عوام کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی مگر ڈوگرہ فوج کے جور و استبداد سے متعلق سری نگر پہنچنے والی خبریں اخبارات میں شائع نہیں ہونے دی جاتی تھیں۔ اور عوام کا خوف و ہراس کم کرنے کے لئے بھی حکومت کی طرف سے اس معاملے میں کوئی بیان نہیں جاری کیا جاتا تھا ——— یہ تمام واقعات ستمبر ۱۹۴۷ء میں رونما ہوئے جبکہ قبائلی مجاہدین ۲۳ راکتوبر ۱۹۴۷ء سے قبل ریاست کی حدود میں داخل نہ ہوئے تھے۔"

ریاست میں جب وسیع پیمانے پر جنگ شروع کرنے کے لئے ڈوگرہ حکومت نے اپنی ساری فوجی قوت جنگ میں جھونک دی

تو آزاد فوج بھی میدانِ عمل میں آگئی اور دونوں فوجوں کے درمیان مقابلہ کے لئے باقاعدہ نئے نئے محاذِ جنگ قائم ہونے شروع ہو گئے۔ آزاد فوج کو کمک بھیجنے کے لئے بھی نئی فوج کی بھرتی اور تربیت کا کام تیز کر دیا گیا۔ کیونکہ جن علاقوں میں جنگ ہو رہی تھی وہاں مسلمان باشندوں کی تعداد دس لاکھ سے زائد نہ تھی اور اتنی کم آبادی میں سے پچاس ہزار آزاد فوج کو کمک بھیجنے کے لئے نئے جوان حاصل کرنا بہت مشکل تھا۔ اور آزاد فوج میں بھرتی کے لئے جو کشمیری نوجوان آ رہے تھے ان میں سے اکثر کی عمر پندرہ سولہ سال تھی جو معمولی فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد آزمودہ کار ڈوگرہ فوج کے مقابلہ کے لئے محاذ جنگ پر جا رہے تھے۔ خود راقم الحروف نے کشمیر کی جنگ آزادی کے دوران ایسے نوجوان کو بھی میدانِ جنگ میں ڈوگرہ اور بھارتی فوج کا مقابلہ کرتے دیکھا جن کی عمریں بمشکل پندرہ سولہ سال تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے ایک کشمیری مجاہد کو محاذ جنگ سے واپس آتے دیکھا۔ جس کی عمر مشکل سے پندرہ سال کی تھی۔ یہ نوجوان ننگے پاؤں، پھٹی پرانی وردی پہنے ہوئے گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا اور ایک سات ہزار فٹ بلند برف پوش پہاڑی پر کئی روز تک مسلسل جنگ میں مصروف رہنے کے بعد، واپس اپنی چوکی پر آ رہا تھا۔ پوچھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اُسے محاذِ جنگ سے واپس بلایا گیا ہے۔ مگر وہ اب بھی اشکبار نگاہوں سے محاذ جنگ کی طرف دیکھتا ہوا اپنی چوکی کی طرف واپس جا رہا تھا۔ اسی قسم کے سینکڑوں کم عمر نوجوان آزاد فوج میں شامل تھے جو پوری خوراک اور آرام نہ ملنے کے باوجود ڈوگرہ فوج سے نبرد آزما تھے، جبکہ اس وقت

انہیں وردی اور تنخواہ بھی نہ دی جاتی تھی۔

کشمیر کی جنگِ آزادی کے دوران کشمیری مجاہدین نے اپنی جوانمردی وبہادری کے جو کارنامے پیش کئے، انہیں دائرہ تحریر میں لانا یا ان میں سے چند ایک کارناموں کا ہی تفصیل سے ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں ہے، تاہم میں چند مجاہدین کی ذاتی طور پر شجاعت اور اولوالعزمی کی کچھ مثالیں ضرور پیش کروں گا، جو میں نے آزاد فوج سے قریبی رابطہ قائم ہونے کی وجہ سے خود دیکھی ہیں۔

پونچھ کی سدھنوتی تحصیل کے شہر "مانگ" سے قریب ہی آزاد فوج کا ایک صوبیدار جو فوج میں بھی رہ چکا تھا، وہاں آزاد فوج کی کمان کر رہا تھا۔ اس علاقے میں دشمن کی یہ آخری چوکی تھی۔ جسے ختم کرنے کی سرتوڑ کوشش کی جا رہی تھی۔ ڈوگرہ فوج نے اپنا مورچہ ایک اسکول کی عمارت میں قائم کر رکھا تھا۔ جس میں اسلحے اور گولہ بارود کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود تھا اور چند ڈوگرہ سپاہی جو ہندوؤں میں بہترین جنگجو سمجھے جاتے ہیں اس عمارت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اس علاقے میں مسلمانوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے ڈوگرہ فوج کے پاس کمک بھی پہنچنے والی تھی۔ اور محاذِ جنگ کی طرف سے آنے والی اس تازہ دم فوج نے مسلمانوں کو دیکھ کر دور سے ہی اپنی تین انچ دہانے والی توپوں کے ذریعے مجاہدین پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ آزاد فوج کو اس تازہ دم ڈوگرہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلحے اور گولہ بارود کی سخت ضرورت تھی جو اسی صورت میں اس موقع پر حاصل ہو سکتا تھا کہ اسکول کی عمارت پر قبضہ کر لیا جائے جس میں ڈوگرہ فوج نے اپنے اسلحہ و

بارود کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ ڈوگرہ فوج برین گنیں تھامے ہوئے اس عمارت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اور ان برین گنوں نے ہی اب تک ڈوگرہ فوج کو مجاہدین کا مقابلہ کرنے میں کامیاب بنائے رکھا تھا۔ کیونکہ اس کے مقابلے میں اس وقت تک مجاہدین اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ انہیں بھی برین گنیں حاصل ہو سکیں گی۔ عین اس موقع پر جبکہ ڈوگرہ فوج نے دور سے ہی مجاہدین پر گولہ باری شروع کر رکھی تھی۔ آزاد فوج کا یہ ایک صوبیدار چند جانباز مجاہدین کو ساتھ لے کر زمین پر رینگتا ہوا اسکول کی عمارت کی طرف بڑھنے لگا اور آخر اسکول کی اس کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، جہاں ڈوگرہ فوجی برین گنیں لئے کھڑے تھے۔ اس نے ایک دم عقاب کی طرح جھپٹ کر کوشش کی کہ ڈوگرہ فوجیوں سے ان کی برین گنیں چھین لی۔ مگر دست بدست مقابلہ ہونے سے پہلے ہی ڈوگرہ فوجیوں کی گولیوں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا اور وہ جاں بحق ہو کر زمین پر آ رہا۔ صوبیدار کے گرتے ہی اس کے نوجوان بھتیجے عمارت کے محافظوں پر حملہ آور ہونے کے لئے ان پر جھپٹے مگر انہیں بھی ڈوگرہ محافظوں نے شہید کر دیا۔ اور انہیں یکے بعد دیگرے ڈوگرہ محافظوں کی گولیوں سے جام شہادت نوش کرتے دیکھ کر کئی دوسرے مجاہدین بھی جو ان کے پیچھے پیچھے رینگتے ہوئے چلے آئے تھے۔ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر ڈوگرہ محافظوں پر یکبارگی نعرے لگاتے ہوئے جھپٹ پڑے، محافظ انہیں اچانک اپنے اس قدر قریب دیکھ کر بوکھلا اٹھے اور گولیاں بھی نہ چلا سکے تھے کہ مجاہدین نے ان سے دست و گریبان ہو کر برین گنیں چھین لیں اور آخر کار ان محافظوں

کو مغلوب کر کے اسلحے و بارود سے بھری ہوئی ساری عمارت پر قبضہ کر لیا۔

اسی طرح ۱۹۴۸ء کے آخری ایام میں بھارتی فوج نے کوٹلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تو صورتِ حال بہت سنگین ہو گئی۔ اس محاذ پر بھارتی فوج اپنے ساتھ ٹینک لے کر بھی آئی تھی۔ اگرچہ پہاڑی راستوں کے باعث محاذِ جنگ پر زیادہ ٹینک نہیں لائے جا سکتے تھے لیکن پھر بھی بھارتی فوج کسی نہ کسی طرح مجاہدین کے مقابلے میں کافی ٹینک لے آئی تھی جبکہ ان کے مقابلہ میں مجاہدین کے پاس نہ تو ٹینک تھے اور نہ ٹینک شکن توپیں تھیں۔ چنانچہ اس موقع پر موت کے خوف سے بے نیاز ہو کر کم عمر کشمیری مجاہدین نے دستی بموں سے ان ٹینکوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کثیر تعداد میں نوجوان مجاہدین دستی بم لے کر ان ٹینکوں کے مقابلے میں کود پڑے اور انہیں ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر اپنے بموں کا نشانہ بنانے لگے۔ اگرچہ ان کم عمر مجاہدین کی نعشیں بھی ٹینکوں کی زد میں آ کر قیمہ بن گئیں مگر ان کے دستی بم اپنا کام کر گئے۔ اور بھارتی فوج جو مجاہدین آزادی کو کچلنے کے لئے یہ دیو ہیکل ٹینک لے کر میدانِ جنگ میں آئی تھی، اپنے ٹینکوں کو لوہے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے ڈھیر کی صورت میں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپانی فوجیوں نے بھی اپنی شجاعت و جوانمردی کے ناقابلِ قیاس کارنامے سر انجام دیئے تھے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کشمیری مجاہدین آزادی کے یہ کارنامے بھی کسی صورت میں کم نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

ضلع میرپور میں بھمبر کے محاذ پر سلیمان خیل قبیلہ کے ایک مجاہد نے بھی اپنی ذاتی شجاعت و جوانمردی کا ایک ایسا ہی شاندار کارنامہ انجام دیا

تھا جبکہ یہ مجاہد چار سو گز تک پیٹ کے بل رینگنے کے بعد اچانک دشمن کی ایک گولہ باری کرنے والی توپ پر جھپٹ پڑا جسے دشمن کے تین سپاہی چلا رہے ہے۔ اسی طرح دوسرے محاذوں پر مہمندی اور محسود می قبائلیوں نے بھی دشمن کے فوجی قافلوں پر کامیاب شب خون مار کر اپنی ذاتی شجاعت و دلیری کے متعدد بار ناقابل فراموش ثبوت پیش کئے۔ یہ قبائلی مجاہدین جنگ کے دوران دشمن کے ہاتھوں اس طرح زخمی ہوتے ہیں کہ اکثر صورتوں میں تو ان کی شکلیں تک بھی نہیں پہچانی جاتیں۔ مگر ہم نے انہیں جب بھی ہسپتال میں جاکر دیکھا، انہیں اس حالت میں بھی مسکراتے ہوئے پایا۔ قبائلی عوام اگرچہ بڑے اچھے سپاہی ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنے قبائلی انداز ہی میں جنگ کر سکتے ہیں اور اگر یہ کوشش کی جائے کہ انہیں مستقل فوج کی حیثیت سے تربیت دے کر فنّ حرب کے جدید طریقوں سے بھی آگاہ کیا جائے تو میرے خیال میں ان کی وہ جنگی صفات اور طریق جنگ کی خصوصیات بھی ختم ہو کر رہ جائیں گی جن کی وجہ سے دشمن ان کے تصور سے ہی کانپ اُٹھتا ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ڈوگرہ فوج پونچھ کی تحصیل سدھنوتی میں راولاکوٹ کے ایک قریبی مقام کھائی گلہ میں ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ یہاں سے ریاست کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو کچلنے کے لئے فوج بھیجی جا رہی تھی اور بارغ کے علاقے میں مسلمانوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے نصف بٹالین فوج یہاں سے بھیجی گئی لیکن بارغ کے مسلمانوں کو ڈوگرہ فوج کی آمد کا قبل از وقت علم ہو گیا اور انھوں نے

راولاکوٹ کے مسلمانوں کو پیغام بھیجا کہ راستے میں ڈوگرہ فوج کو روکنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ راولاکوٹ کے پانچ سو نہتے مسلمان مجاہدین نصف بٹالین ڈوگرہ فوج کے راستے میں مزاحمت پیدا کرنے کے لیئے سڑک پر کھڑے ہوگئے۔ ڈوگرہ فوج کے کمانڈر نے انہیں منتشر ہونے کا حکم دیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ لوگ یہ صرف مظاہرہ کرنے کے لیئے جمع ہوگئے ہیں۔ لیکن ان نڈر اور بہادر مجاہدین نے جواب میں ڈوگرہ فوج پر پتھراؤ شروع کر دیا جس سے کئی ڈوگرہ فوج کے افسر شدید زخمی ہوگئے اور پھر فوج نے مجاہدین پر اندھا دھند گولی چلادی جس کے نتیجے میں متعدد مسلمان شہید اور زخمی ہوئے۔ اور جس طرح ان پانچسو مسلمانوں نے نصف بٹالین ڈوگرہ فوج کا راستہ روک کر انہیں للکارا جنگوں کی تاریخ میں اس کی مثال ملنی بھی مشکل ہے۔

شروع شروع میں اگرچہ صرف سابق فوجی ہی آزاد کشمیر فوج کی کمان کرتے رہے ہیں لیکن بعد میں آزاد فوج کی کمان کے لیئے بڑے بڑے تجربہ کار فوجی افسروں نے بھی اپنی خدمات پیش کر دیں جنہوں نے آزاد کشمیر فوج کو ایک مستقل فوج کی صورت میں منظم کرنے میں بڑی مدد کی اور یہ فوجی افسر اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود آزاد فوج کو منظم کرنے کے لیئے بڑے مفید ثابت ہوئے۔ آزاد فوج کی تنظیم و تربیت میں سب سے نمایاں خدمات جنرل طارق نے سرانجام دیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ انکی موجودگی نے بعض فوجی افسروں کو بھی ایک جگہ جمع رہنے اور کام کرنے پر مجبور کیئے رکھا۔

ریاست کو ڈوگرہ شاہی کے تسلط سے آزاد کروانے کے لیئے

آزاد کشمیر فوج نے اپنے ایثار و قربانی کے جس بے پایاں جذبے کیساتھ جنگ لڑی، اس نے ثابت کر دیا کہ آزاد فوج اپنے وطن عزیز کی حفاظت و بقاء کے لئے قربانی دینے میں کسی سے کمتر نہیں ہے۔ ریاست میں جنگ بندی کے بعد آزاد فوج کی ایک مستقل اور باقاعدہ فوج قائم کرنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ اور تمام تربیتی مرکزوں میں فوج کو جدید ترین فنِ حرب سے آگاہ کرنے کے لئے تجربکار فوجی افسر مقرر کئے گئے۔ اور تمام فوج کو الگ الگ یونٹوں میں تقسیم کر کے باقاعدہ مختلف چھاؤنیوں میں متعین کیا گیا۔ آزاد فوج کی اس تنظیم نو کے سلسلے میں اس کی کئی بٹالینیں توڑ دی گئیں، اور مستقل فوج کی کل تیس بٹالینیں قائم کر دی گئیں۔

آزاد کشمیر کی فوج پاکستانی مسلح افواج کی دست راست ہے اور یہ حقیقت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج کو ایشیا بھر میں ایک تاریخی کردار ادا کرنا ہے۔ کیونکہ اس کے ذمہ صرف مملکتِ پاکستان کی حفاظت ہی نہیں۔ بلکہ وہ ان نظریات کے تحفظ کی بھی ذمہ دار ہے جن کی خاطر پاکستان قائم کیا گیا تھا اور بین الاقوامی حالات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان کی مسلح افواج کو مستقبل قریب میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے ہوں گے اور اس وقت آزاد کشمیر فوج کے یہ جانباز سپاہی بھی پاکستانی فوج کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت و بہادری کے جوہر دکھانے پر آمادہ ہوں گے۔ ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ پاکستان کی مسلح افواج مملکت پاکستان کی ایک عظیم دولت ہیں اور تحریک آزادیٔ کشمیر کے دوران پاکستانی فوج نے ماضی میں جو عظیم الشان اور ناقابل فراموش

کردار ادا کیا اس کا ذکر کرنا اس مختصر سی کتاب میں ممکن نہیں ہے اور یہ پاکستانی فوج اس وقت آزاد کشمیر میں اس طرح قابض فوج کی حیثیت بھی ہرگز نہیں رکھتی جس طرح کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج نے ریاست جموں وکشمیر پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ بلکہ آزاد کشمیر میں پاکستانی فوج کو محض ایک محافظ فوج کی حیثیت حاصل ہے۔ جو ریاست جموں وکشمیر کے آزاد علاقے کی سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ کشمیری مسلمانوں کے جان ومال اور ان نظریات کی حفاظت کرنے کا فرض بھی انجام دے رہی ہے جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے کشمیری مسلمانوں نے ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی جدوجہد شروع کی تھی۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان کی قرارداد کے تحت ریاست جموں وکشمیر میں جنگ بند کر دی گئی۔ کمیشن کی یہ قرارداد مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے:۔

(ا) ہند و پاکستان کے مابین ریاست میں جنگ بندی کا معاہدہ۔

(ب) طرفین میں عارضی صلح کا معاہدہ۔

(ج) ریاست میں رائے شماری کروانے کا وقفہ۔

ریاست میں جنگ بندی کے بعد دوسرا مرحلہ طرفین کے درمیان عارضی صلح کے معاہدہ پر دستخط کرنا تھا اور پاکستان و بھارت کے لئے یہ ضروری قرار پایا تھا کہ وہ اس معاہدے پر کاربند رہیں۔ لیکن جس طرح ریاست میں جنگ بند کرنے کا طرفین کے مابین معاہدہ ہو چکا تھا اس طرح عارضی صلح کا معاہدہ ان میں نہ ہو سکا۔ اور جونہی ریاست سے طرفین کی فوجوں کے انخلاء کا سوال پیدا ہوا، بھارت نے اس ضمن

میں سلامتی کونسل کی قرارداد کے مطابق کیے گئے وعدوں سے رُوگردانی شروع کر دی۔ اور ریاست سے فوجوں کے انخلاء کا منصوبہ ناکام بنانے اور اپنی وعدوں سے منحرف ہونے کے لئے مندرجہ ذیل نئی تجاویز بھی پیش کر دیں۔

(ا) سب سے پہلے آزاد کشمیر کی فوج کو توڑ دیا جائے۔

(ب) ریاست میں شمالی علاقے کے نظم و نسق اور دفاع کے مسئلوں پر غور کیا جائے۔

جب بھارتی حکومت نے آزاد کشمیر فوج کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا تو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے اس مسئلہ پر نہایت واضح مؤقف اختیار کیا۔ جس کا اظہار پاکستان کے وزیر خارجہ کے نام کمیشن کے درج ذیل مراسلہ مورخہ ۱۹ ستمبر ۴۸ء میں کیا گیا ہے "کمیشن اس بات پر رضامند ہے کہ عارضی صلح کی مدت کم از کم رکھی جائے اور کمیشن کی قرارداد کی رُو سے یہ امر بھی لازمی نہیں ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو توڑ دیا جائے"۔

اقوام متحدہ کمیشن نے بھارتی وزیر اعظم کے نام بھی درج ذیل مراسلہ مورخہ ۷ اگست ۴۸ء میں تقریباً اسی انداز میں اپنے مؤقف کی وضاحت کی ہے:۔ "مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی مختصر سی فوج قیام کرے اور دوسری جانب آزاد فوج بھی اپنی جگہ قائم رہے"۔ آزاد کشمیر فوج توڑنے کے متعلق بحث و تمحیص نے اس وقت تک اس قدر پیچیدہ صورت حال اختیار نہ کی تھی۔ جب بھارت کی وزارت امور خارجہ کے سیکرٹری جنرل "سر گرجا شنکر باجپائی" نے کمیشن کے نام مندرجہ ذیل مراسلہ روانہ کیا:۔ "آزاد کشمیر کی افواج کو غیر مسلح کرنے کا مسئلہ ایک خاص اور محدود وقت سے

تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلے ریاست میں مؤثر جنگ بندی ہونی لازمی ہے اور اس کے بعد طرفین کے درمیان معاہدۂ صلح ہونا چاہیئے جیسا کہ کمیشن کہ قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے حصّہ اوّل اور دوم میں ہدایت کی گئی ہے۔ اس کے بعد ریاست میں رائے شماری کے لئے ضروری انتظامات کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ اس علاقے کے غیر مسلم ریاستی باشندے جو علاقہ اب آزاد کشمیر فوج کی عملداری میں ہے اپنے اپنے گھروں میں جا کر دوبارہ آباد ہو جائیں۔ اور جہاں تک ریاست کے غیر مسلم باشندوں کا تعلق ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے علاقوں میں جا کر دوبارہ آباد نہیں ہو سکتے جب تک کہ آزاد کشمیر فوج کو پوری طرح غیر مسلح نہ کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا متنازع مسئلہ یہ تھا کہ ریاست میں رائے شماری کے انتظامات کروانے سے پیشتر آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح کیا جائے یا اقوام متحدہ کمیشن برائے ہند و پاکستان کی قرارداد کی رُو سے یہ بات لازم ہوتی ہے کہ ریاست میں رائے شماری کروانے والے اقوام متحدہ کے منتظمین آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح کرنے کا کام خود سر انجام دیں۔ بھارتی حکومت کا مطالبہ یہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر سے بھارتی فوج کے انخلاء سے پیشتر آزاد کشمیر کی فوج کو توڑ دیا جائے جبکہ اس برعکس اقوام متحدہ کے کمیشن اور حکومتِ پاکستان کا یہ مؤقف تھا کہ کمیشن کی قرارداد کے مطابق آزاد کشمیر فوج کو توڑنے کا کام ریاست میں رائے شماری شروع کروانے سے ذرا پہلے اقوام متحدہ کے نگران اپنے ہاتھ سے سر انجام دیں اور جب تک کہ ریاست میں رائے شماری کروانے کے تمام ضروری انتظامات

مکمل نہیں ہو جاتے آزاد کشمیر فوج کو توڑنے یا غیر مسلح کرنے کے مسئلہ پر غور نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کے وزیر خارجہ نے فروری ۱۹۵۰ء میں سلامتی کونسل کے اجلاس میں مندرجہ ذیل تقریر کی تھی:۔

"دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا بھارت یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ کمیشن کی قرارداد کے مطابق آزاد کشمیر کی فوج طرفین کے درمیان معاہدۂ عارضی صلح کے مرحلے پر توڑی جانی ضروری ہے۔ یا پاکستان کا یہ مؤقف درست ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو توڑنے کا کام ریاست میں رائے شماری کروانے کے مرحلہ پر ہونا چاہیئے۔ یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے کمیشن کی متعلقہ قراردادوں کے متن کا بغور مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء میں کمیشن کی قرارداد کا حوالہ دوں گا جس میں ریاست میں جنگ بندی اور طرفین کے درمیان عارضی معاہدۂ صلح کی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔ اور اس قرارداد میں آزاد کشمیر فوج کا سرے سے کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ اور یہ قرارداد بذاتِ خود اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آزاد کشمیر فوج، جس کو غیر مسلح کرنے کی ہدایت کمیشن کی بعد کی قراردادوں میں شامل ہے۔ مذکورہ بالا قرارداد کی رُو سے غیر مسلح نہیں کی جا سکتی۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ آزاد کشمیر فوج معاہدۂ عارضی صلح کے مرحلے پر غیر مسلح نہیں کی جا سکتی اور کمیشن پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو اپنی ان ہدایات سے کئی بار واضح طور پر آگاہ کر چکا ہے۔"

کمیشن کے چیئرمین مسٹر "کوربل" نے اس مسئلے پر اپنی رائے کا

اظہار ان الفاظ میں کیا ہے "کمیشن ریاست میں طرفین کے درمیان طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری توجہ دے رہا ہے۔ اور قرارداد تیار کرتے ہوئے کمیشن نے طرفین کے درمیان طاقت کے توازن کا مسئلہ بھی پوری طرح پیش نظر رکھا ہے" —— مسٹر کاربل نے پاکستان کے وزیر خارجہ کی توجہ اس طرف مبذول کرواتے ہوئے کہا ہے کہ اگر آزاد کشمیر سے پاکستانی فوج واپس بلوا بھی لی جائے تو آزاد فوج کی پینتیس بٹالینیں اس علاقے میں پھر بھی موجود رہیں گی۔ جنہیں غیر مسلح ہونے یا ریاست کے آزاد علاقے سے باہر نکل جانے کی ہدایت نہیں کی گئی۔

کمیشن نے ۱۷ اگست ۱۹۴۸ء کو بھارت کے آنجہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ایک ملاقات کے دوران آزاد کشمیر فوج کے توڑنے یا اسے غیر مسلح کرنے کے متعلق کمیشن کے مؤقف پر روشنی ڈالی۔ پنڈت نہرو اور کمیشن کے افراد کے درمیان اس بات چیت کے خلاصے میں کہا گیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی کچھ فوج قیام کر سکے گی اور آزاد کشمیر کے علاقے میں آزاد فوج بھی اپنی جگہ موجود رہے گی۔

۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو کمیشن نے جو قرارداد منظور کی تھی اس کے پیراگراف نمبر ۴ (الف) میں کہا گیا ہے کہ جب کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے حصہ اوّل اور حصہ دوم پر عمل درآمد کیا جا چکے گا اور کمیشن کو یقین ہو گا کہ ریاست میں پر امن حالات ہیں تو کمیشن اور رائے شماری کے منتظمین بھارتی حکمرانوں کے مشورے کے بعد مقبوضہ کشمیر سے بھارتی فوج کے انخلاء اور ریاست کی ڈوگرہ فوج کو توڑنے کا کام کرے گی۔ جس کے ساتھ ساتھ اس امر کا بھی خیال رکھا جائے گا کہ ریاست کا

تحفظ بھی خطرے میں نہ پڑے۔ اور ریاست میں آزادانہ و منصفانہ رائے شماری کروائی جاسکے۔ اسی پیراگراف کے دوسرے حصے میں کہا گیا ہے کہ جہاں تک اس علاقے کا تعلق ہے جس کا ذکر ۱۳ اگست ۴۸ء کی قرارداد کے حصہ دوم کی الف (۲) شق میں کیا گیا ہے، اس علاقے میں مسلح افواج کو ختم کرنے کا کام کمیشن کے ارکان اور رائے شماری کے منتظمین مقامی حکام کے صلاح و مشورے سے کریں گے۔ مذکورہ قرارداد میں جن علاقوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ آزاد کشمیر کے علاقے ہیں۔

فروری ۴۸ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ نے سلامتی کونسل کے وزیر خارجہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو ختم کرنے کا کام ریاست میں رائے شماری شروع ہونے کے بعد کیا جائے گا اور اس کے ساتھ ساتھ ریاست میں مقیم بھارتی فوج کو وہاں سے نکال کر ریاست کی ڈوگرہ فوج بھی توڑ دی جائے گی اور اٹھارہ فروری ۴۹ء تک بھارتی حکومت کمیشن برائے ہند و پاکستان کی دونوں قراردادیں منظور کرتے ہوئے آزاد کشمیر کی فوج کا موجود رہنا تسلیم کر چکی تھی۔

بھارتی حکومت نے کمیشن کی یہ قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۴۸ء کو منظور کرنے کے بعد پھر اس سے انحراف کی کوشش شروع کر دی۔ اور بھارت کی وزارت امور خارجہ کے سیکرٹری جنرل سر گرجا شنکر باجپائی نے ۱۷ مارچ ۴۹ء کو کمیشن کے نام مندرجہ ذیل مراسلہ بھیجا: "آزاد کشمیر کے علاقے سے تمام پاکستانی فوجیں نکالی جائیں اور فریقین کے درمیان عارضی معاہدہ صلح کے مرحلہ پر آزاد کشمیر فوج کو ان کے موجودہ مقامات متعینہ سے اس طرح ہٹایا جائے کہ اسے غیر مسلح کر کے بالکل ختم کرنے کا راستہ ہموار ہو سکے

کمیشن نے سرگرجا شنکر باجپائی کے مراسلے کا جواب دیتے ہوئے اپنے مراسلہ مورخہ ۱۴ر مارچ ۱۹۴۹ء کے پیراگراف نمبر ۲ میں کہا کہ گذشتہ اگست کے دوران کمیشن نے حکومت پاکستان پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس کی رائے میں ریاست جموں وکشمیر میں فریقین کے مابین عارضی معاہدہ صلح کے دوران دونوں فریقین کے درمیان طاقت کا توازن برقرار رہنا چاہیئے۔ اور کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ر اگست میں آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح کرنے یا اسے توڑنے کی کوئی ہدایت نہیں کی گئی۔ جس کی تعداد کمیشن کے اندازے کے مطابق پنتیس بٹالینیں ہے۔ کمیشن نے اپنے ۲۸ر اپریل ۱۹۴۹ء کے مراسلہ میں اپنے اس موقف کی دوبارہ ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔" بھارتی حکومت پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ کمیشن اس مرحلے پر آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح کرنے کے مسئلے کو نہیں چھیڑ سکتا۔ کیونکہ یہ مسئلہ کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ر اگست ۱۹۴۸ء کے دائرہ کار میں نہیں آتی۔ تاہم کمیشن کو اس مسئلے کی اہمیت کا احساس ہے اور کمیشن اس پر بھی بلا تاخیر غور کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کمیشن بھارت کے اس موقف سے بالکل اتفاق نہیں رکھتا کہ بھارتی حکومت کے مراسلہ مورخہ ۱۷ر اپریل ۱۹۴۹ء میں دی گئی مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کی تعداد میں کمی اسی صورت میں کی جا سکتی ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو بالکل غیر مسلح کر دیا جائے۔ تاہم کمیشن کو اس بات کا یقین ہے اس مسئلے پر جلد از جلد غور کرنے سے ہی ریاست میں رائے شماری کے انتظامات کروانے میں مدد مل سکے گی۔

اس سارے معاملے میں بھارتی حکومت کی اس طویل کج بحثی سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ بھارتی حکومت آزاد کشمیر فوج کے مسئلے پر

کس قدر تنگ مزاجی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔ کیونکہ وہ مسلسل اس بات پر اصرار کرتی رہی ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح کر کے بالکل توڑ دیا جائے تاکہ فریقین کے درمیان عارضی معاہدۂ صلح کیا جا سکے۔ بھارتی حکومت کا یہ موقف بالکل انوکھا تھا کہ عارضی معاہدۂ صلح سے قبل آزاد فوج کا توڑ دینا ضروری ہے۔ جس کے پس منظر میں بھارتی حکومت کا صرف یہی خوف و خدشہ کارفرما تھا کہ اس کی مسلح افواج آزاد کشمیر فوج پر قابو نہیں پا سکتی تھیں۔ اور ہمیشہ بھارتی حکومت صرف یہی ایک فکر دامنگیر رہی کہ معاہدہ عارضی صلح کے دوران آزاد کشمیر فوج جنگ بندی کا معاہدہ توڑ کر تمام ریاست پر قبضہ کر لے گی مگر بھارتی حکومت کا یہ خوف و ہراس بالکل بے معنی تھا کیونکہ حکومت پاکستان بھارتی حکومت اور سلامتی کونسل کو اس بات کی ضمانت دینے کو تیار تھی کہ جنگ بندی کے معاہدہ کی خلاف ورزی اس کی طرف سے کم از کم ہرگز نہ کی جائے گی۔ لہٰذا اگر مسئلہ کشمیر حل کر لینے کے متعلق بھارتی حکومت کی نیت صاف تھی تو حکومتِ پاکستان کی طرف سے دی گئی ضمانت بھارتی حکومت کو صاف دلی سے قبول کر لینی چاہیے تھی۔

آج مسئلہ کشمیر اسی صورت میں حل کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے پر بھارتی حکومت کا صحیح اور واضح موقف معلوم کیا جا سکے۔ کیونکہ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ بھارتی حکومت آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح کرنے کے مطالبہ کی آڑ میں فریقین کے درمیان عارضی معاہدہ صلح یا ریاست میں رائے شماری کو معرضِ التوا میں ڈالنا چاہتی ہے یا اسے درحقیقت یہ خطرہ لاحق ہے کہ آزاد کشمیر فوج ریاست میں رائے

شماری کروانے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوگی - اگر اس ضمن میں بھارتی حکومت کا موقف واضح ہو کر سامنے آجائے تو مسئلہ کشمیر پر از سر نو نہایت سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک حکومت آزاد کشمیر کے نقطۂ نظر کا تعلق ہے وہ مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج کا قیام بھی برداشت کر سکتی ہے اور پاکستان کے وزیر خارجہ نے تو سلامتی کونسل کے اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر بھارتی حکومت آزاد کشمیر میں آزاد فوج کے قیام پر رضامند ہو جائے تو پاکستان بھی بھارت کو مقبوضہ کشمیر میں اٹھائیس بٹالینیں فوج رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے - اور وزیر خارجہ پاکستان کی اس پیشکش نے بھارتی حکومت کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور مستقبل قریب میں یہ بات بھی ثابت ہو جائے گی کہ بھارتی حکومت کو اس طویل کج بحثی کا مقصد ریاست میں رائے شماری کے کام کو کھٹائی میں ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے -

(۹)

آزاد حکومتِ جموّں وکشمیر

ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ شاہی ظلم و تشدّد کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی نے جب بغاوت کی صورت اختیار کر لی تو کسی کو بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ ڈوگرہ شاہی کے ریاست پر ناجائز تسلط کیخلاف ریاستی مسلمانوں کی یہ بغاوت آئندہ کیا شکل اختیار کرے گی۔ دوسری طرف اس مسئلے پر غور و فکر کرنے کے لئے مسلم کانفرنس کے راہنماؤں کا ایک جگہ جمع ہونا اب کسی صورت بھی ممکن نظر نہ آتا تھا۔ کیونکہ مسلم کانفرنس کے تمام راہنما ریاست کے مختلف حصوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اور کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس طلب کرنا بھی ناممکنات میں شامل تھا۔ جولائی ۴۷ء میں مجلس عاملہ کے آخری اجلاس کے بعد مسلم کانفرنس کے تمام راہنما اپنے اپنے علاقوں میں ڈوگرہ تسلّط کے خلاف تحریک چلانے کیلئے روانہ ہو گئے تھے۔ جس کے بعد سے ریاست کے ہر گوشے میں حالات روز بروز بد تر ہوتے چلے گئے تھے اور ریاست بھر میں آمد و رفت کے انتظامات معطل ہو کر رہ گئے تھے۔ ان حالات

میں مسلم کانفرنس کے راہنماؤں کے لئے باہمی صلاح و مشورہ کے بعد کوئی مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ اگرچہ اگست ۱۹۴۷ء تک مسلم کانفرنس کے صرف وہ راہنما آپس میں صلاح و مشورہ کر سکتے تھے جو سری نگر میں موجود تھے اور جب سے راقم الحروف سری نگر چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا اسے بھی اپنے کسی سیاسی شریک کار سے مشورہ کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ گو مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر نے مجھے پاکستان میں رہ کر کشمیری مسلمانوں کے لئے کام کرنے کے مکمل اختیارات دے دیئے تھے اور مجھ سے اپنے محدود ذرائع کی بنا پر ان کی امداد و خدمت کیلئے جو کچھ بن پڑا وہ میں نے کیا اور اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست کے حالات اور زیادہ تیزی سے تبدیل ہونے لگے خاص طور پر پونچھ اور مظفرآباد کے علاقوں میں حالات ہر روز نئی منقلب صورت اختیار کر رہے تھے اور ۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ریاست کے متعدد مقامات پر ڈوگرہ فوج سے باقاعدہ جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ڈوگرہ فوج کئی مقامات پر مجاہدین آزادی سے برسر پیکار رہتی۔ مگر ریاست کا زیادہ تر علاقہ ڈوگرہ فوج کے تسلط سے آزاد کروایا جا چکا ہے اور جب آزاد فوج ریاست کا ایک وسیع علاقہ ڈوگرہ شاہی راج کی غلامی سے آزاد کروا چکی تو یہ مسائل بھی پیدا ہو گئے کہ آزاد علاقے کا نظم و نسق کس طریق کار سے چلایا جائے اور اس علاقے میں بحالی امن و امان کیلئے کیا اقدام کئے جائیں کیونکہ اس آزاد علاقے میں ایک مستحکم نظم و نسق کا قیام ڈوگرہ فوج سے جنگ جاری رکھنے کیلئے بھی نہایت ضروری تھا۔ اور جنگ جاری رکھنے کیلئے یہ بھی ضروری تھا کہ آزاد فوج کو زیادہ سے زیادہ مستحکم اور منظم بنایا جائے۔ نئے بھرتی کئے

جانے والے نوجوانوں کے لئے فوجی تربیت کے انتظامات بہتر بنائے جائیں اور ڈوگرہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ تازہ دم اور تربیت یافتہ فوج کو محاذِ جنگ پر بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ پھر مختلف محاذوں پر بھارتی اور ڈوگرہ فوج سے نبرد آزما آزاد فوج کیلئے گولہ بارود، اسلحہ اور اشیائے خوردنی کی فراہمی بھی ضروری تھی جس کے لئے مواصلات کا انتظام کرنا بھی لازمی تھا اور اس کام کیلئے کئی جگہ سے پہاڑی علاقے کو صاف کر کے وہاں سڑکیں تعمیر کرنا بھی ایک نہایت اہم فوجی ضرورت تھی۔ اور ان تمام امور کی انجام دہی کیلئے ضروری تھا کہ ریاست کے آزاد علاقے کی اپنی حکومت قائم کی جائے تاکہ وہ یہ سارے ضروری انتظامات کرنے کی ذمہ داری اٹھا سکے۔

آخر ۱۸۴۶ء کے بعد پہلی مرتبہ ریاست میں ڈوگرہ خاندان کی مطلق العنان حکومت کے مقابلے میں جس کا سربراہ اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ تھا۔ ریاستی مسلمانوں کی آزاد و خود مختار حکومت قائم کر دی گئی۔ ریاست کے عوام ۱۹۳۱ء سے ریاست میں مہاراجہ ہری سنگھ کی ریاستی سربراہی میں ہی ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے سیاسی تحریک چلا رہے تھے۔ اور خواہ نیشنل کانفرنس ہو یا مسلم کانفرنس، ریاست کی کسی سیاسی جماعت کو اس بات کا خیال ہی نہ تھا کہ ریاست میں مسلح بغاوت کر کے مہاراجہ کی مطلق العنان اور فرض ناشناس حکومت کے مقابلے میں ایک آزاد اور خود مختار ذمہ دار حکومت بھی قائم کی جا سکتی ہے۔ مگر ۱۸۴۶ء سے کر اب تک ریاستی عوام پر اس قدر نازک وقت کبھی نہ آیا تھا۔ جس قدر کہ ڈوگرہ شاہی کی چیرہ دستیوں کی بدولت اس دور میں جبکہ قدرت نے اس عظیم تحریک آزادی کی ذمہ داری مسلم کانفرنس کے کندھوں پر ڈال دی جو اس وقت ریاست میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے معروف

عمل تھی۔ کیونکہ مسلم کانفرنس کے اکثر راہنما جیلوں میں تھے اور ان سے ریاست میں کھلم کھلا طور پر جنگ آزادی شروع کرنے سے پہلے مشورہ کرنا ممکن نہ تھا اور آج تو اس بات کا فیصلہ کرنا بھی نہایت دشوار ہے کہ اگر اس وقت ان راہنماؤں سے اس ضمن میں مشورہ لیا جاتا تو کیا وہ یہ جنگ آزادی شروع کرنے کی حمایت کرتے یا مخالفت؟

۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جموں وکشمیر کی آزاد حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا اور دریائے جہلم کے قریب پونچھ کے جنوب میں پلندری کے مقام پر آزاد حکومت کا صدر مقام قائم کیا گیا۔ راقم الحروف کو اس موقع پر آزاد علاقے کی اس حکومت کا بلا مقابلہ صدر منتخب کیا گیا، جس کا نام "حکومت آزاد جموں وکشمیر" رکھا گیا۔ مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ نے بھی بالاتفاق مجھے آزاد جموں وکشمیر کا پہلا صدر تسلیم کر لیا۔ اور میں نے آزاد علاقے کی صدارتی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے آزاد حکومت کا تنظیمی ڈھانچہ اس طرح قائم کیا:۔

(۱) سردار محمد ابراہیم خاں .. .. .. (صدر آزاد جموں وکشمیر)

(۲) سید علی احمد شاہ .. .. .. (وزیر دفاع)

(۳) چوہدری عبداللہ خاں بھالی .. .. (وزیر مال)

(۴) خواجہ غلام دین وانی .. .. (وزیر داخلہ)

(۵) سید نظیر حسین شاہ .. .. (وزیر داخلہ)

(۶) میر واعظ محمد یوسف شاہ .. .. (وزیر تعلیم)

(۷) خواجہ ثناء اللہ شمیم (وزیر خوراک)

آزاد حکومت کے آئین کے مطابق ریاست کے صدر کو سربراہ مملکت کے ساتھ ساتھ حکومت یعنی کابینہ کے سربراہ کی حیثیت سے بھی

ذمہ داریاں قبول کرنا ہوتی تھیں اور صدر ریاست سربراہ ریاست کی حیثیت سے وزراء کے تقرر کا اختیار بھی رکھتا تھا اور یہ وزراء کابینہ کی صورت میں کام کرتے تھے۔ جو صدر مملکت کے سامنے جواب دہ تھی۔ صدر مملکت کچھ محکمے اپنے پاس رکھ کر باقی محکمے دوسرے وزراء کو تقسیم کر سکتا تھا۔ اور ضرورت پیش آنے پر صدر مملکت کسی وزیر سے استعفیٰ طلب کرنے یا اسے برطرف کرنے کا مجاز بھی تھا۔ مسلم کانفرنس اپنی مجلس عاملہ کے ذریعے آزاد ریاست کے اس آئینی ڈھانچہ کی منظوری کا اعلان کر چکی تھی۔ آزاد علاقے میں جس قسم کے حالات تھے ان کے پیش نظر کوئی شخص بھی آزاد ریاست کے صدر کا عہدہ سنبھالنے کیلئے تیار نہ تھا کیونکہ ریاست کے باہر کوئی شخص بھی ریاست کے آزاد علاقہ میں کشمیری مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار حکومت کا وجود تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا اور ریاست کے باہر کی دنیا میں کسی کو یہ بھی یقین نہ تھا کہ آزاد کشمیر میں مسلمانوں کی آزاد حکومت زیادہ عرصہ قائم رہ سکے گی۔ لہٰذا کوئی شخص بھی آزاد حکومت میں شامل ہو کر اس کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ علاوہ ازیں کشمیر کے اکثر مسلمان سیاسی راہنماؤں کے اہل و عیال بھی مقبوضہ کشمیر میں موجود تھے اور انہیں اس بات کا خطرہ لاحق تھا کہ ڈوگرہ حکومت ان کے آزاد حکومت میں شامل ہونے کی صورت میں ان کے اہل و عیال کو بھی ان کے ساتھ ہی اپنے ظلم کا نشانہ بنائے گی۔ اور اگرچہ راقم الحروف کے اہل و عیال بھی اسوقت تک سری نگر میں مقیم تھے لیکن میں نے اس خطرہ کے باوجود آزاد ریاست کی صدارت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ میرے تمام سیاسی رفقائے کار کی خواہش بھی یہی تھی کہ آزاد حکومت کے سربراہ کی ذمہ داریاں میں سنبھالوں اور اگر کوئی شخص وسیع القلبی سے سوچے کہ اس کے گرد و پیش میں جو کچھ بھی

ہو رہا ہے۔ اسے ان کا بہر صورت مقابلہ کرنا ہے تو اس کے لئے اپنے اہل و عیال کی کفالت و حفاظت کی فکر ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اور قومی و ملی اعتبار سے جن خطرناک حالات سے اس وقت ہم اہل کشمیر گذر رہے تھے ان حالات میں اپنے بیوی بچوں کا فکر کرنا بھی محال تھا پھر ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا کہ اپنے اہل و عیال کو خدائے تعالیٰ کے سپرد کر کے قوم کو ڈوگرہ شاہی کے تسلط سے آزاد کروانے کی جدوجہد میں شب و روز مصروف رہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہی میرے بیوی بچوں کو نہایت مخدوش حالات میں سری نگر سے نکلنا پڑا۔ اس وقت میری بیوی امید سے تھی اور اسے اسی حالت میں سری نگر ڈومیل روڈ کے راستے میرے آبائی شہر راولاکوٹ تک تیس ۳۰ میل کا سفر پیدل چل کر طے کرنا پڑا۔ جبکہ تمام راستہ ڈوگرہ پولیس میرے بیوی بچوں کی تلاش میں رہی لیکن وہ ڈوگرہ پولیس کے چنگل سے بچ کر بحفاظت راولاکوٹ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

جموں و کشمیر کی آزاد حکومت قائم ہو کر کام کرنے لگی تو ریاست کے تمام مسلمانوں نے خواہ وہ آزاد کشمیر میں تھے یا مقبوضہ کشمیر میں آزاد حکومت کی نہایت خندہ پیشانی سے تائید و حمایت کی۔ یہاں تک کہ ریاست کے بعض فراخدل ہندو بھی ریاست میں مسلمانوں کی آزاد حکومت کے قیام کے حامی تھے۔ آزاد حکومت کے پاس اس وقت تیس ہزار جوانوں پر مشتمل مختصر مگر مضبوط فوج موجود تھی اور اب تک کشمیر کے مسلمانوں نے ریاست کا ایک وسیع و عریض علاقہ بھی ڈوگرہ شاہی کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کروا لیا تھا۔ جہاں آزاد کشمیر حکومت کے نام سے اب کشمیری مسلمان ایک مستحکم حکومت قائم کر سکتے تھے۔

جب حکومت آزاد کشمیر وجود میں آئی تو اس کے پاس حکومت کے انتظام و انصرام کیلئے بہت کم سرمایا تھا۔ اس کے پاس نہ تو خزانہ تھا نہ بلند و بالا عمارات اور نہ حکومت چلانے کیلئے دوسرے لوازمات موجود تھے۔ البتہ ہمارے پاس ایک سرمایہ ضرور تھا اور وہ سرمایہ تھا متحد و منظم کشمیری مسلمانوں کا یہ مضبوط و ناقابل تسخیر عزم کہ ڈوگرہ شاہی اور خاص طور پہ ڈوگرہ فوج سے نجات حاصل کرنے کیلئے وہ بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔ اور کشمیری مسلمانوں کے اسی عزم و اتحاد نے ہی ہمیں اب تک ریاست کے اس قدر وسیع و عریض علاقے کو ڈوگرہ تسلّط سے آزاد کروانے میں کامیابی سے ہم کنار ہونے کا موقع دیا تھا۔ ہماری ان کامیابیوں کے اثرات بین الاقوامی سطح پہ بھی نمودار ہونے لگے تھے اور کشمیری مجاہدین کی جنگِ آزادی کی داستانیں دنیا کے گوشے گوشے تک پھیل گئی تھیں۔

کشمیری مجاہدین کی جنگِ آزادی کے دوران ریاست کے دور دراز علاقوں میں واقع اور مغربی دنیا سے دور افتادہ ریاستی مقامات بلندری، تراڑ کھیل، حکوٹی، چناری اور اسی قسم کے دوسرے شہروں کے نام دنیا بھر کے اخبارات کی سرخیوں میں نظر آنے لگے اور ان پسماندہ قصبات نے بھی ریاستِ جموں و کشمیر کی تاریخ میں رفتہ رفتہ اپنی شب و روز جدوجہد کی بدولت ایک اہم مقام حاصل کر لیا اور وہ ریاستی شہر جن کا کبھی کوئی نام بھی نہ جانتا تھا، ریاست کے مستقبل کی تاریخ میں اہم کردار سرانجام دینے لگے تھے۔ کشمیری مجاہدینِ آزادی کی عظیم قربانیوں اور شجاعت کی ناقابل فراموش داستانیں ان گمنام شہروں سے وابستہ ہوکر منظرِ عام پر آنے لگیں جو اب تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل تھے کیونکہ ریاست کے ان شہروں اور تین چار سو میل لمبے سرحدی علاقوں میں موت وحیات

کا ایک ہیبت ناک کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اور وادیٔ کشمیر کے وہ مقامات کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے جو اپنے دامن میں افغانستان اور فلسطین کے نامعلوم علاقوں سے آنیوالے گمنام مجاہدین کی شجاعت دجواں مردی اور ایثار کی لاثانی داستانیں لئے ہوئے ہیں۔ اور کشمیری مسلمانوں کے دلوں سے ان مقامات کی یاد کبھی محو نہیں ہو سکتی جہاں کشمیر کے ان کم عمر مجاہدین نے اپنی جانیں اس نصب العین کے حصول کی خاطر قربان کر دیں۔ جو نہ صرف کشمیری مجاہدین اور پاکستانی عوام بلکہ تمام دنیا کے اسلام اور کل آزادی پسند اقوام کیلئے مشعلِ راہ ہیں۔

جموں و کشمیر کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان ہوتے ہی یہ خبر دنیا کے کونے کونے میں آگ کی طرح پھیل گئی اور امریکہ و برطانیہ کے اخبارات میں ریاست جموں و کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کے مقابلے میں کشمیری مسلمانوں کی آزاد و خود مختار حکومت کے قیام کی خبریں شہ سرخیوں میں شائع ہونے لگیں۔ عام حالات میں شاید کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف ریاست میں ایک آزاد جمہوری حکومت کے قیام کی خبر کو اس قدر مشتہر نہ کیا جاتا لیکن بر صغیر کے حالات اس وقت جس نازک سیاسی دور سے گزر رہے تھے اس نے آزاد حکومت کے قیام کی خبر کو نہایت اہم بنا دیا تھا۔ نیز پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کے باعث آزاد حکومت کے قیام کی خبریں پاکستان اور دوسرے ملکوں میں اور بھی زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کر گئیں حالانکہ آج تک حکومت پاکستان آزاد حکومت جموں و کشمیر کا عملی طور پر وجود تسلیم کرنے کے باوجود جموں و کشمیر میں ایک بالکل علیحدہ اور ہر شعبہ میں خود مختار حکومت کے قیام کی اجازت نہیں دے سکی تاہم پاکستانی عوام نے آزادیٔ کشمیر کی تحریک کا پورا پورا ساتھ دیا اور کشمیری مسلمانوں

کے ساتھ ہر ممکن تعاون کیا۔

آزاد حکومتِ جموں و کشمیر کو اپنے ابتدائی ایام میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے چند ایک کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اور یہ ایک بڑی تلخ حقیقت ہے کہ کشمیر کے مسلمان راہنماؤں کو تحریک آزادیٔ کشمیر کامیاب بنانے اور کشمیر میں آزاد حکومت قائم کرنے میں ہمیشہ بے پناہ اور ناقابلِ برداشت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ سب سے بڑی دقت تو یہی تھی کہ ہمارے پاس ابھی تک کوئی مرکزی دارالحکومت بھی نہ تھا۔ جہاں ذرائع مواصلات اور دوسری انتظامی سہولتیں بخوبی میسر ہوں۔ پہلے پہل ضلع پونچھ کے سرے پر واقع ایک چھوٹے سے شہر پلندری کو آزاد کشمیر کا صدر مقام بنایا گیا۔ کیونکہ آزاد فوج نے سب سے پہلے پلندری کو ہی ڈوگرہ شاہی سے آزاد کروایا تھا۔ علاوہ ازیں یہ شہر پاکستان کی سرحد سے بالکل نزدیک بھی تھا اور ایک کچی سڑک دریائے جہلم پر بنے ہوئے ایک پل کے ذریعے اسے پاکستان سے ملاتی تھی۔ لہٰذا ان حالات میں یہ سرحدی شہر آزاد حکومت کا صدر مقام بنانے کیلئے سب سے زیادہ مناسب سمجھا گیا۔ چنانچہ ہم نے نومبر اور دسمبر ۴۷ء کے دوران اس مقام پر چند محکموں کے عارضی دفاتر بھی قائم کر لئے تھے اور وہ اس طرح کہ ہم نے شہر سے باہر ایک گھنے جنگل میں چند خیمے نصب کر لئے اور ہر خیمے میں ایک محکمے کا دفتر بنا لیا جو اپنے متعلقہ وزیروں کی نگرانی میں کام کرنے لگا۔ یہ جنگل ہمیں بھارتی فضائیہ کے بمبار طیاروں کے حملوں سے بھی محفوظ رکھنے کیلئے ایک بڑی عمدہ پناہ گاہ ثابت ہوا۔ شروع شروع میں اگرچہ اس بات کا تصور کرنا بھی مشکل تھا کہ ایک ایسی حکومت اپنے پاؤں پر کس طرح کھڑی ہو سکتی ہے۔ جس کا باہر کی مہذب

اور ترقی یافتہ دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مگر ہمیں یہاں کام کرتے ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ ہی گذرا تھا کہ دشمن کی شدید بمباری کے باعث ہمیں آزاد حکومت کا دارالحکومت پلندری سے ترارکھیل کے مقام پر تبدیل کرنا پڑا۔

ہمارے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ بھی تھی کہ ہمارے پاس اس وقت تک کوئی بھی ایسا تجربہ کار اور سلجھا ہوا شخص نہ تھا جو ایک بالکل نئی حکومت کے قیام کے بعد اسے چلانے کیلئے انتظامی امور کا بھی ماہر ہو اور ہماری کابینہ میں بھی میرے سمیت کوئی ایسا آزمودہ کار شخص نہ تھا جو اس نئی حکومت کو چلانے کے طریق کار اور اسے استحکام بخشنے والے انتظامی امور کا تجربہ رکھتا ہو اور نہ ہی ایسے تجربہ کار افسر اور سیکرٹری حضرات ہمارے درمیان موجود تھے جو ہمیں ایک مستحکم حکومت کے قیام کیلئے منصوبہ بندی کرنے کیلئے ضروری امداد دے سکیں۔ یہاں تک کہ ہمیں دفتری کام کرنے کیلئے کلرک تک بھی نہیں مل رہے تھے اور اس کام کیلئے اگر کچھ لوگ ملتے بھی تھے تو وہ ان علاقوں میں کام کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ جہاں دشمن کے حملوں کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہو۔ آخر کار بڑی دقتوں کے بعد ہمیں چند مخلص کلرک اور افسر مل گئے۔ جنہوں نے ہمارے ساتھ کام کرکے ہمارا ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا مگر ان میں سے بھی زیادہ تر جموں کے باشندے تھے جنہیں ڈوگرہ حکومت نے وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے انہیں فوراً سیالکوٹ سے آزاد کشمیر بلا لیا۔ اور ان لوگوں نے حکومت آزاد کشمیر کے کام کو چلانے اور آگے بڑھانے میں فی الواقعہ جس قدر محنت و جانفشانی سے کام کیا اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کیونکہ ان افراد نے حکومت آزاد کشمیر کیلئے ان کڑے حالات میں کام کرکے ہماری بے لوث اور عملی امداد و اعانت کی جبکہ ہمارے پاس ان کی رہائش کا بھی کوئی

ٹھکانہ تھا نہ ان کیلئے اشیائے خور و نوش کا کوئی معقول انتظام تھا۔ اور ہمارے پاس اس وقت تک ریاست کے آزاد علاقے میں نقل و حرکت کے ذرائع کا بھی کوئی بندوبست نہ تھا کہ یہ لوگ کبھی کبھار پاکستان میں آکر اپنے اہل و عیال کی خبرگیری ہی کر سکیں۔

ایک مرتبہ آزاد کشمیر کی یہ نوزائیدہ حکومت کے جملہ ارکان پلندری میں دشمن کی بمباری کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئے۔ کیونکہ ہم پلندری میں ایک جلسۂ عام کر رہے تھے۔ جس میں شہر کے تقریباً پانچسو افراد شامل تھے۔ جلسہ گاہ میں آزاد کشمیر حکومت کے تقریباً تمام وزیر اور سارے ذمہ دار افسر بھی موجود تھے۔ شام کے وقت تقریباً پانچ بجے کا عمل تھا اور چونکہ دسمبر کا مہینہ تھا اس لئے چاروں طرف تاریکی پھیل چکی تھی ایسے وقت میں وہاں دشمن کے جہازوں کے آنے کا ہمیں خواب و خیال بھی نہ تھا اور ہم کشمیری مجاہدین کو ضروری ہدایات دینے میں مصروف تھے کہ اچانک پہاڑ[1] کی طرف سے دشمن کا ایک طیارہ اڑتا ہوا آگیا جو شاید اوڑی کے محاذ پر بمباری کر کے واپس جموں کی طرف اپنے اڈے پر جا رہا تھا۔ اور اس نے ہمارے مجمع کو دیکھ کر ہمارے سروں پر نیچی پروازیں شروع کر دیں۔ ایسی ناگہانی صورت میں ہمارے لئے کوئی جائے مفر نہ تھی۔ لیکن ہماری خوش قسمتی کہ دشمن کے طیارے میں اس وقت کوئی بم موجود نہ تھا۔ لہٰذا اس نے ہمارے سروں پر نیچی پروازیں کر کے چکر لگا کر ہمیں خوفزدہ کرنا شروع کر دیا اور اس وقت سامعین میں سے کم از کم بیس افراد کے ایک مجمع نے آکر مجھے اس طرح اپنے زیر حفاظت لے لیا کہ اگر دشمن کا یہ طیارہ بمباری کر کے بھی تو مجھے کوئی آنچ نہ آئے۔ اور اس قسم کے موقعوں پر کشمیری عوام اور کشمیری راہنماؤں کے ایک دوسرے

---

[1] پلندری ایک پہاڑ کی تلہٹی میں واقع ہے۔

پر اعتماد و خلوص کی ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مگر اِن تمام مشکلات کے باوجود ہم اپنی مسلسل جدوجہد کی بدولت چھ ماہ کے اندر اندر ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کے تمام ضروری محکمے پوری رفتار سے کام کر سکتے تھے۔ اور ہم نے اس مختصر سے عرصہ میں آزاد ریاست کی ایک علیحدہ پولیس اور عدالت بھی قائم کر لی۔ جو آزاد علاقے میں امن داماں برقرار رکھنے کی خدمات سر انجام دینے لگیں پھر جلد ہی ہم نے ایک فوجداری عدالت بھی قائم کر لی جو آزاد علاقوں کے فوجداری مقدمات کے فیصلے کرنے کے علاوہ ہمیں دفاعی امور میں بھی امداد و اعانت فراہم کرتی تھی اور اس طرح ہم چھ ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی اپنے آزاد علاقے میں بغیر کسی دشواری کے مالیہ اور کسٹم وصول کرنے کے انتظامات مکمل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

آزاد علاقے کے عوام نے ریاست کے اس عظیم انقلاب میں جو کردار انجام دیا وہ بھی ہمارے لئے ایک حیران کن تجربہ تھا۔ ۴۷ء میں جب کہ ریاست میں اچانک ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ نہ ریاست میں کوئی قانون رہا تھا اور نہ عوام کی حفاظت کیلئے پولیس موجود تھی اور ریاست کے آزاد علاقے میں عوام کے باہمی تنازعات کا فیصلہ کرنے کیلئے عدالتیں بھی موجود نہ رہی تھیں۔ غرضکہ کوئی بھی ایسا قابلِ ذکر انتظامی ادارہ موجود نہ تھا جو آزاد علاقے میں ڈوگرہ حکومت کے انتظامی ادارہ کی جگہ لے سکتا۔ لیکن اس موقع پر کشمیری عوام نے بڑی خوش اسلوبی اور دانشمندی سے ان کا مقابلہ کیا اور ہر گاؤں میں کچھ معمر و تجربہ کار افراد پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی قائم کر دی جس نے مندرجہ ذیل ذمہ داریاں بخوبی سنبھال لیں:۔

(ا) انسدادِ جرائم ......

(ب) باہمی تنازعات کا تصفیہ

(ج) اپنے اپنے علاقوں میں اشیائے خوردنی جمع کر کے مختلف جنگی محاذوں پر مصروفِ جنگ آزاد فوج کو مہیا کرنا۔

(د) مختلف جنگی محاذوں پر اسلحہ و بارود کی ترسیل۔

(ہ) فوج کیلئے نئے جوانوں کی بھرتی اور انہیں تربیت کیلئے مختلف فوجی مراکز تک پہنچانا۔

(س) آزاد علاقے میں مقیم غیر مسلم باشندوں کی دیکھ بھال۔

(ص) آزاد علاقے میں غیر مسلم کشمیری باشندوں کی متروکہ املاک کا تحفظ۔

آزاد علاقے میں کوئی مرکزی پنچایت نہیں تھی جو تمام پنچایتوں کی کارکردگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا فرض انجام دے سکتی۔ لہٰذا اس مسئلے کو اس طرح حل کیا گیا کہ ہر گاؤں کی پنچایت اپنے ہمسایہ گاؤں کی پنچایت سے تمام ضروری معاملات میں تعاون کرتی اور اس طرح تمام پنچایتوں کی کارکردگی کے درمیان ایک مؤثر رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ اگرچہ ہر پنچایت کا فیصلہ آخری حیثیت رکھتا تھا اور اس پر نظرِ ثانی کا مطالبہ بہت کم کیا جاتا تھا۔

اس کے برعکس حکومتِ پاکستان ہمیشہ ایک مختلف نقطۂ نظر پیش کرتی رہی اور اقوامِ متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان پر تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور آزاد کشمیر حکومت کی سیاسی اہمیت واضح کرتی رہی ہے۔ اور کمیشن کے نام ایک یادداشت کے پہلے پیراگراف میں حکومتِ پاکستان نے کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا ہے کہ کمیشن پر یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو جنگ بندی کی ہدایت

صرف حکومتِ آزاد کشمیر ہی دے سکتی ہے۔ تاہم حکومتِ پاکستان یہ جاننے کی خواہش ضرور رکھتی ہے کہ کمیشن اس سلسلے میں حکومت آزاد کشمیر سے کئے گئے معاہدے کو قائم رکھنے کیلئے کیا اقدام کر رہی ہے یا کیا قدم اٹھانے کی تجاویز پیش کرتی ہے۔ اسی یادداشت کے پیراگراف نمبر ۸ میں کہا گیا ہے کہ کمیشن کی مذکورہ قرارداد کے پیراگراف ع ۳۔ الف میں کمیشن نے تجویز پیش کی ہے کہ آزاد کشمیر کے زیر انتظام علاقے کے متعلق کوئی قطعی اور آخری فیصلے سے پیشتر اس علاقے کا نظم و نسق آزاد حکومت ہی کمیشن کی نگرانی میں کرتی رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمیشن کو اس بات کا بھی پورا احساس ہے کہ آزاد کشمیر کے علاقے میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں جو حکومتِ آزاد کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔

حکومتِ آزاد کشمیر کا وجود بھارتی حکومت اور اقوام متحدہ کمیشن برائے ہند و پاکستان کے درمیان کشمکش پیدا ہو کر ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا حکومتِ پاکستان اور کمیشن اس بات پر مصر تھے کہ حکومتِ آزاد کشمیر کی قانونی حیثیت ضرور تسلیم کر لی جائے اگرچہ بھارتی حکومت اسے اس قابل نہیں سمجھتی کہ سفارتی سطح پر تسلیم کرے یعنی حکومتِ ہندوستان حکومتِ آزاد کشمیر کا وجود کسی حیثیت سے بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ جس کا ثبوت پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم ہندوستان کے مذکورہ مراسلہ سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ کمیشن نے اس تنازعہ سے اس طرح گلو خلاصی کرائی کہ اس نے حکومتِ آزاد کشمیر کی جگہ مقامی حکام کا لفظ استعمال کرتے ہوئے قرارداد کے ایک جملے کو اس طرح تبدیل کر دیا کہ مقامی حکام اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں متعلقہ علاقے کا انتظام سنبھالے رکھیں۔

کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۴۸ء کے سلسلے میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ اور کمیشن کے چیئرمین کے مابین جن مراسلوں کا تبادلہ کیا گیا ان میں سے ایک مراسلے مورخہ ۱۶ ستمبر ۴۸ء میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ نے کمیشن کے چیئرمین سے کہا "حکومت پاکستان یہ بات پہلے ہی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس سلسلے میں جن خیالات و نظریات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ وہ حکومتِ پاکستان کے اپنے خیالات میں اور وہ حکومتِ آزاد کشمیر پر کسی طرح سے بھی لاگو نہیں کئے جا سکتے اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حکومتِ آزاد کشمیر کے نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ حکومت پاکستان یہ سمجھتی ہے کہ کمیشن آزاد کشمیر کے نمائندوں سے انفرادی طور پر بات چیت کرنا چاہتا ہے اور حکومت پاکستان کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آزاد کشمیر کے نمائندے کمیشن کو اس کی تجاویز کے متعلق اپنی حکومت کے نقطہ نگاہ سے آگاہ کریں گے حکومت پاکستان اس بات کیلئے ہمیشہ کوشاں رہے گی کہ حکومتِ آزاد کشمیر کو کمیشن کی وہ تجاویز منظور کرنے پر آمادہ کرے۔ جنہیں حکومت پاکستان خود بھی قابل قبول سمجھتی ہو گی۔ لیکن کمیشن کی تجاویز کو قطعی طور پر منظور کرنے کی مجاز صرف حکومت آزاد کشمیر ہی ہو سکتی ہے۔ اور جیسا کہ کمیشن پر پہلے بھی یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ آزاد کشمیر فوج پر صرف حکومت آزاد کشمیر کا ہی حکم چل سکتا ہے اور وہی اس بات کا بھی حق رکھتی ہے کہ آزاد فوج کو جنگ بند کرنے کی ہدایت کرے اور عارضی معاہدۂ صلح کی وہ شرائط مرتب کرے جن پر کاربند ہونا آزاد کشمیر فوج کیلئے لازمی ہو"

اسی مراسلے میں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے کہ تحریک آزاد کشمیر شروع کرنے اور چلانے کی تمام تر ذمہ داری خود آزاد کشمیر کے باشندوں پر

عائد ہوتی ہے۔ جس کی نمائندگی اب حکومتِ آزاد کشمیر کر رہی ہے اور یہ حکومتِ آزاد کشمیر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے سلسلے میں ایک اہم فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ جنوری ۴۸ء میں جب حکومتِ آزاد کشمیر نے باقاعدہ کام شروع کیا تو ان پنچائیتوں نے آزاد حکومت سے پورا پورا تعاون کیا، پھر ان کی مدد سے آزاد علاقے میں عدالتیں اور پولیس چوکیاں بھی قائم کر دی گئیں۔ اور حکومت نے مالیئے کے واجبات کی وصولی کا کام بھی شروع کر دیا۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ ۱۹۴۷-۴۸ء اور ۴۹ء کے دوران آزاد علاقے میں ڈاکہ زنی اور قتل کی وارداتیں شاذ و نادر ہی ہوئی ہوں گی۔ اور معمولی نوعیت کے جرائم کا تو نام و نشان تک بھی نہ تھا۔ کشمیری عوام کا یہی وہ مخلصانہ تعاون تھا جس نے ہمیں آزاد علاقے میں ایک مضبوط و مستحکم حکومت قائم کر کے تمام دنیا میں اس کا وقار بلند کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔

حکومتِ آزاد جموں و کشمیر کے قیام میں ہمیں پاکستانی عوام کا تعاون بھی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حاصل ہوا تھا۔ اور انہوں نے آزاد حکومت کے لئے دل کھول کر مالی امداد فراہم کی تھی اور اپنی تمام تر ہمدردیاں تحریک آزادیٔ کشمیر سے وابستہ کرتے ہوئے اسے کامیاب و کامران بنانے کیلئے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسی انجمنیں قائم کر دی تھیں جو پاکستان کے اندر اور باہر کے ممالک میں بھی آزاد حکومت کا بھرپور پراپیگنڈہ کرتی تھیں۔ نیز ان انجمنوں نے آزاد حکومت کیلئے کثیر رقوم جمع کیں اور آزاد فوج کے لئے رضاکاروں کی مدد بھی دی اور کشمیری راہنما پشاور سے کراچی تک جہاں کہیں بھی اس

مقصد کیلئے گئے وہاں اُن کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح اس تحریک نے کشمیری مسلمانوں کو ایک متحدہ محاذ پر جمع کر دیا تھا اسی طرح پاکستانی عوام کو بھی ایک ہی مرکز پر لا کھڑا کیا تھا۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے اپنی قرار داد مورخہ ۱۳ اگست ۴۸ء کے حصہ دوم کی شق نمبر ۳۔ الف میں عارضی معاہدۂ صلح کے ضمن میں آزاد حکومت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :۔

"تنازعہ کشمیر کے آخری فیصلہ سے قبل متعلقہ علاقے سے پاکستانی افواج کے انخلاء کے بعد اس علاقے کا نظم و نسق "مقامی حکام" کمیشن کی نگرانی میں سنبھالیں گے۔"

بھارتی حکومت آزاد کشمیر حکومت کے نام پر بھی ہمیشہ اپنی برہمی اور تنگ مزاجی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ چنانچہ بھارت کے آنجہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو، کمیشن کے سربراہ موسیو جوزف کوربل کے نام اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۲۰ اگست ۴۸ء کے تیسرے پیراگراف کے ذیلی پیراگراف (۱) میں لکھتے ہیں "قرار داد (مورخہ ۱۳ اگست ۴۸ء) کے حصہ دوم کے ذیلی حصہ ۳۔ الف پر عمل درآمد یا اسکی ترجمانی کی کوشش نہ کی جائے تاکہ :۔

(۱) ریاست جموں و کشمیر کے اس علاقے کی خود مختاری کا سوال، جہاں سے پاکستانی افواج کا انخلاء عمل میں لایا جائے، نہ اُٹھایا جا سکے۔

(ب) آزاد کشمیر کی نام نہاد حکومت کو تسلیم کرنے کا موقع فراہم نہ ہو سکے یا

(ج) اس علاقے کو عارضی معاہدۂ صلح کے دوران اس طرح مجتمع ہونے کا موقع فراہم نہ کیا جائے کہ یہ ریاستی حکومت کیلئے نقصان کا باعث بنے۔

ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی نقطہ قابل قبول ہے۔ جسے خود کمیشن کی تجاویز میں بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ اور یہی نقطۂ نظر کمیشن اور آزاد کشمیر کے مقامی حکام کے درمیان تعاون کے سلسلے میں ایک موضوعہ و متعلقہ لائحہ عمل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

وزیر خارجہ پاکستان کے اس مراسلہ سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حکومتِ پاکستان، حکومت آزاد کشمیر کی قانونی حیثیت کو تقریباً تسلیم کر چکی ہے اور ریاستِ جموں و کشمیر میں صرف حکومت آزاد کشمیر ہی جنگ بندی پر عملدرآمد کرنے اور عارضی معاہدۂ صلح پر دستخط کرنے کی مجاز ہے۔ لہٰذا وہی اس سلسلے میں جنگ بندی کے احکام جاری کر کے عارضی معاہدۂ صلح پر دستخط بھی کرے گی اس مراسلہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ آزاد کشمیر فوج کو احکام صادر کرنے کی مختار صرف حکومت آزاد کشمیر ہی ہے

مگر جہاں تک کمیشن کی طرف سے آزاد کشمیر حکومت کی قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے کا سوال ہے، کمیشن حکومت آزاد کشمیر کی قانونی حیثیت کو بے کم و کاست تسلیم کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن اس کے سامنے اس کے لئے کوئی عملی راستہ نہ تھا اپنے اس نقطۂ نظر کا اظہار مسٹر "کوربل" نے ۲ ستمبر ۴۸ء کو حکومتِ پاکستان کے نمائندوں سے بات چیت کے دوران ان الفاظ میں کیا تھا "مقامی حکام" سے ہمارا مطلب آزاد کشمیر کے عوام ہیں، اگرچہ ہم آزاد کشمیر حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتے"

مگر حکومت آزاد کشمیر کی قانونی حیثیت کے متعلق مسٹر "کوربل" نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ جہاں تک کمیشن کی نگرانی کا تعلق ہے۔ مقامی حکام کو آزاد کشمیر میں مکمل طور پر سیاسی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوں گے اور یہ

حکام اس علاقے میں امن وامان کو برقرار رکھنے کے ذمہ دار ہوں گے اور نہ تو بھارتی حکومت کو اور نہ ہی ریاستی حکومت کو یہ اجازت دی جائیگی کہ وہ اپنا کوئی فوجی یا سرکاری افسر اس علاقے میں بھیجے۔

حکومت آزاد کشمیر کی نگرانی کے متعلق مسٹر کوربل نے پاکستانی نمائندوں سے اپنی ۲ ستمبر ۴۸ء کی ملاقات کے دوران اس طرح وضاحت کی تھی "جہاں تک نگرانی کی اصطلاح کا تعلق ہے ہم نے یہ اصطلاح اس سے کوئی بہتر لفظ نہ ملنے کی بنا پر استعمال کی ہے۔ جس کا یہ مطلب نہیں نکالا جا سکتا کہ ہم حکومت آزاد کشمیر کے محافظ بن کر اس کے ہر شعبے کی نگرانی کریں گے۔ بلکہ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آزاد کشمیر کے علاقے میں ایسے غیر جانبدار مبصر متعین کر دیئے جائیں جو اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ مقامی حکام معاہدۂ جنگ بندی پر عمل پیرا ہیں اور اگر حکومت آزاد کشمیر جنگ بندی کی خلاف ورزی کرے تو یہ مبصر کمیشن کو مطلع کریں تاکہ اسے روکا جا سکے۔ مگر اس نگرانی سے کمیشن کا مقصد حکومت آزاد کشمیر کے انتظامی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں ہے۔"

اسی ملاقات کے دوران حکومت پاکستان کے نمائندہ کی طرف سے زور دینے پر مسٹر کوربل نے کہا کہ ہم نے حکومت آزاد کشمیر کے نقطۂ نظر سے مطابقت پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور حکومت آزاد کشمیر کی قانونی حیثیت تسلیم کرنے کے مسئلے پر بھی غور کیا ہے۔ لیکن ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ سرینگر میں ریاست جموں وکشمیر کی ایک قانونی حکومت موجود ہے اور ہم اس کی خود مختاری تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

کمیشن کے چیئرمین مسٹر جے۔ کے۔ ہڈل نے ۱۹ ستمبر ۴۸ء کو پاکستان کے وزیر خارجہ کے نام اپنے ایک مراسلے میں اس بات کا یوں اعتراف کیا ہے

"حکومت آزاد کشمیر کی قانونی حیثیت کے متعلق دوسرے اور تیسرے نکات میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ کمیشن نے تحریک آزاد کشمیر کو کبھی نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ / اگست ۴۸ء کے حصہ دوم کی مشق ۳ الف میں درج ہے"

کمیشن نے حکومتِ آزاد کشمیر کے مسائل کا جائزہ لینے کے لئے ایک سب کمیٹی قائم کی جس کے ارکان نے آزاد کشمیر کے علاقوں کا دورہ کر کے وہاں کے سماجی مسائل اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا۔ اس کمیٹی نے آزاد کشمیر میں اپنے ایک ہفتہ تک قیام کے دوران راقم الحروف سے جو ان دنوں آزاد کشمیر کا صدر تھا اور مختلف محکموں کے سربراہوں سے بھی ملاقات کی اور حکومت کو درپیش مختلف مسائل کے متعلق اپنی رپورٹ مرتب کر کے کمیشن کو پیش کر دی، لیکن یہ رپورٹ کبھی منظر عام پر نہ لائی گئی تاہم جب میں ۵۰ء میں واشنگٹن گیا تو اس کمیشن کے چیئرمین نے مجھے بتایا کہ رپورٹ میں حکومتِ آزاد کشمیر کی کارکردگی پر مکمل اطمینان کا اظہار کیا گیا تھا۔

جہاں تک حکومتِ آزاد کشمیر کے وجود کو عملی طور پر تسلیم کرنے کے قانونی پہلو کا تعلق ہے، اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہند و پاکستان بھی حکومت آزاد کشمیر کو بالواسطہ انداز میں عملی طور پر تسلیم کر چکا تھا اور حکومتِ پاکستان نے بھی اگرچہ سرکاری طور پر حکومت آزاد کشمیر کو ابھی تسلیم نہ کیا تھا تاہم باقی ہر طرح سے قانونی و عملی طور پر حکومت آزاد کشمیر کو ریاست کے آزاد علاقوں کی نمائندہ حیثیت سے تسلیم کرتی تھی۔ تحریک آزاد کشمیر کے شروع میں، ایک مرتبہ میں نے حکومت پاکستان کے سامنے نہایت سنجیدگی سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومتِ آزاد کشمیر کو سرکاری طور پر بھی باقاعدہ ریاست جموں و کشمیر کی قانونی و آئینی حکومت

کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے - اور میں نے اس معاملے میں حکومتِ پاکستان کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ حکومتِ آزاد کشمیر ریاست جموّں وکشمیر کی قانونی و آئینی حکومت ہونے کی حیثیّت سے ریاست کا پاکستان سے الحاق کر دے اور حکومتِ پاکستان ریاست کے الحاق کی درخواست قبول کرنے کے بعد اپنا آئینی حق استعمال کرتے ہوئے ریاست میں اپنی فوجیں بھیج کر سری نگر اور جموّں سے ڈوگرہ راج کو ختم کر دے - اگر میری یہ تجویز منظور کر لی جاتی تو وادیٔ جموّں وکشمیر کا یہ قضیّہ بہت جلد ختم ہو سکتا تھا - اور جیسا کہ بعض دوستوں کا خیال ہے اگر میری اس تجویز پر عمل درآمد کیا جاتا تو شاید کشمیر میں جنگِ آزادی شروع کرنے کی بھی ضرورت نہ پیش آتی - کیونکہ جوناگڑھ اور حیدرآباد کے واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ میری یہ تجویز بالکل درست اور قابلِ عمل تھی مگر اب یہ بات موجودہ حالات میں نہیں کہی جا سکتی کہ اگر اس تجویز پر از سرِ نو غور کیا جائے تو یہ کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے -

حکومتِ آزاد کشمیر کی قانونی و آئینی حیثیّت کا مسئلہ اب تک بھی ایک بحث طلب مسئلہ بنا ہوا ہے - حالانکہ حکومتِ آزاد کشمیر کو اس وقت جو آئینی حیثیّت حاصل ہے - وہ سب پر واضح ہو چکی ہے - اور میں حکومت پاکستان پر ہمیشہ زور دیتا رہا ہوں کہ حکومت آزاد کشمیر کو ریاست جموّں وکشمیر کی واحد نمائندہ حیثیّت سے تسلیم کیا جائے - مگر میری اس تجویز کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ ریاست جموّں وکشمیر کی الگ تھلگ خود مختاری کو تسلیم کیا جائے ۱۹۴۷ء کے بعد آج تک آزاد کشمیر کے کسی صدر یا ریاست کے کسی حکومتی نمائندے نے حکومتِ پاکستان کے سامنے اس قسم کی تجویز پیش نہیں کی کہ حکومت آزاد کشمیر کو آزاد و خود مختار قرار دیا جائے اور اس سلسلے میں سب سے بڑی وجہ

یہ بھی ہے کہ جغرافیائی و اقتصادی لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر پاکستان سے علیحدہ رہ کر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست کا رقبہ اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اسے ایک آزاد و خود مختار ریاست قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر مالی و اقتصادی لحاظ سے یہ ریاست اس قابل ہرگز نہیں ہے کہ اپنی آزاد و خود مختار حیثیت قائم رکھ سکے۔ اگرچہ بعض سیاسی حلقوں نے یہ تجویز پیش کرنی شروع کر دی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں ایک آزاد و خود مختار حکومت قائم کر دی جائے جس کا تعلق پاکستان یا بھارت کسی سے بھی نہ ہو۔ لیکن یہ تجویز مسئلہ کشمیر کے اور زیادہ پیچیدہ ہو جانے کی وجہ سے ایک متبادل تجویز سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس مسئلے پر زیادہ تفصیل کے ساتھ اگلے صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔

حکومتِ پاکستان نے ۱۹۴۹ء سے اپنا ایک محکمہ وزارت امور کشمیر کے نام سے قائم کر رکھا ہے جو حکومتِ آزاد کشمیر اور حکومتِ پاکستان کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے لئے کام کرتا ہے اور اسی محکمے کے ذریعے اقوام متحدہ کی ہدایات آزاد کشمیر فوج تک پہنچائی جاتی ہیں۔

جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو حکومتِ آزاد کشمیر کے قیام کے وقت سے ہی آزاد کشمیر میں ایک حکمران سیاسی جماعت کی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ ریاست کے آزاد علاقے میں ایسے حالات موجود نہیں تھے کہ یہاں نمائندہ قومی اسمبلی یا قانون ساز اسمبلی قائم کی جاتی۔ اس لئے مسلم کانفرنس کو ہی اسمبلی کا درجہ بھی دے دیا گیا ہے۔ لیکن یہ صورت حال تسلی بخش نہیں تھی اور اس کی وجہ سے بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل مسائل آج بھی حل طلب ہیں:۔

(ا)۔۔ریاست کے سربراہ کا تقرر یا نامزدگی کرنے کا اختیار کسے حاصل ہو؟
(ب) حکمران سیاسی جماعت کو سربراہِ مملکت اور حکومت پر انتظامی و سیاسی امور میں کس حد تک برتری حاصل ہو؟
(ج) حکومت کس تنظیمی ادارے یا جماعت کے سامنے جواب دہ ہو؟

یہ سوالات بڑے بحث طلب ہیں اور انہیں مسائل پر اختلافات کے باعث آزاد کشمیر کے اکثر سیاسی راہنماؤں کے درمیان مخاصمت پیدا ہو گئی ہے۔ اور ان بنیادی اختلافات کی بنا پر ہی تحریک آزادئ کشمیر کو بھی ماضی میں بہت نقصان پہنچا ہے۔

حکومتِ آزاد کشمیر کی دستوری حیثیت میں بنیادی تبدیلی لائی جا چکی ہے اور صرف مسلم کانفرنس کو ریاست کی واحد سیاسی جماعت قرار دیا گیا ہے۔ جو آزاد کشمیر اور پاکستان میں کشمیری عوام کی نمائندہ سیاسی جماعت کا حق رکھتی ہے! ور صدرِ ریاست کا انتخاب بھی پاکستان کی طرح وہ انتخابی ادارہ کرتا ہے جس کا انتخاب بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عمل میں لایا جاتا ہے اور ان انتخابات میں رائے دہی کا حق صرف آزاد کشمیر میں رہنے والے کشمیری عوام کو ہی حاصل ہے۔ اس نئے انتخابی طریقہ کو بنیادی جمہوریتوں کے نظام کا نام دیا جاتا ہے جسے آزاد کشمیر میں رائج ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے ہیں اور اس نظامِ بنیادی جمہوریت کے تحت مختلف علاقوں میں بنیادی یونین کونسلیں قائم کی جاتی ہیں جنہیں کچھ انتظامی اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اور یہ نیا طریقِ حکومت وہی ہے جو تقریباً چھ سال قبل پاکستان میں رائج کیا گیا تھا۔ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے علاوہ کشمیری عوام کی اور بھی سیاسی جماعتیں ہیں جو آزاد کشمیر اور پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ پاکستان میں یہ جماعتیں کشمیری مہاجرین نے قائم کی ہیں جو آزاد کشمیر کے صدارتی انتخاب میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ حال ہی میں آزاد کشمیر کے صدارتی انتخاب کے طریقِ کار میں تبدیلی عمل میں لائی

گئی ہے ۔ مگر ان تبدیلیوں کو تنزل پذیر تبدیلیاں کہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا جن کے مطابق صدر آزاد کشمیر کا انتخاب اب بنیادی جمہوریتوں کا انتخابی ادارہ نہیں کرتا اور پاکستان میں رہنے والے کشمیری مہاجرین بھی اب اس انتخاب میں اپنی رائے نہیں دے سکتے ۔ اگرچہ اس طرح پاکستان میں رہنے والے کشمیری باشندے اپنے ایک بنیادی حق سے محروم ہو گئے ہیں ۔ مگر مجھے یقین ہے وہ دور بھی ضرور آئے گا جبکہ ریاست کے آئین پر نظر ثانی کی جائے گی اور کشمیری عوام کو بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہی دوبارہ اپنی حکومت منتخب کرنے کا حق حاصل ہوگا ۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے عوام ۱۹۳۰ء سے اپنے سیاسی اور بنیادی حقوق حاصل کرنے کیلئے ایک طویل جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ اور کشمیری عوام کے سیاسی حقوق میں یہ حق ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے کہ انہیں ریاست میں اپنی پسند کے مطابق مکمل طور پر جمہوری اور ایک نمائندہ حکومت کے انتخاب کا حق دیا جائے لہذا یہ ایک نہایت افسوسناک بات ہوگی اگر حکومت پاکستان جموں و کشمیر کے عوام کا یہ بنیادی حق بھی غصب کئے رکھے گی ۔

(۱۰)

ہماری مشکلات جو ناکامی کا موجب بنیں

گزشتہ ابواب میں ان مشکلات اور دقتوں کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے جو ہمیں تحریک آزادی کے آغاز میں پیش آئیں۔ ہمارے سامنے اسوقت سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں کہیں سے اب تک کافی مقدار میں ہتھیار دستیاب نہ ہو سکے تھے۔ البتہ ہم نے کچھ رائفلیں ضرور حاصل کر لی تھیں۔ مگر یہ بھی ہماری ضرورت کے لئے بہت ناکافی تھیں اور ان کے لئے کارتوس حاصل کرنا تو ایک مسئلہ لاینحل بنا ہؤا تھا۔ حکومتِ پاکستان سے سرکاری سطح پر اسلحہ و بارود حاصل کرنے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا اور ہم نے جس قدر بھی اسلحہ وغیرہ پاکستان سے فراہم کیا تھا وہ ہماری ذاتی کوششوں اور پاکستانی عوام کے نجی تعاون کی بدولت ہمیں حاصل ہؤا تھا۔ ہماری یہ دشواری اس وقت کسی حد تک دُور ہونی شروع ہوئی جب بعض جنگی محاذوں پر بھارتی اور ڈوگرہ فوج پسپا ہو کر اپنا اسلحہ چھوڑ جانے پر مجبور ہوئی اور مجاہدین نے ان کے چھوڑے ہوئے اسلحہ و بارود پر قبضہ کر کے اسے استعمال کرنا شروع کر دیا مگر پونچھ کے علاقے میں آزاد فوج کو خودکار اسلحہ کے بغیر بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ آزاد فوج کے جوان تین انچ اور ۲۶ ۱۳ انچ دھانے والی توپیں چلانا بھی نہ جانتے تھے اور بھارتی فوج ان محاذوں پر اسی قسم کے بھاری ہتھیار

استعمال کر رہی تھی۔

جنگ کے ابتدائی ایام میں نقل و حمل کے ذرائع کے بغیر بھی ہمیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر کشمیری عوام نے ہی اس مرحلے پر بھی ہمارا پورا ساتھ دیتے ہوئے دن رات کام کر کے کچی سڑکیں تعمیر کیں۔ مظفر آباد میں دشمن کی گولہ باری اور بارشوں کی وجہ سے کئی سڑکیں بالکل ناکارہ ہو گئیں۔ یہی حال پونچھ اور میرپور کے علاقوں کا بھی تھا۔ جہاں آمد و رفت کی سخت دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ مگر ان علاقوں کے عوام نے ضروری اوزاروں کے بغیر جس کے ہاتھ جو کسّی، کدال یا بیلچہ وغیرہ بھی لگا انہوں نے انہیں معمولی اوزاروں کی مدد سے علاقے کی کچّی اور تباہ شدہ سڑکیں بنانی شروع کر دیں، یہاں تک کہ آزاد علاقے کے مرکزی شہروں سے لے کر جنگی محاذوں کے علاقوں تک تیار کی گئی سڑکیں اس قابل ضرور ہو گئیں کہ خچروں کے ذریعے سامان وغیرہ لاد کر مجاہدین آزادی کو کمک پہنچائی جا سکے۔ اور اس سلسلے میں خچر ہانکنے والے کشمیری لڑکوں نے جو بر وقت خدمات سرانجام دیں وہ بھی ایک ناقابل فراموش حیثیّت رکھتی ہیں۔ ریاست کی جنگِ آزادی میں آزاد فوج اور پاکستان کی مسلّح افواج نے اس وقت جو شاندار کامیابیاں حاصل کیں وہ بھی ان خچر ہانکنے والے جفاکش لڑکوں کی رضاکارانہ خدمات کی بہت بڑی حد تک مرہونِ منت ہیں۔ آزاد کشمیر کے دشوار گزار اور خطرناک راستوں پر سڑکیں بنانے والے رضاکاروں کی خدمات بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتیں جنہوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہوئے جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر سڑکوں کی تعمیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کی جانفشانی کی یہ مثالیں ہماری آنے والی نسلوں کے لئے بھی مشعلِ راہ ثابت ہوں گی۔

ہمارے لئے سب سے مشکل بلکہ لاینحل مسئلہ اسوقت یہ تھا کہ مختلف

جنگی محاذوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی جس کے باعث ہم اپنی جنگی سرگرمیوں میں باقاعدگی اور ہم آہنگی قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ ہمارے پاس وائرلیس، ٹیلیفون یا تار وغیرہ کے انتظامات بھی موجود نہ تھے۔ اور نہ یہ ضروری انتظامات فوری طور پر اس وقت کئے جا سکتے تھے۔ مظفر آباد اور باغ کے درمیان صرف قاصدوں کے ذریعے پیغام رسانی کی جا سکتی تھی۔ بھمبر، میرپور اور دوسرے اہم جنگی محاذوں کے درمیان بھی صرف ڈاک یا تار کے ذریعے ہی پیغام رسانی کی جا سکتی تھی۔ لیکن ڈاک یا تار بھیجنے کے لئے بھی کسی کو گڑھی حبیب اللہ، ایبٹ آباد کوہالہ یا مری کے مقامات پر بھیجنا پڑتا تھا۔ ذرائع مواصلات کی عدم موجودگی نے ہماری راہ میں بے پناہ مشکلات حائل کر رکھی تھیں۔ اور یہ ضروری انتظامات جب تک ہم آزاد علاقے میں مستحکم طور پر قدم نہ جما لیتے نہیں کئے جا سکتے تھے مگر چونکہ آزاد علاقے کے حالات اس وقت بڑے غیر مستحکم تھے اس لئے وہاں یہ انتظامات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اور یہی وہ مشکلات تھیں جن کے باعث بارہ مولا سے پسپا ہونے والے قبائلیوں کی مدد کیلئے پونچھ سے آزاد فوج نہیں بھیجی جا سکتی تھی حالانکہ قبائلی عوام کی یہ پسپائی ہمارے لئے ایک بہت بڑا نقصان تھا۔ جس کی وجہ سے بھارتی فوجوں کو وہاں اپنے قدم جمانے کا دوبارہ موقع مل گیا۔

۲۳ اکتوبر کو جب قبائلیوں کا ایک لشکر مظفر آباد شہر میں داخل ہو گیا تو ڈوگرہ فوج کے مسلمان دستے جو بالاکوٹ کے مقام پر متعین تھے ان قبائلیوں کے ساتھ آن ملے چنانچہ قبائلیوں نے بغیر کسی مزاحمت کے مظفر آباد شہر پر قبضہ کر لیا جہاں صرف سکھوں کا مسلح جتھہ گوردوارے میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ انہوں نے قبائلی لشکر کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر انہیں بھی جلد ہی زیر کر لیا گیا۔ پھر دریائے جہلم اور کشن گنگا کے پلوں پر بھی ڈوگرہ فوج کے کچھ دستے متعین تھے لیکن قبائلیوں نے

شبخون مار کر ڈوگرہ فوجیوں کو راہِ فرار اختیار کرنے یا ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور مجاہدین نے ایک بھی گولی چلائے بغیر کشن گنگا کے پل پر قبضہ کر لیا۔ کوہالہ کے پل پر بھی ڈوگرہ فوج کے دستے موجود تھے مگر پونچھ کی طرف سے آزاد فوج نے ان پر حملہ کر کے انہیں بھی مار بھگایا۔

قبائیلیوں کا یہ لشکر چونکہ بالکل غیر منظم تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ انہوں نے سری نگر کی طرف بڑھتے ہوئے غیر مسلم کشمیری عوام سے کچھ زیادتیاں بھی کی ہوں۔ یہ قبائلی لشکر سری نگر روڈ سے گزرتا ہوا سری نگر کے قریبی شہر شالٹنگ تک پہنچ گیا اور قبائلی لشکر جب تک یہاں سے پسپا نہ ہوا۔ اس نے یہاں قدم جمانے کے بعد بھارتی فوج سے پہلا مقابلہ بارہ مولا میں کیا۔ یہاں قبائیلیوں نے بھارتی فوج کا مکمل طور پر صفایا کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے دشمن کے کمانڈر کو بھی کیفر کردار کو پہنچا دیا۔ اس اہم کامیابی سے بھارتی اور ڈوگرہ فوج سے ٹوٹ کر مجاہدین سے آملنے والے مسلمان فوجیوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے جبکہ دوسری طرف بھارتی فوج اس قدر پست ہمت ہو گئی تھی کہ ڈیڑھ ماہ تک پھر وہ کوہالہ روڈ پر دوبارہ پیش قدمی کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ اور قبائلی لشکر کے بارہ مولا سے پسپا ہونے کے بعد بھی بھارتی فوج کے جوان ایک عرصے تک اس علاقے میں داخل ہونے کی جسارت نہ کر سکے۔ حالانکہ قبائیلیوں کی واپسی کے بعد بھارتی فوج کے چند سپاہی بھی بغیر کسی مزاحمت کے کوہالہ پہنچ کر وہاں قابض ہو سکتے تھے اور اگر بھارتی فوج کوہالہ پہنچنے کی ہمت کر لیتی تو تحریک آزادیٔ کشمیر اپنے اس ابتدائی دور میں ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ دراصل بات یہ تھی کہ بھارتی فوجیوں پر قبائلی عوام کی اس قدر دہشت اور خوف طاری تھا کہ انہیں ہر پہاڑی کے عقب میں قبائلی مجاہدین ہی چھپے ہوئے نظر آتے تھے۔ جو اُس وقت تک واپس ایبٹ آباد بھی پہنچ چکے تھے۔

سری نگر فتح کرنے میں ناکامی، کشمیر کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں ایک اہم

موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس وقت سری نگر آزاد کروانے میں کامیاب ہو جاتے جیسے مہاراجہ اور اس کی بھگوڑی ڈوگرہ فوج کے جوان ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ گئے تھے، تو ہمارے لئے جموں کے سارے علاقے کو آزاد کروانا بھی بڑا آسان کام ہو جاتا۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم جموں کو ڈوگرہ شاہی کے غاصبانہ تسلّط سے آزاد کروانے کے لئے ایک بھرپور حملہ کرتے، بھارتی فوج بھاری تعداد میں دوبارہ سری نگر پہنچ گئی۔ اور اگر ہم بارہ مولا میں دو روز تک فضول بحث و مباحثے میں الجھ کر وقت ضائع نہ کرتے، بلکہ سری نگر کے ہوائی اڈے کا محاصرہ کر لیتے تو بھارتی فوج کو پھر کبھی بھی سری نگر میں پہنچنے کا موقع نہ مل سکتا۔ کیونکہ ہمیں یہ قیمتی دو روز قبائیلیوں کو سری نگر کے ہوائی اڈے کا محاصرہ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش میں ضائع کرنے پڑے اور اگر یہ قبائلی لشکر ایک منظم فوج کی طرح ایک کمان کے ماتحت ہوتا اور اپنے کمانڈر کے اشاروں پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تو سری نگر اس موقع پر ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ہمارے دامن میں آگرتا اور پھر کبھی بھارتی تسلط میں نہ جا سکتا۔

قبائیلیوں کی پسپائی کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب وہ سری نگر کی طرف پیشقدمی کر رہے تھے تو بھارتی فوج کے ایک دستہ نے جو شاید سوپور کے راستہ وہاں پہنچا تھا، پیچھے سے ان قبائیلیوں پر حملہ کر دیا، علاوہ ازیں بھارتی فوج نے قبائیلیوں پر بمباری بھی شروع کر دی تھی۔ جس کے سامنے قبائیلیوں کی کوئی پیش نہ چل سکی۔ اور پھر قبائیلیوں کو یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ اگر بھارتی فوجوں نے ان کا محاصرہ کرنے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے کہ وہیں گھر کر رہ جائیں۔ اور اسی حالت میں ختم کر دیئے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ہمت ہار دی اور آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے اپنی لاریوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا جن پر سوار ہو کر وہ یہاں تک آئے تھے۔ بعض قبائیلیوں نے جنہیں شاید دشمن کے جاسوسوں نے رشوت دے دی تھی، یہ افواہ بھی اڑائی

شروع کر دی تھی کہ بھارتی فوج قبائلیوں کے مقابلے کیلئے بھاری ٹینک لا رہی ہے جس کی وجہ سے قبائلی عوام میں اور زیادہ سراسیمگی پھیل گئی۔ اور آخر کار ان میں ایک متحد و منظم کمان کا فقدان رنگ لایا اور وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر محاذِ جنگ سے غائب ہونے شروع ہو گئے۔ اگرچہ یہ قبائلی اپنے مفتوحہ علاقے کو غیر محفوظ چھوڑ کر وہاں سے پسپائی اختیار کر چکے تھے۔ پھر بھی بھارتی فوج پر ان کی اس قدر دہشت اور خوف و ہراس سوار تھا کہ وہ چناری سے آگے نہ بڑھ سکے۔ یہ تمام قبائلی لشکر اپنے کشمیری بھائیوں کو غیر محفوظ چھوڑ کر خود بحفاظت تمام ایبٹ آباد واپس پہنچ گئے اور اس نازک موڑ پر جنرل طارق نے اپنے پندرہ جوانوں کی مدد سے بھارتی فوجوں کو محاذِ جنگ پر ساٹھ روز تک پیش قدمی کرنے سے روکے رکھا۔ جنرل طارق نے نازک موقع پر اپنی بے مثال بہادری اور مستقل مزاجی کا ثبوت دیا۔ ہمیں اس محاذ پر بھارتی فوجوں کے مقابلے پر سات سو مجاہدین تیار کر کے بھیجنے میں سات روز لگ گئے۔ اور اس عرصے میں جنرل طارق نے جس شجاعت و جوانمردی سے دشمن کو آگے نہ بڑھنے دیا اس کی مثال ملنی بھی جنگ آزادی میں مشکل ہے۔ ہم میں سے کئی لوگوں نے رات دن تگ و دو کر کے اس محاذِ جنگ کیلئے سات سو مجاہدین کا لشکر تیار کیا کیونکہ ہمیں احساس تھا کہ اگر ہم جلد از جلد اس محاذ پر کمک نہ بھیجیں گے تو کشمیر کی جنگِ آزادی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو کر رہ جائے گی اور کشمیر کی جنگ کے اس نازک موڑ کی اہمیت کا شدید احساس کرتے ہوئے ہم سات سو کشمیری مجاہدین کا یہ لشکر لے کر چناری کے ڈاک بنگلے میں جنرل طارق کے پاس پہنچے تو ان کا اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کا عزم و حوصلہ پہلے کی طرح بلند تھا اور کشمیر کی جنگِ آزادی نے ہمارے لئے جنرل طارق جیسا مجاہدِ اعظم پیدا کر دیا تھا جو پاکستان کے مسلمان نوجوانوں کیلئے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ کیونکہ اس کے عظیم الشان

کارنامے اور خاص طور پر چناری کے محاذ پر اس کی بے پایاں شجاعت و جوانمردی کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔

سری نگر کے محاذ سے قبائلی لشکر کی پسپائی کے بعد پونچھ اور میرپور میں ایک اعتماد کے قابل کشمیری عوام کی فوج تیار کی گئی۔ جس نے کئی خوں ریز مقابلوں کے بعد پونچھ اور تحصیل کوٹلی کے محاذوں پر دشمن کا بالکل صفایا کر دیا تھا۔ پونچھ شہر کے علاوہ ضلع پونچھ کے تمام محاذوں پر ڈوگرہ فوج کو تقریباً ختم کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح میرپور تو شہر کے علاوہ جہاں بھارتی فوج کی حالت بڑی مضبوط تھی۔ تمام محاذوں پر مجاہدین نے شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ میرپور کے بعد آزاد فوج ضلع ریاسی کی تحصیل راجوری کو بھی آزاد کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور سری نگر سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر شوپیاں کے مقام پر پہنچ گئی تھی۔ اسی دوران گلگت کی طرف سے بھی آزاد فوج سری نگر سے تیس میل کے فاصلے پر پہنچ چکی تھی اور بھارتی فوج وادی کشمیر میں پوری طرح مجاہدین کے نرغے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ہندواڑہ کی طرف سے بھی بھارتی فوج سوپور تک جا پہنچی تھی جو سری نگر سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ آزاد فوج ڈوگرہ فوج کے مقابلے میں اپنی جرات و جواں مردی کا مظاہرہ کرتی ہوئی تمام محاذوں پر اس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ ڈوگرہ شاہی کے تسلط سے آزاد کروائے ہوئے علاقوں کا انتظام سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

جبکہ دوسری طرف بھارتی فوج کے جرنیل اس کوشش میں تھے کہ بھارتی فوج مقبوضہ کشمیر میں جن چوکیوں پر قابض ہے وہاں زیادہ سے زیادہ مضبوطی سے اپنے قدم جمائے رکھیں مگر بھارتی فوج کو پونچھ کے علاقے میں اپنے قدم جمائے رکھنے اور مزید بھارتی کمک حاصل کرنے میں بے حد دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ان حالات میں پونچھ کے تیس ہزار باشندوں کے لئے

اشیائے خوردنی کی فراہمی بھی بھارت کے حکمرانوں کے لئے ایک بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس محاذ جنگ پر مجاہدین کی بڑھتی ہوئی جنگی سرگرمیوں کا مقابلہ کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ ضلع میرپور میں بھارتی فوج نے نوشہرہ کے مقام پر اپنی مضبوط چھاؤنی قائم کر رکھی تھی۔ جہاں سے بھارتی فوج راجوری اور پونچھ کے محاذوں پر مجاہدین آزادی کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ چنانچہ بھارتی فوج ۱۹۴۸ء کے دوران پورے نو ماہ تک مختلف محاذوں پر مجاہدین جنگ آزادی سے نپٹنے کے لئے اپنی جنگی تیاریوں میں مصروف رہی۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۴۸ء کے دوران بھارتی فوج نے وادئ کشمیر کے تمام محاذوں پر باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔ اس وقت آزاد فوج کے پاس نہ تو کوئی اسلحہ بارود موجود تھا اور نہ ہی اشیائے خورد و نوش کا معقول بندوبست تھا۔ لداخ کے علاقے میں بھی مجاہدین موسم کی خرابی کے باعث مصیبت میں گھرے ہوئے تھے۔ اور آمد و رفت کے ناکافی ذرائع کی وجہ سے ہم کسی محاذِ جنگ پر ضروری کمک نہیں بھیج سکتے تھے۔ لداخ سے لے کر میرپور تک چار سو میل لمبے علاقے میں بھارتی فوج نے مختلف محاذوں پر اپنی پوری قوت سے مجاہدین پر حملے شروع کر دیئے۔ جس کے نتیجے میں مجاہدین پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اور ایک ماہ کے اندر ہی اندر جدید ترین اسلحے اور بھاری ہتھیاروں سے مسلح بھارتی فوج ڈوگرہ شاہی کے تسلط سے آزاد کرائے ہوئے ایک وسیع و عریض رقبے پر دوبارہ اپنا غاصبانہ قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور کشمیری مسلمان ایک دفعہ پھر لاکھوں کی تعداد میں پاکستان میں پناہ لینے کے لئے ڈھکیل دیئے گئے۔

(۱۱)

سلامتی کونسل کا کردار ۱۹۴۸ء میں

جنوری ۱۹۴۸ء میں بھارت نے مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل کے سامنے پیش کر دیا۔ کیونکہ بھارتی فوج کو اس ریاست میں نہایت نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ آزاد فوج ہر محاذِ جنگ پر بھارتی فوج کو پیچھے دھکیل رہی تھی اور حکومتِ آزاد کشمیر ریاست کے ایک بڑے حصّے کو آزاد کروا کے اس کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے چکی تھی۔ اور مجاہدینِ آزادی اکثر محاذوں پر مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر بھارت نے مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کر دیا حالانکہ ۱۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو جب حکومتِ پاکستان نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کیا جائے تو بھارتی حکومت نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ "۲" ماہ بعد ہی بھارت کی طرف سے یہ اقدام حکومت پاکستان کیلئے تعجب انگیز ثابت ہوا۔ بھارتی حکومت نے سلامتی کونسل سے مسئلہ کشمیر کے متعلق شکایت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مؤقف اختیار کیا تھا:۔

(۱) ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ریاست کے سربراہ مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت کی حکومت سے فوجی امداد کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ ریاست جموں

وکشمیر کا الحاق جمہوریۂ ہندوستان کے ساتھ کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کی سب سے بڑی سیاسی جماعت "نیشنل کانفرنس" نے جس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ ہیں ۔۔۔ بھی بھارتی حکومت سے امداد کی درخواست کی اور ریاست کا بھارت سے الحاق کرنے کی پُرزور حمایت کی۔ اس طرح نہ صرف ریاست کی حکومت نے بلکہ ریاست کے عوام کی واحد نمائندہ جماعت نے بھی بھارت سے فوجی امداد طلب کرتے ہوئے ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کی مکمل طور پہ حمایت کی۔

(ب) ریاستِ جموں وکشمیر کے مظلوم عوام کی جانیں سخت خطرے میں تھیں اور بیرونی حملے کی وجہ سے ریاست کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔ لہٰذا ان حالات کا تقاضا تھا کہ بھارتی حکومت اس سلسلے میں فوری اقدام کرے اور یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ ریاست کا دفاع ایک ایسی حکومت کے ہاتھ میں دیا جائے جو اس کے دفاع کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ بھارتی حکومت نے اس الزام کی پیش بندی کے طور پہ کہ بھارتی حکومت ریاست کو اپنے سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کر رہی ہے، پہلے سے ہی یہ مؤقف اختیار کیا کہ جونہی ریاست کو بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ کر دیا جائے گا اور ریاست میں حالات معمول پہ آجائیں گے تو ریاستی عوام کو اپنے مستقبل کے بارے میں منظم جمہوری طریقے سے رائے شماری کے ذریعے فیصلہ کرنے کا حق دے دیا جائے گا۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ ریاست میں آزادانہ وغیر جانبدارانہ رائے شماری کی ضمانت دینے کے لئے یہ کام ایک بین الاقوامی ادارے کی نگرانی میں

کروایا جائے۔

(ج) بھارتی حکومت نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے ریاستی حکومت کو فوجی امداد فراہم کی ہے۔ کیونکہ بھارتی حکومت اپنی ایک ہمسایہ اور دوست ریاست کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتی کہ کوئی بیرونی حملہ آور طاقت کے ذریعے اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہو یا اسے اپنی مرضی کے خلاف اپنے کسی ہمسایہ ملک سے تعلقات ختم کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔ اور خاص طور پر اس حالت میں جبکہ ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کے کاغذات پر دستخط کئے جا چکے ہوں اور دونوں اس الحاق کو برضا و رغبت منظور کر چکے ہوں تو ریاست کا دفاع کرنا بھارت کیلئے اور بھی زیادہ لازمی ہو جاتا ہے۔

(د) ریاست کو آزاد کروانے کے لئے جو فوجیں وہاں پہلے داخل ہوئی تھیں وہ پاکستان سے بھیجی گئی تھیں۔ جنہیں وہاں سے برابر امداد ملتی رہی ہے۔

(۳) مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں ہم مندرجہ ذیل حقائق بخوبی اخذ کر سکتے ہیں:-

(۱) بیرونی حملہ آوروں کو پاکستان کے علاقوں سے گزر کر ریاست میں آنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

(۲) ان حملہ آوروں کو اپنی جنگی تیاریوں کے لئے سرزمین پاکستان میں چھاؤنیاں بنانے کی بھی اجازت ہے۔

(۳) ان بیرونی حملہ آوروں میں پاکستانی باشندے بھی شامل ہیں۔

(۴) حملہ آوروں کو جنگی ساز و سامان، ذرائع نقل و حمل اور دیگر جنگی ضروریات جن میں پیٹرول بھی شامل ہے۔ پاکستان سے فراہم کیا جاتا ہے۔

(۵) پاکستانی افسران حملہ آوروں کو فوجی تربیت دینے، ان کی راہنمائی کرنے اور

انہیں ہر ممکن امداد دینے میں بھی مصروف ہیں۔

(س) حکومت پاکستان ان حملہ آوروں کی امداد کیلئے ضروری سازوسامان اور جنگجو نوجوان بھیجنے کا سلسلہ ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ حملہ آور حکومتِ پاکستان، پاکستانی افسروں اور عوام سے ہر ممکن فوجی اور شہری ضروریات کی امداد و اعانت حاصل کر رہے ہیں۔ اور حکومت پاکستان کا یہ رویّہ نہ صرف یہ کہ غیر جانبدارانہ نہیں ہے بلکہ اسے بھارت کے خلاف ایک جارحانہ اقدام بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ریاست جموّں وکشمیر بھارت کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ آخر میں بھارتی حکومت نے اپنی شکایت میں سلامتی کونسل سے درخواست کی ہے کہ وہ حکومتِ پاکستان سے یہ درخواست کرے کہ:۔

(۱) حکومتِ پاکستان اپنے فوجی اور سرکاری افسروں کو ان حملہ آوروں میں شامل ہونے یا ان کی امداد کرنے سے انہیں روکے۔

(۲) پاکستانی باشندوں کو ریاستِ جموں وکشمیر میں داخل ہو کر جنگ میں حصہ لینے سے روکے۔

(۳) ان حملہ آوروں کو مندرجہ ذیل اشیاء فراہم نہ کی جائیں۔

(ا) حملہ آوروں کو کشمیر میں جنگ کیلئے پاکستانی علاقوں میں جنگی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔

(ب) ان حملہ آوروں کو پاکستان کی طرف سے فوجی اور دوسری کسی قسم کی امداد بھی نہ دی جائے۔

(ج) حملہ آوروں کو اس قسم کی کوئی امداد بھی فراہم نہ کی جائے کہ وہ اس جنگ کو طول دے سکیں۔

حکومتِ پاکستان نے سب سے پہلے تو ریاست جموّں وکشمیر کو ڈوگرہ

تسلّط سے آزاد کروانے کیلئے ریاست میں برسرِپیکار مجاہدینِ آزادی کو کسی قسم کی امداد فراہم کرنے کی تردید کی۔ اور اس کے بعد حکومتِ پاکستان نے اس امر کی بھی پرزور تردید کی کہ ریاستِ جموّں وکشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق قانونی طور پر جائز ہے۔ پاکستانی حکومت نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہا کہ بھارتی حکومت نے ریاست جموّں وکشمیر کا بھارت سے الحاق فریب دہی اور طاقت کے بل پر کیا ہے۔ کیونکہ اس نے ریاست میں ڈوگرہ و بھارتی فوج اور فرقہ پرست کشمیری و بھارتی ہندؤوں کے گٹھ جوڑ سے ریاستی مسلمانوں کا قتلِ عام کروایا اور ریاست میں ایک عرصے تک کشمیری مسلمانوں کو لوٹنے مارنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ریاست میں مسلمانوں کے جان و مال کا تحفّظ سخت خطرے میں پڑ گیا۔ جموّں کے علاقے میں بے شمار مسلمان تہہ تیغ کئے گئے اور ہزاروں کشمیری مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر پاکستان میں پناہ لینے کے لئے ریاست سے باہر دھکیل دیا گیا۔ حکومتِ پاکستان نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا کہ ریاستِ جموّں وکشمیر میں مسلمان باشندوں کو غالب اکثریت حاصل ہے اور وہ ریاست کا الحاق بھارت کی بجائے پاکستان سے کروانے کے خواہش مند ہیں۔ کیونکہ ڈوگرہ فوج نے ایک طویل عرصہ سے ریاستی مسلمانوں کو اپنے ناقابلِ برداشت ظلم و تشدّد کا شکار بنا رکھا ہے۔ لہٰذا کشمیری مسلمان ڈوگرہ فوج کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کیلئے ریاست کا پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے ہیں۔ ریاستی مسلمانوں نے آزاد علاقوں میں اپنی آزاد حکومت قائم کر لی ہے۔ اور اسی آزاد حکومت کی قائم کی ہوئی فوج نے ریاست میں جنگِ آزادی شروع کر رکھی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پاکستان کے صوبۂ شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کچھ قبائلی

عوام کشمیری مسلمانوں کی جنگ آزادی مدد کرنے کے لئے ریاست میں داخل ہو گئے ہوں۔ یا پھر بھارت سے ترک وطن کر کے پاکستان پہنچنے والے مسلمان باشندے جو ابھی تک بھارتی باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ اس جنگِ آزادی میں حصہ لینے کیلئے ریاست میں پہنچ گئے ہوں۔

حکومتِ پاکستان نے مندرجہ ذیل حقائق کی روشنی میں بھارت پر جوابی الزامات بھی عائد کئے :-

۱- بھارتی حکومت نے برِصغیر کی تقسیم کے منصوبے کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا اور جون ۱۹۴۷ء سے ہی اس منصوبے کو ناکام بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

۲- بھارت میں مقیم مسلمان باشندوں اور خاص طور پر بھارت سے ملحقہ ریاستوں کے مسلمان باشندوں کا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق قتلِ عام روا رکھا گیا ہے۔

۳- بھارت میں مقیم مسلمان باشندوں کا جانی تحفظ، ان کی سیاسی، مذہبی لسانی اور تہذیبی آزادی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

۴- برِصغیر کی جن ریاستوں نے پاکستان کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کیا تھا، ان پر بھارتی حکومت نے فوج کشی کے ذریعے غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔

۵- بھارتی حکومت نے برِصغیر کی تقسیم کے ذریعے معرضِ وجود میں آنیوالے باہمی معاہدوں پر عملدرآمد کرنے کے راستوں میں رکاوٹیں پیدا کیں۔

۶- اب بھارت پاکستان کے خلاف بڑے پیمانے پر فوجی کارروائیاں کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

۷- پاکستان کے خلاف بھارتی حکومت کی ان متعدد جارحانہ کارروائیوں

کا مقصد پاکستان کے وجود کو ختم کرنا ہے۔

حکومتِ پاکستان نے سلامتی کونسل سے درخواست کی کہ اس سلسلے میں پاکستان پر لگائے گئے الزامات اور ان کے جوابی الزامات کی تحقیقات کیلئے ایک یا ایک سے زائد کمیشن مقرر کر کے اس مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔

فریقین کے بیانات سننے کے بعد سلامتی کونسل کے ارکان کے لئے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں تھا کہ سلامتی کونسل اس مسئلے پر بھارت کی درخواست بغیر کسی غور و خوض کے منظور نہیں کر سکتی۔ اور سلامتی کونسل کے ارکان نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کا یہ فیصلہ قطعی اور آخری نہیں ہے۔ سلامتی کونسل کے بعض ارکان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب پاکستان کی سرحد سے اس قدر قریب ریاست کے مسلمانوں کی جانیں اس طرح خطرے میں پڑی ہوئی تھیں تو اگر پاکستان وہاں کے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہمسایہ مسلمانوں کی امداد نہ کرتا تو اسے مجرم تصور کیا جا سکتا تھا۔

اس وقت سلامتی کونسل میں بھارت کی نمائندگی آنجہانی سرگوپال سوامی آئینگر کر رہے تھے۔ جو کسی زمانے میں ریاستِ جموں و کشمیر کے کٹھ پتلی وزیرِ اعظم بھی رہ چکے تھے۔ اور شیخ محمد عبداللہ مسٹر آئینگر کے معاون و مددگار ہونے کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کی انتظامیہ کے سربراہ بھی تھے۔ دوسری طرف پاکستان کی نمائندگی سلامتی کونسل میں چوہدری ظفر اللہ کر رہے تھے جو اس وقت پاکستان کے وزیرِ خارجہ بھی تھے۔ سلامتی کونسل کے اجلاسوں میں طویل تقریریں دونوں طرف سے اپنے مؤقف پر ڈٹے رہنے کیلئے کی گئیں۔ جن میں غم و غصے اور برہمی کا مظاہرہ بھی کیا گیا اور کئی غیر متعلقہ و لاحاصل باتیں بھی کی گئیں مگر بھارت سلامتی کونسل سے اپنا مؤقف تسلیم کروانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

مجھے یاد ہے کہ بھارتی نمائندے سر گوپال سوامی آئنگر نے فروری ۴۸ء میں اپنی حکومت سے مزید ہدایات حاصل کرنے کے سلسلے میں نیویارک سے نئی دلی "روانہ ہونے سے پیشتر کچھ اس انداز سے تقریریں کی تھیں گویا ان کے ملک اور قوم کی وہاں بے عزتی کی گئی ہے شیخ محمد عبداللہ نے بھی بھارت کی نمائندگی کرتے ہوئے سلامتی کونسل کے اجلاس میں تقریر کی۔ کیونکہ بھارتی حکومت کا خیال تھا کہ وہ کشمیری عوام کے سیاسی راہنما کی حیثیت سے سلامتی کونسل کو مسئلہ کشمیر کے متعلق "بھارتی" مؤقف تسلیم کروانے پر رضامند کر سکیں گے۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ کی تقریر کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور شیخ محمد عبداللہ نے اپنی تقریر میں کچھ ایسی باتیں بھی کہہ ڈالیں جو نہ صرف یہ کہ حقیقت سے ہی بعید تھیں بلکہ اس مقصد کے حصول کی راہ میں بھی حائل ہوتی تھیں جو کہ بھارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مثال کے طور پر سلامتی کونسل یہ چاہتی تھی کہ بھارت میں ایک غیر جانبدار حکومت قائم کی جائے تاکہ ریاست میں ایک غیر جانبدار انتظامیہ ہی رائے شماری کروانے کا کام انجام دے سکے۔ لیکن شیخ عبداللہ نے جذباتی انداز میں تقریر کرتے ہوئے سلامتی کونسل کے ارکان سے کہہ دیا کہ اگر خود اللہ تعالیٰ بھی زمین پر اتر آئے اور ریاست جموں و کشمیر کے انتظامات سنبھال لے تو وہ بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اور شیخ عبداللہ کی اس جذبات سے لبریز تقریر نے بعد میں پاکستان کے اس مؤقف کو صحیح ثابت کر دیا کہ شیخ عبداللہ واقعی ریاست میں ایک غیر جانبدار حکومت قائم نہیں کر سکتا اور نہ ہی شیخ عبداللہ کی قائم کی ہوئی حکومت کی نگرانی میں وہاں غیر جانبدارانہ و منصفانہ رائے شماری کروائی جانی ممکن ہے۔

سلامتی کونسل کے اس اجلاس میں ہی برطانوی مندوب نے شیخ عبداللہ سے سوال کیا کہ اگر خدا تعالیٰ بھی کشمیر کے انتظامات سنبھال کر غیر جانبدار نہیں رہ

سکتا تو وہ خود کس طرح ریاست میں ایک غیر جانبدار اور آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ یہ منطقی سوال سن کر شیخ عبداللہ اپنے الفاظ میں خود گھر گئے اور برطانوی نمائندے کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ پھر شیخ عبداللہ نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں پہلے سے تیار کی ہوئی تقریر ایک طرف پھینک کر بغیر سوچے سمجھے نہایت جذباتی انداز میں تقریر کرنی شروع کر دی۔ جو ان کے لئے نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ شیخ صاحب نے اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر ایسی ایسی باتیں کہنی شروع کر دی تھیں جو انہیں کم از کم بھارتی نقطۂ نگاہ کے مطابق بھی نہ کہنا چاہیئے تھیں۔ البتہ اس قسم کی تقریریں سری نگر کے امیرا کدل چوک میں ضرور کی جا سکتی تھیں۔ دراصل شیخ عبداللہ کو ان کی اس تقریر نے ذہنی خلفشار میں مبتلا کر رکھا تھا جو انہوں نے نومبر ۴۷ء میں نئی دلی میں کرتے ہوئے مہاراجہ کی ڈوگرہ حکومت کے خلاف پونچھ میں بغاوت کی پرزور حمایت کی تھی اور اپنی اس تقریر میں انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں ریاست جموں و کشمیر اور خاص طور پر پونچھ میں ڈوگرہ شاہی ظلم و تشدد کے خلاف عوام کی بغاوت کو جائز قرار دیا تھا۔

سلامتی کونسل کے اجلاس میں ناکامی کے بعد بھارتی مندوب سر گوپال سوامی آئینگر اور شیخ عبداللہ کے درمیان آپس میں سخت کلامی بھی ہوتی رہی۔ کیونکہ یہ شیخ عبداللہ صاحب سر آئینگر پر الزام لگاتے تھے کہ وہ پاکستان کے مندوب اور وزیر خارجہ چوہدری ظفراللہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور سر آئینگر سوامی شیخ عبداللہ پر یہ الزام دھرتے تھے کہ انہوں نے بھارتی حکومت کی ہدایت سے روگردانی کرتے ہوئے سلامتی کونسل کے اجلاس میں بغیر سوچے سمجھے تقریر کر کے مسئلہ کشمیر کے متعلق بھارت کے مؤقف کو کمزور کر دیا ہے۔ چنانچہ بھارت کے دونوں نمائندے ایک دوسرے سے اسی طرح الجھتے ہوئے نیویارک سے

نئی دہلی روانہ ہو گئے۔ شیخ عبداللہ نیویارک میں اپنے دوران قیام ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) سے بھی برابر ملاقاتیں کرتے رہے جو ان دنوں میرے سیکرٹری کی حیثیت سے میرے ہمراہ نیویارک میں مقیم تھے۔

میرے ذہن پر سلامتی کونسل کا اجلاس پہلی مرتبہ بھی کوئی خوشگوار اثر نہیں چھوڑ سکا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ سلامتی کونسل ایک عدالت کی حیثیت سے فریقین کے درمیان فیصلہ کروانے کی کوشش نہیں کر رہی بلکہ محض ایک مصالحتی ادارہ کی حیثیت سے فریقین کے درمیان کسی نہ کسی طرح مصالحت ہی کروانا چاہتی ہے۔ اور وہ صرف اس کوشش میں ہے کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو فریقین کے لئے قابل قبول ہو اور اسے محض اسی قسم کا حل تلاش کرنے کیلئے طویل بحث ومباحثہ اور مسلسل مصالحتی کوششیں جاری رکھنے کی ضرورت تھی ورنہ انصاف کے تقاضوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل کے صدر نے ایک تین افراد پر مشتمل کمیشن مقرر کرنے کی تجویز پیش کی جو پاکستان اور بھارت کے درمیان تمام اہم تنازعات کا جائزہ لے اور سلامتی کونسل میں ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء سے ۶ فروری ۱۹۴۸ء تک مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پاکستان اور بھارت دونوں نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اور جب سلامتی کونسل کے ارکان کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مسئلہ کشمیر صرف ایک صورت میں حل کیا جا سکتا ہے کہ اور وہ اس طرح کہ ریاست میں رائے شماری کے ذریعے ریاستی عوام کو اس بات کا فیصلہ کرنے کی اجازت دی جائے کہ آیا وہ ریاست کا الحاق پاکستان سے چاہتے ہیں یا بھارت سے تو سلامتی کونسل کے ارکان نے اس بات پر توجہ دینی شروع کر دی کہ ریاست میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کی ضمانت کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ چنانچہ مندرجہ

ذیل اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سلامتی کونسل کی طرف سے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا:۔

(ا) کشمیر سے تمام غیر ملکی فوجیں واپس بلالی جائیں۔

(ب) کشمیر کے تمام پناہ گزین باشندوں کو ان کے سابق مقامات پر دوبارہ آباد کیا جائے۔

(ج) ریاست میں ایک ایسی غیر جانبدار حکومت قائم کی جائے جو ریاست میں آزادانہ و منصفانہ رائے شماری کروانے کی ضمانت دے سکے۔

مگر جب سلامتی کونسل کے اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی جانے لگی تو بھارتی مندوبین کے وفد نے اپنی حکومت سے ہدایات حاصل کرنے کے بہانے سے سلامتی کونسل کا اجلاس ملتوی کرنے کی درخواست دے دی تاکہ بھارتی حکومت کو مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنا مؤقف تسلیم کروانے کیلئے سلامتی کونسل کے رکن ممالک پر دباؤ ڈالنے کے لئے وقت مل جائے۔ پھر ۱۸ مارچ ۴۸ء کو مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں دوبارہ پیش کیا گیا تو سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے طے شدہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کردی لہذا ۲۱ اپریل ۴۸ء کو سلامتی کونسل کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مندرجہ ذیل اہم نکات شامل ہیں۔

۱۔ یہ ادارہ اس بات پر اطمینان ظاہر کرتا ہے کہ پاکستان اور بھارت دونوں نے یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے پاکستان یا بھارت کیساتھ الحاق کا فیصلہ ریاست میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے جمہوری طریقہ کے ذریعہ ہی ہونا چاہیئے۔ نیز اس ادارے نے کمیشن برائے ہندو پاکستان کے ارکان کی تعداد تین سے بڑھا کر پانچ کردی ہے تاکہ وہ فوری طور پر برصغیر روانہ ہو جائیں اور ریاست میں جنگ بند کرکے رائے شماری کروانے

کے سلسلہ میں پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کے درمیان تعاون اور کمیشن کے ساتھ دونوں حکومتوں کے تعاون کیلئے فضا ہموار کرے۔

۲۔ ریاست میں امن وسلامتی برقرار رکھنے کے لئے سلامتی کونسل نے پاکستان اور بھارت کو مندرجہ ذیل ہدایات جاری کی تھیں۔

(ا) پاکستان ریاست جموں وکشمیر میں برسرپیکار پاکستانی باشندوں کو اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے جنگ جاری رکھنے سے روکے۔

(ب) دوسری طرف بھارت کو بھی یہ ہدایت کی گئی کہ جب اس بات کا یقین ہو جائے کہ قبائلی عوام ریاست سے نکل گئے ہیں تو ریاست میں مقیم بھارتی فوج کے انخلاء کے متعلق وہ بھی فوراً سلامتی کونسل کے بھیجے ہوئے کمیشن کے مشورہ سے منصوبہ تیار کرے اور ریاست میں صرف اسی قدر بھارتی فوج باقی رہنے دی جائے جو کہ ریاست کے داخلی استحکام اور نظم ونسق قائم رکھنے کیلئے ضروری سمجھی جائے۔

(ج) ریاست میں بھارتی فوج کی مختصر سی تعداد کمیشن کے مشورہ کے بعد صرف ان مقامات پر رکھی جائے جہاں مقیم رہ کر بھارتی فوج کو ریاستی عوام کیلئے پریشانی کا موجب بننے کا موقع نہ ملے۔ نیز اگر ریاست میں بھارتی فوج کے محفوظ دستے رکھنے کی ضرورت محسوس کی جائے تو انہیں صرف چھاؤنیوں میں رکھا جائے۔

(د) کمیشن ریاست میں امن قائم رکھنے کیلئے زیادہ سے زیادہ کام علاقائی افواج سے لے اور اگر علاقائی افواج ناکام ثابت ہوں تو دونوں ملکوں کے باہمی مشورے سے کسی ملک کی فوج جو زیادہ کارآمد ثابت ہو سکے حاصل کرے۔

۳۔ قرارداد کے دوسرے حصہ میں ریاست جموں وکشمیر میں رائے شماری

کیلئے شرائط کی وضاحت کی گئی ہے جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں :۔

(ا) ریاست میں ایک اس قسم کی مخلوط حکومت قائم کی جائے جس کے خصوصی ارکان کو نمائندہ سیاسی جماعتیں نامزد کریں اور ان نامزد کیے جانیوالے ارکان کو ریاست کے نظم و نسق میں وزارتی سطح پر برابر کا حصہ لینے کا موقع فراہم کیا جائے۔

(ب) اقوام متحدہ کا جنرل سیکرٹری ریاست میں رائے شماری کروانے کیلئے ایسے منتظمین مقرر کرے جنہیں ریاست میں رائے شماری کروانے کے مکمل اختیارات کے علاوہ ریاستی فوج اور پولیس کو احکام صادر کرنے اور سپیشل مجسٹریٹ مقرر کرنے کے اختیارات بھی حاصل ہوں۔

(ج) ریاست کے ان تمام پناہ گزین باشندوں کی واپسی کا بندوبست کیا جائے جو پندرہ اگست یا اسکے بعد ریاست سے باہر جا کر پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

(د) ریاست سے ان تمام بھارتی باشندوں کا انخلا عمل میں لانا جو کسی قانونی مقصد کے بغیر ریاست میں داخل ہو کر وہاں مقیم ہیں۔

(ر) ریاست میں رائے شماری کے بعد کمیشن سلامتی کونسل کو اس بات سے مطلع کرے کہ ریاست میں رائے شماری آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر کروائی جا سکی ہے یا نہیں۔

لیکن بھارتی حکومت نے سلامتی کونسل کی یہ قرارداد ماننے سے صاف انکار کر دیا اور پاکستان کے پاس بھی اس قرارداد کو مکمل طور پر تسلیم کر لینے کے لئے اگرچہ کوئی معقول جواز نہ تھا تاہم پاکستان اور بھارت دونوں نے ہی کونسل کی قرارداد سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود اس قرارداد کے مطابق قائم کئے جانے والے کمیشن برائے ہند و پاکستان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ پاکستان

نے اس کمیشن کے لئے ارجنٹائن کو اپنا نمائندہ نامزد کیا جبکہ بھارت نے اپنی نمائندگی کے لئے چیکوسلواکیہ کا نام تجویز کیا۔ لیکن یہ دونوں نمائندے کمیشن کے تیسرے رکن کے انتخاب پر اتفاق رائے نہ کر سکے۔ چنانچہ سلامتی کونسل کے صدر نے بلجیئم کولمبیا اور امریکہ کو کمیشن کے نمائندوں کی حیثیت سے نامزد کر کے کمیشن کے تین ارکان کی مقررہ تعداد پوری کر دی جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان کے نام سے موسوم ہو کر کام کرنے لگا۔

(۱۲)

اقوامِ متحدہ کا کمیشن برائے ہند و پاکستان

۱۹۴۸ء کے وسط میں سلامتی کونسل نے اپنے کمیشن برائے ہند و پاکستان کے ارکان کو برصغیر کے دورے کی ہدایت کی اور کمیشن کے ارکان اس سلسلے میں ۷ر جولائی کو کراچی پہنچ گئے اور پھر بھارتی حکام سے بات چیت کے لئے ۱۰ر جولائی کو نئی دہلی روانہ ہو گئے۔ جہاں پہنچتے ہی انہوں نے کشمیر میں جنگ بند کروانے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ۲۳ر جولائی کو جنگ بندی کے مسئلے پر کمیشن کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پاکستان اور بھارت دونوں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ ۱۰ر جولائی سے لے کر ۱۳ر اگست تک کمیشن کے ارکان پاکستان، بھارت اور آزاد کشمیر کے ذمہ دار حکام سے بات چیت میں مصروف رہے۔ اس دوران راقم الحروف اور چودھری غلام عباس خاں سے بھی کمیشن کے ارکان کی کراچی میں ملاقات ہوئی۔ اور ہم نے کمیشن کے ارکان کے ساتھ مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کی۔ کمیشن نے اسی دوران ایک فوجی سب کمیشن بھی کشمیر کے دونوں حصّوں میں جنگی صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ اس سب کمیشن کے ارکان پہلے سری نگر گئے۔ اور مقبوضہ کشمیر میں جنگی صورتِ حال کا معائنہ کرنے کے بعد کمیشن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے بعد

۱۲ اگست کو سب کمیشن کے ارکان آزاد کشمیر کے دورے پر روانہ ہوئے تاکہ اس علاقے میں جنگی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔

دونوں ملکوں کے نمائندوں سے کئی ملاقاتوں کے بعد کمیشن نے ۱۳ اگست ۴۸ء کی قرارداد اور اس سلسلے میں کی گئی خط و کتابت اشاعت کے لئے اخبارات کو دے دی۔ ۱۴ ستمبر کو راقم الحروف اور چودھری غلام عباس خاں نے کمیشن کے دو ارکان مسٹر ھڈل اور مسٹر گریف سے ملاقات کی۔ کمیشن کے ارکان کو منگلا ہیڈ ورکس اور میرپور کے مقامات کا معائنہ بھی کروایا گیا۔ جہاں حکومتِ آزاد کشمیر کی طرف سے کمیشن کے اِن ارکان کے اعزاز میں ایک ظہرانہ بھی دیا گیا۔ اس کے بعد ارکانِ کمیشن سری نگر روانہ ہو گئے اور جنیوا جانے تک وہیں مقیم رہے۔

کمیشن کے ان طویل مذاکرات کے بعد سلامتی کونسل نے ۱۳ اگست ۴۸ء کو کشمیر میں جنگ بندی اور عارضی معاہدۂ صلح کے لئے ایک قرارداد منظور کی جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں :۔

اس ادارے کے خیال میں مسئلہ کشمیر کے قطعی حل سے پیشتر ضروری ہے کہ فریقین کے درمیان فوری طور پر جنگ بند کروا کے حالات کو معمول پر لایا جائے کیونکہ وہاں کے موجودہ حالات عالمی امن کے لئے خطرے کا باعث بنے ہوئے ہیں مسئلہ کشمیر کے قطعی فیصلے سے متعلق حکومتِ پاکستان کے استفسار پر کمیشن نے ۲۷ اگست کو وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کمیشن کی اس قرارداد میں مسئلہ کشمیر کے قطعی فیصلہ سے وہی مراد لی جاتی ہے جو کمیشن کی ۲۱ اپریل ۴۸ء کی قرارداد میں لی گئی ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جائے گی۔ کمیشن کی اس قرارداد میں مزید کہا گیا ہے کہ کمیشن مسئلہ کشمیر کا کوئی ایسا حل نامنظور نہیں کر سکے گا۔ جس پر دونوں ملکوں کی حکومتیں متفق ہوں۔ بشرطیکہ یہ حل کشمیری عوام کی خواہشات کی عکاسی کرتا ہو۔

قرارداد کا حصّہ اوّل

قرارداد کے حصّہ اوّل میں پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ریاست جموّں وکشمیر میں برسرِ جنگ مسلح افواج کو جنگ بند کرنے کے احکام جاری کریں۔ بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر میں جنگ کرنے والی بھارتی فوجوں کو جنگ میں حصّہ لینے سے روکے اور حکومتِ پاکستان بھی ریاست میں برسرِ پیکار پاکستانی افواج، آزاد فوج اور قبائلی عوام کو جنگ سے باز رہنے کی ہدایت کرے۔ اس قرارداد میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ریاست میں جنگ بندی کی نگرانی کے لئے غیر جانبدار فوجی مبصر مقرر کئے جائیں جو خطِ متارکۂ جنگ کے دونوں طرف جنگ بندی کی نگرانی کریں۔ قرارداد میں پاکستان اور بھارت کی حکومتوں پر یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ وہ اپنے عوام کو ہدایت کریں کہ ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جو دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت کے لئے مفید ثابت ہو۔

حصّہ دوم

قرارداد کے اس حصّے میں دونوں ملکوں کے درمیان عارضی معاہدہ صُلح کے بنیادی اصولوں کا تعیّن کیا گیا ہے۔ جن کی روشنی میں دونوں ملکوں کے نمائندے کمیشن کے تعاون سے عارضی معاہدۂ صُلح کی تفصیلات تیار کر سکیں۔

(ا) حکومتِ پاکستان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ریاست سے اپنی مسلح افواج واپس بُلائے اور اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تشریح کر دی گئی تھی کہ ریاست سے پاکستانی فوج کا انخلاء، ریاست سے بھارتی فوج کے ایک بڑے حصّے کے انخلاء کے ساتھ ہی عمل میں لایا جائے گا۔

(۲) حکومتِ پاکستان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ جنگ میں حصّہ لینے والے پاکستانی باشندوں کو ریاست سے واپس بلانے کی مؤثر کوشش کرے۔ اور کمیشن نے اس امر کی بھی تشریح کر دی کہ آزاد کشمیر فوج کو توڑا یا وہاں سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ بلکہ آزاد فوج کشمیر کے آزاد علاقے میں پاکستانی فوج کی جگہ متعین کی جائے گی۔

(۳) ریاست کا جو علاقہ پاکستانی فوج خالی کرے گی۔ اس کے انتظامات وہاں کے مقامی حکام کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ جن کی نگرانی کمیشن کرے گا۔ کمیشن نے مقامی حکام کی اصطلاح سے "حکومت آزاد کشمیر" مراد لی ہے۔ اور جہاں تک کمیشن کی نگرانی کا تعلق ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ کمیشن حکومتِ آزاد کشمیر کے ہر شعبہ کی نگرانی کرے گی بلکہ اس سے صرف یہ مُراد ہے کہ حکومتِ آزاد کشمیر کوئی ایسا اقدام نہ کرے جس سے عارضی معاہدۂ صُلح کو کامیاب بنانے کی راہ میں رُکاوٹ پیدا ہو۔

(۴) جب آزاد کشمیر کے علاقے سے پاکستانی مجاہدین، قبائلی عوام اور پاکستانی افواج نکل جائیں۔ تو بھارتی حکومت کمیشن کے ساتھ رابطہ پیدا کر کے ریاست سے بھارتی فوج کے ایک بڑے حصّے کے اِنخلاء کا کام شروع کر دے۔ کمیشن نے اس بات کا احساس کرتے ہوئے کہ ریاست کو کسی بیرونی حملے کی روک تھام اور داخلی نظم و نسق کے لئے کچھ بھارتی فوج کی ضرورت ہو گی، بھارتی حکومت کو مقبوضہ کشمیر کے علاقے میں اپنی کچھ فوج رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ مگر بھارت کی یہ فوج صرف اس علاقے تک محدود رہے گی جو حکومت آزاد کشمیر کے دائرہ عمل میں شامل نہیں۔

(۵) بھارتی حکومت اس امر کی بھی ضمانت دے گی کہ ریاست میں مہاراجہ کی حکومت

ہر طرح سے امن وامان برقرار رکھے گی اور ریاستی عوام کے سیاسی اور بنیادی انسانی حقوق کا پورا پورا تحفظ کرے گی۔

حصّہ سوئم

قرارداد کے اس حصے میں حکومتِ پاکستان اور حکومتِ بھارت کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس امر کی ضمانت دیں کہ ریاستِ جموّں وکشمیر کے مستقبل کا فیصلہ ریاستی عوام کی مرضی کے مطابق کیا جائے گا۔ اور دونوں حکومتیں کمیشن سے بھی مشورہ کریں گی تاکہ ریاستی عوام کسی بندش یا دباؤ کے بغیر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں کمیشن نے حکومتِ پاکستان کو ۱۹ ستمبر ۴۸ء کو مطلع کیا کہ کمیشن اپنی قرارداد کے حصّہ سوم کو عملی جامہ پہناتے ہوئے سلامتی کونسل کی قرارداد مورخہ ۲۱ اپریل ۴۸ء میں مندرجہ رائے شماری کی شرائط کو پیشِ نظر رکھے گا۔ اور اگر کمیشن نے ان شرائط میں کوئی ردّوبدل ضروری سمجھا تو اس سلسلے میں پاکستان اور بھارت کی حکومتوں سے مشورہ کیا جائیگا۔

بھارتی حکومت نے کمیشن کی اس قرارداد کو منظور کر لیا لیکن بعد میں اس کی مندرجہ ذیل تشریح کی۔

(۱) کمیشن ریاست جموّں وکشمیر کے کل علاقے پر ریاست کے مہاراجہ کی حاکمیت تسلیم کرتا ہے۔

(ب) ریاست کے شمالی علاقے لداخ سے پاکستانی فوج اور قبائلی عوام کے انخلاء کے بعد اس علاقے کے نظم ونسق کی ذمہ داری ریاست کی ڈوگرہ حکومت کے سپرد ہو جائے۔

(ج) ریاست میں رائے شماری کروانے کے کام یا ریاست کے داخلی نظم و نسق میں حکومت پاکستان کو کسی قسم کی مداخلت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

(د) کمیشن ریاست پر غیر ملکی حملے، داخلی خلفشار کے خطرات اور ان کی مؤثر روک تھام کے سلسلے میں بھارتی حکومت کی ذمہ داریوں کو بھی محسوس کرتا ہے۔

حکومت پاکستان کمیشن کی اس قرارداد کے تمام مندرجات سے پوری طرح متفق نہ تھی تاہم اس نے اس شرط پر یہ قرارداد منظور کر لی کہ بھارت کی حکومت سلامتی کونسل کی قرارداد مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کے حصہ (ب) میں پیش کی گئی شرائط (جن میں شق ۶ سے شق ۱۵ تک بشمول شق ۶ اور ۱۵ شامل ہیں) سلامتی کونسل میں یہ قرارداد پیش کرنے والے ممالک کی اس تشریح و توضیح کے ساتھ منظور کرے کہ ریاست کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کا آخری فیصلہ ریاست میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ لہٰذا حکومت پاکستان نے اس سلسلے میں اپنا مؤقف بین الاقوامی طور پر تسلیم کئے جانے والے اس اصول کی روشنی میں اختیار کیا کہ عوام کو اس قضیے کے تصفیے کے لئے اپنے اظہار رائے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ چونکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعہ کی بنیاد یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہونا چاہیے یا بھارت کے ساتھ؟ اس لئے اگر دونوں ممالک اس تنازعے کو پُرامن اور منصفانہ طریقے سے حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا واحد حل یہی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں غیر جانبدار ادارے کی نگرانی میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کروا کر وہاں کے عوام سے معلوم کر لیا جائے کہ وہ ریاست کا الحاق پاکستان یا ہندوستان میں سے کس کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔

اقوام متحدہ کا کمیشن جب ہند و پاکستان کے دورے پر آیا تو اس وقت اگرچہ کشمیر میں جنگ جاری تھی۔ لیکن فریقین کوئی معاہدہ ضبط تحریر میں لائے بغیر اس نتیجے پر متفق ہو چکے تھے کہ آئندہ کوئی فریق بھی دوسرے فریق کے خلاف

وسیع پیمانے پر جنگی کارروائی نہیں کرے گا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریاست میں غیر سرکاری طور پر جنگ بندی عمل میں لائی جا چکی ہے یا کم از کم ہمیں ضرور یہ ہدایت مل چکی تھی کہ ہم کوئی ایسا اقدام نہ کریں جس سے اس غیر سرکاری طور پر باہمی تفہیم کے مطابق اختیار کی گئی جنگ بندی کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ اور صورتِ حال زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا ہو۔ اور اس دوران ہمیں اس قسم کی اطلاعات بھی موصول ہو رہی تھیں کہ بھارتی حکومت وسیع پیمانہ پر جنگ نہ کرنے کی یقین دہانی کروانے کے باوجود سارے مقبوضہ کشمیر میں اور خاص طور پر نوشہرہ کے محاذ پر اپنے دفاعی انتظامات مستحکم بنا رہی ہے۔ اور جب سلامتی کونسل ریاست جموں و کشمیر میں جنگ بندی کے لئے مصروفِ گفت و شنید تھی بھارتی حکومت اس وقت بھی وسیع پیمانے پر جنگ جاری رکھنے کے لئے ریاست میں اپنی دفاعی طاقت میں کئی گنا اضافہ کرنے میں مصروف تھی۔ دراصل بھارتی حکومت اپنے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق ریاست میں بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کی تیاریاں کر رہی تھی تاکہ وہ کشمیر کے تمام تر علاقے کو اپنی جنگی قوت کے بل پر فتح کر کے اس پر غاصبانہ قبضہ کر لے۔ اور دنیا پر یہ ثابت کر سکے کہ مسئلہ کشمیر ایک فیصل شدہ مسئلہ ہے۔ لیکن دنیا پر جلد ہی بھارت کا یہ خطرناک جنگی منصوبہ بے نقاب ہو گیا کیونکہ بھارت کے جزوی منصوبے کا اصل مقصد در پردہ پاکستان کی سالمیت اور بقا کیلئے بھی ایک مستقل خطرے کے مترادف تھا۔ لہٰذا جب بھارتی فوج نے راجوڑی سیکٹر میں آزاد فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کیا تو پونچھ اور راجوڑی کے علاقوں سے ہزاروں کشمیری مسلمانوں کو آزاد کشمیر اور پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ کیونکہ بھارتی حکومت ریاست کے جن علاقوں پر قبضہ کرتی تھی وہاں کے مسلمان باشندوں کا قلع قمع کر کے انہیں آزاد کشمیر یا پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اور اس

کی بجائے وہاں ہندوؤں اور سکھوں کو آباد کر دیا جاتا تھا۔

۱۹۴۸ء کے آخر میں بھارتی فوج نے غیر متوقع طور پر ریاست میں اپنی جنگ کا دائرہ عمل وسیع کر دیا۔ اور نوشہرہ چھاؤنی میں مقیم بھارتی فوج ایک طرف کوٹلی کی جانب اور دوسری طرف راجوڑی کی سمت بڑھنے لگی۔ آزاد فوج ان علاقوں میں خصوصاً مینڈھر کے محاذ پر بہت کمزور تھی۔ کیونکہ ہمارے پاس وادی مینڈھر تک پہنچنے کے لئے ذرائع نقل و حمل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ آزاد فوج جس کی تعداد بہت کم تھی ریاست میں شوپیاں سے لے کر راجوڑی کے قلعہ عظیم گڑھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ مگر آزاد فوج کے پاس اس وقت جدید ترین اسلحہ بھی بہت ناکافی تھا۔ اور اس علاقے میں ان کی کمان بھی کسی تجربہ کار افسر کے ہاتھ میں نہ تھی کیونکہ اس علاقے کی آزاد فوج میں زیادہ تر وادی مینڈھر کے رضا کار نوجوان شامل تھے لیکن حکومت آزاد کشمیر پونچھ سے وادی مینڈھر اور دوسرے علاقوں میں بھارتی فوج کے مقابلہ میں آزاد فوج کے زیادہ تجربہ کار فوجی دستے بھی نہیں بھیج سکتی تھی۔ کیونکہ پونچھ شہر میں مقیم بھارتی فوج بڑی مضبوط اور تربیت یافتہ تھی۔ اور آزاد فوج نے اس وقت پونچھ شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا لہٰذا اس جگہ آزاد فوج کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی تو بھارتی فوج بڑی آسانی کے ساتھ ضلع پونچھ کے مغربی حصہ پر دوبارہ قبضہ کر سکتی تھی۔

نومبر اور دسمبر ۱۹۴۸ء کے دوران جب بھارتی فوج نوشہرہ میں اپنی دفاعی قوت مضبوط کر رہی تھی۔ تو اس نے نوشہرہ اور جموں کے درمیان اپنے ذرائع آمد و رفت کے انتظامات بھی بہتر بنائے تھے تاکہ بھارتی فوج جموں سے بروقت ہر قسم کی کمک حاصل کر سکے۔ جموں میں بھارتی فضائیہ کی بھی بڑی مضبوط چھاؤنی تھی جو بھارتی فوج کو پیشقدمی کرنے کی صورت میں بڑی مدد دے سکتی تھی۔ پھر دسمبر ۱۹۴۸ء میں بھارتی فوج نے نوشہرہ سے راجوڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ دوسری جانب بھارتی فوج

کوٹلی کی سمت بھی پیشقدمی کر رہی تھی لیکن اس محاذ پر آزاد فوج کے ایک بریگیڈ نے اسے پیچھے دھکیل دیا اگرچہ آزاد فوج کے پاس نہ تو خودکار اسلحہ تھا نہ مشین گنیں اور نہ اس کی مدد کے لئے فضائی فوج موجود تھی مگر اس کے باوجود آزاد فوج نے نہایت پامردگی سے اپنی شجاعت و دلیری کے جوہر دکھائے۔ بھارتی فوج نے راجوری اور مینڈھر کی طرف سے بھی بھرپور حملے کئے اور راقم الحروف کو بتایا گیا کہ بھارتی فوج کے دو بریگیڈ جو مشین گنوں سے اچھی طرح مسلح تھے، ٹینکوں اور فضائی فوج کی مدد سے اس علاقے میں پیشقدمی کر رہے تھے۔ لہذا بھارتی فوج کا ہراول دستہ ہمارے دفاع کو ایک جگہ کمزور پاکر آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گیا اور بھارتی فوج منڈی نالہ اور مینڈھر کی طرف اس تیزی سے آگے بڑھی کہ آزاد فوج اپنی چوکی سے کٹ کر رہ گئی اور بھارتی فوج نے حسب معمول اس علاقے کے مسلمانوں کو بے دریغ تہہ تیغ کرنا اور ان کے مکانوں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ جب بھارتی فوج کے ہاتھوں مسلمانوں کے اس قتل عام کی خبریں اس علاقے میں مقیم آزاد فوج تک پہنچیں تو آزاد فوج کے سپاہی اپنے محاذ کو چھوڑ کر ان علاقوں میں موجود اپنے بیوی بچوں کو ڈوگرہ فوج کے ظلم و ستم سے بچانے کے لئے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر وادی مینڈھر اور راجوری کے علاقہ میں آباد ہزاروں کشمیری مسلمان ترک وطن کر کے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے اور اب تک وادی جموں و کشمیر سے تقریباً دو لاکھ مسلمان پناہ گزیں ترک وطن کر کے پاکستان کے سرحدی شہروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو چکے تھے۔

یہ کشمیری پناہ گزیں اپنا مختصر سا سامان سروں پہ اٹھائے ہوئے کس طرح پا پیادہ میلوں چلتے ہوئے پاکستان میں پہنچتے تھے۔ اس کی المناک داستان تو مستقبل کا وہ غیر جانبدار مورخ ہی بیان کرے گا جو کشمیر کی تاریخ جنگ آزادی لکھنے بیٹھے گا۔ مگر کشمیری مسلمانوں کے معصوم بچے اور بوڑھے جس طرح ان پہاڑی راستوں پر ننگے پاؤں طویل

مسافت طے کر کے پاکستان میں پناہ لیتے رہے ہیں، وہ بذات خود ایسی دلخراش اور اہم تاریخی داستانیں ہیں کہ اُن کے ذکر کے بغیر کشمیر کی داستان آزادی کبھی مکمل نہ ہو سکے گی۔ اور جب یہ کشمیری مسلمان اپنی جانیں بچا کر پاکستان کی طرف بھاگ رہے تھے تو اُن کے خون کی پیاسی بھارتی اور ڈوگرہ فوج اُن کا تعاقب کر رہی تھی۔ اِن کشمیری مہاجرین کو کئی کئی روز تک بھوکے پیاسے رہ کر بھی بھارتی فوج کے خوف سے سفر جاری رکھنا پڑا جبکہ دوسری طرف بھارتی فوج کے طیارے بھی ان پناہ گزین کشمیری مسلمانوں کے قافلوں پر آسمان سے بمباری کر کے انہیں ختم کرنے کے درپے تھے۔ مگر اِن کشمیری مہاجرین نے ہمّت نہ ہاری اور کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے اور راستوں کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے پاکستان کی سرزمین پر پہنچ گئے۔

بھارتی فوج نے مینڈھر کے محاذ کے ساتھ لدّاخ کے محاذ پر بھی اپنی جنگی سرگرمیاں تیز کر دیں اور آزاد فوج کو پہلے دراس سے کارگل تک اور اس کے بعد سکردو تک پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ لدّاخ کے علاقہ میں آزاد فوج نے جس جوانمردی و شجاعت سے بھارتی فوج کا مقابلہ کیا اس کی بھی ایک مثالی حیثیت ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آزاد فوج نے اپنی کم تعداد رکھنے اور ذرائع نقل و حمل موجود نہ ہونے کے باوجود اس علاقے میں جس اولوالعزمی و تحمل مزاجی سے جنگ جاری رکھی، اس کی جس قدر بھی تعریف و توصیف کی جائے کم ہے۔ مگر یہاں آزاد فوج کی اُن مشکلات کا تفصیلی ذکر ناممکن نہیں جو اُسے لدّاخ میں جنگ کے دوران پیش آئیں۔

ان تمام محاذوں پر بھارتی فوج کو پیش قدمی کرنے سے دو مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی ہو گئی۔ ایک تو وہ پونچھ شہر میں گھری ہوئی فوج کے لئے کمک بھیجنے کا راستہ صاف کرنے میں کامیاب ہو گئی اور دوسرے وہ لیہہ کو لدّاخ تحصیل کی فوجی چھاؤنی سے ملانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور دو ہفتے کے مختصر عرصہ میں بھارتی فوج کی اس پیشقدمی

کی بدولت وہ آزاد کروایا ہؤا ایک وسیع علاقہ دوبارہ بھارتی فوج کے حوالے کرنا پڑ گیا جس سے ہماری فوج اور عوام کے حوصلے بہت پست ہو گئے اور کشمیری عوام کی تحریکِ آزادی کو اس بھارتی پیشقدمی سے جسقدر نقصان پہنچا اتنا نقصان اسے پیشتر کبھی نہ پہنچا تھا۔

وادیٔ مینڈھر میں آزاد فوج کو پسپا ہونا پڑا تو ضلع پونچھ کے تمام علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا —— میں عوام کے حوصلے بلند رکھنے کے لئے پہلے تراڑ کھیل سے بھیرہ اور پھر وہاں سے راولاکوٹ پہنچ گیا۔ اور مجھے یقین واثق ہے کہ اگر میں اس وقت ان علاقوں کا دورہ نہ کرتا تو پونچھ سے کم از کم پانچ لاکھ کشمیری مسلمان راہِ فرار اختیار کر جاتے۔ اور ہماری مشکلات میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ اسی دوران مجھے ایک پیغام موصول ہؤا جس میں مجھے فوراً کراچی پہنچنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اور ہمارے کراچی پہنچتے ہی ریاست جموّں و کشمیر میں جنگ بندی کے سوال پر بات چیت شروع کر دی۔

اس موقع پر پاکستان کے وزیرِ خارجہ چوہدری سر ظفر اللہ خاں نے سلامتی کونسل سے بھی یہ شکایت کر دی تھی کہ ریاست میں بھارت نے وسیع پیمانے پر جنگ شروع کر کے سلامتی کونسل سے کئے ہوئے اس وعدہ کی خلاف ورزی کر دی ہے کہ بھارت ریاست جموّں و کشمیر میں کوئی ایسا اقدام نہیں کرے گا جس سے کہ وہاں کی صورتِ حال کے مزید خراب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ مگر بعد میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بھارتی حکومت کا اس جنگی کارروائی سے یہ مقصد تھا کہ وہ جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کرنے سے قبل ہی ریاست کے اہم مقامات پر قبضہ کر کے پونچھ کی فوجی چھاؤنی اور لدّاخ کے دفاعی اڈے تک کمک پہنچانے کے لئے راستہ صاف کر لے۔

میرا خیال ہے کہ شرائط جنگ بندی کی خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر اگر ہمیں جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کرنے ہی تھے تو یہ کام کچھ عرصہ پہلے ہی کر لینا چاہئے تھا۔ کیونکہ جب سے یہ جنگ بندی کا معاہدہ طے کیا گیا تھا اس وقت سے ہم ریاست کا ایک وسیع و عریض

علاقہ چند روز کے اندر اندر بھارتی فوج کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور اگر ہم جنگ بندی کا معاہدہ نہ کرتے تو شاید ہمیں، پونچھ، میرپور اور مظفر آباد کے کچھ علاقوں سے بھی ہاتھ دھونے نہ پڑتے۔ علاوہ ازیں ہم لداخ کے محاذوں پر بھی جنگ جاری رکھ سکتے تھے کیونکہ ہمیں ریاست کے مغربی علاقے میں نہایت مضبوطی سے قدم جمانے کا موقعہ مل گیا تھا۔ جو ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو رہا تھا۔ اور اگر ہم اس علاقے کو بھی بھارت کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیئے جاتے تو ہم اس سلسلے میں سودا بازی کرنے کے بھی قابل نہ رہتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ بندی کے بعد حالات اس قدر مخدوش اور ہمارے مخالف ہو گئے تھے کہ آزاد کشمیر کا تمام علاقہ ہمارے ہاتھ سے نکل جانے کا سخت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

جب کمیشن نے ریاست سے بھارتی فوج کے انخلا کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی تو بھارتی حکومت نے اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کمیشن کی راہ میں طرح طرح سے رکاوٹیں پیدا کرنی شروع کر دیں تاکہ وہ ریاست میں رائے شماری کے منصوبے کو بالکل ناکام بنا دے۔ چنانچہ بھارت نے رائے شماری کروانے کے لیے حالات سازگار بنانے کی بجائے کئی قسم کے بعید از قیاس مطالبات پیش کرنے شروع کر دیئے۔ بھارتی حکومت ایک طرف تو آزاد کشمیر فوج کو ختم کرنے کا مطالبہ کرنے لگی اور دوسری طرف اس نے گلگت اور لداخ کے شمالی علاقہ کے نظم و نسق اور دفاع کے سوالات اٹھانے شروع کر دیئے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینی ضروری ہے کہ آزاد کشمیر کی فوج کوئی بیرونی فوج نہیں ہے بلکہ اس فوج میں ریاست جموں و کشمیر کے وہی مسلمان باشندے شامل ہیں جنہوں نے اگست ۱۹۴۷ء کے آخر میں ریاست میں تحریک آزادی کا آغاز کیا تھا۔ اور اس فوج کا قیام بھی صرف کشمیری عوام کی ڈوگرہ حکومت کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی فطری خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ جبکہ اقوام متحدہ کے کمیشن نے بھی آزاد فوج کے متعلق نہایت واضح اور قطعی رائے قائم کی ہے۔

ریاست کا شمالی علاقہ زیادہ تر پہاڑی ہے جہاں سو فیصد مسلمان آبادی ہے اور جب اس علاقے میں تحریک آزادی شروع ہوئی تو یہ تحریک بھی دوسرے ریاستی مسلمانوں کی اجتماعی تحریک آزادی کا ایک جزو بن گئی۔ اور یہاں کے عوام نے نسبتاً کم آباد اور محدود ذرائع آمد و رفت رکھنے والا پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت جلد مہاراجہ کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں پر سے اتار پھینکا تھا۔

مگر بھارت نے سلامتی کونسل کی قرارداد مورخہ ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء اور مورخہ ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کو جنہیں فریقین منظور کر چکے تھے، اب بالکل نئے معانی پہنا کر ایک نئی کج بحثی کا آغاز کر دیا تھا۔ تاہم کمیشن نے بھارتی حکومت کی ان نئی نئی تشریحوں اور توضیحوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ فریقین کے درمیان معاہدہ صلح کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے تمام اختلافات فیصلہ کے لئے " ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز " کے سامنے پیش کر دیئے جائیں جسے بھارت اور پاکستان دونوں ناظم رائے شماری مقرر کرنا منظور کر چکے تھے۔ سلامتی کونسل کے صدر اور برطانیہ کے وزیر اعظم نے بھی کمیشن کی اس مدبرانہ مصالحتی تجویز کی حمایت کی اور پاکستان نے بھی باہمی مصالحت کی یہ تجویز غیر مشروط طور پر منظور کر لی لیکن بھارت نے اسے منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لہٰذا کمیشن کے پاس اب کوئی قابل عمل راستہ نہ رہا اور اس نے مسئلہ کشمیر دسمبر ۱۹۴۹ء میں دوبارہ سلامتی کونسل کے سامنے پیش کر دیا۔

دسمبر ۱۹۴۹ء میں جب راقم الحروف سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے نیویارک پہنچا تو اس وقت کنیڈا کے " جنرل میک نوٹن " سلامتی کونسل کے صدر تھے۔ اور میں نے اپنی زندگی میں جن چند عظیم شخصیتوں سے ملاقات کی ہے۔ جنرل میک نوٹن بھی ان میں سے ایک تھے۔ سلامتی کونسل نے فریقین کے درمیان مصالحت کروانے کا اہم کام بھی جنرل میک نوٹن کے سپرد کیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی تمام فوجی صلاحیتوں اور

تدبّر کو بروئے کار لاتے ہوئے ریاست کے شمالی علاقے کے نظم ونسق اور آزاد فوج کو ختم کرنے کے مسائل کا حل نکالنے کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا۔ جسے پاکستان نے نہایت فراخدلی سے منظور کر لیا۔ مگر بھارت نے اس میں بھی ایسی ایسی ترامیم کرنے کا مطالبہ کیا کہ جن کا منظور کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ لہذا بھارت کی طرف سے اس منصوبے میں بھی ترامیم کا مطالبہ کرنا، اس منصوبے کو نامنظور کرنے کے مترادف تھا۔

بعد ازاں مسئلہ کشمیر پر سلامتی کونسل پھر ایک طویل بحث ومباحثے میں مصروف ہوگئی۔ اور اس کے بعد ۱۴ر مارچ ۱۹۵۰ء کو سلامتی کونسل نے ایک نئی قرارداد منظور کی جس میں اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی ۱۳ر اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ر جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کی توثیق کی گئی۔ اور سلامتی کونسل کی اس قرارداد میں واضح کیا گیا کہ ریاست جموّں وکشمیر سے بلا تاخیر تمام غیر ملکی فوجوں کو نکالا جائے اور ریاست کے عوام کی آزادانہ وغیر جانبدارانہ رائے کے مطابق ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔ اس کے بعد سلامتی کونسل نے پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کو یہ بھی ہدایت کی کہ مذکورہ قرارداد کی منظوری سے پانچ ماہ تک یا اس سے پہلے دونوں ملک جنرل نوٹن کے پیش کردہ مسوّدہ تجاویز کے دوسرے پیراگراف میں وضع کردہ اصولوں کے تحت یا باہمی صلاح ومشورہ کے بعد اس میں ترمیم کرتے ہوئے ریاست جموّں وکشمیر سے اپنی اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔

سلامتی کونسل نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ کمیشن برائے ہندو پاکستان کی جگہ اقوام متحدہ کا ایک نمائندہ برصغیر میں بھیجا جائے۔ جو کہ پاکستان اور بھارت کو ریاست جموّں وکشمیر سے دونوں ملکوں کی فوجوں کے انخلاء کے لئے منصوبہ تیار کرنے اور اُسے عملی جامہ پہنانے میں مدد فراہم کر سکے۔ اقوام متحدہ

کہ اس نمائندے کو اس پر یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ریاست جموں و کشمیر سے متعلق تنازعہ الحاق کے تصفیہ کی خاطر پاکستانی اور بھارتی حکومتوں یا سلامتی کونسل کو بھی اپنی تجاویز پیش کر سکتا ہے۔ اقوام متحدہ کے یہ نمائندے آسٹریلیا کے مشہور ماہر قانون سر اوون ڈکسن تھے جنہیں ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ء کو اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کیا گیا۔ اور وہ ۲۰ مئی سنہ ۱۹۵۰ء کو برصغیر کے دورے پر یہاں پہنچ گئے۔

(۱۳)

۱۹۴۹-۵۰ء کے دوران سلامتی کونسل کی کارگزاری

جیسا کہ گذشتہ باب میں ذکر کیا جا چکا ہے، اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندو پاکستان اپنے اس تاریخی نصب العین کے حصول میں ناکام ہو گیا، اور کمیشن کے ارکان واپس جنیوا روانہ ہو گئے۔ جہاں وہ کافی عرصے تک سلامتی کونسل کے لئے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں مصروف رہے۔ رپورٹ میں ان مشکلات کا تفصیلی ذکر کیا گیا تھا جو ان کی کامیابی کی راہ میں حائل رہیں۔ اور اس میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ کمیشن کو توڑ کر اس کی بجائے کسی کو ثالث مقرر کیا جائے کیونکہ یہ کمیشن جس مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا اس میں کامیابی حاصل کرنا کمیشن کے لئے آسان نہیں تھا۔ کمیشن کے سامنے اپنی بھی کئی مشکلات تھیں اور مسئلہ کشمیر بذات خود ایک بہت پیچیدہ مسئلہ تھا۔ ایک طرف تو اس کی وجہ سے بھارتی حکومت کا وقار خطرے میں پڑتا تھا اور دوسری طرف پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا تھا۔ سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ بھارت ہر مرحلے پر غیر معقول رویہ اختیار کرتا تھا۔ خاص طور پر بھارتی حکومت کمیشن کی قرار دادوں کو ایسے معانی پہنانے کی کوشش کرتی تھی جسے خود کمیشن بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ اور کمیشن کے لئے کوئی ایسا راستہ باقی نہ رہا تھا کہ وہ اس اُلجھے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کی کوششیں جاری رکھ سکتا۔ چنانچہ کمیشن کو اپنی ناکامی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے برصغیر میں کام بند کرنا پڑا۔

مسئلہ کشمیر ۱۹۴۹ء کے آخر میں ایک مرتبہ پھر سلامتی کونسل کے سامنے پیش کیا گیا اور مجھے بھی حکومت آزاد کشمیر کے نمائندے کی حیثیت سے دوبارہ اقوام متحدہ کے مرکز لیک سکسیس جانا پڑا۔ جب میں نے ۱۹۴۸ء میں مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں دوسرے ملکوں کا دورہ کیا تھا۔ تو میرے راستے میں سب سے بڑی یہ رکاوٹ تھی کہ پاکستان سے باہر بہت کم لوگ مسئلہ کشمیر کے متعلق واقفیت رکھتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ دنیا بھر کے اخبارات کے لئے مسئلہ کشمیر ایک اہم موضوع بن چکا تھا۔ اور تمام دنیا کے عوام بھی اس مسئلے سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد ہم دوسرے ملکوں سے تعلقات بڑھانے اور وہاں کے عوام کو مسئلہ کشمیر کی اہمیت سے آگاہ کرنے کے لئے انجمن سازی کے کام میں مصروف تھے۔ اور ہماری اس جدوجہد سے تحریک آزادئ کشمیر کو بین الاقوامی سطح پر بہت تقویت حاصل ہوئی۔ ہم نے برطانیہ میں آزاد کشمیر لیگ کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کی شاخوں نے لندن کے علاوہ برمنگھم، لیڈز، نیوکیسل اور اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کا بھرپور پراپیگنڈا کیا۔ علاوہ ازیں مصر، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں بھی مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کے لئے اسی قسم کی تشہیری انجمنیں قائم کی گئیں۔ ان انجمنوں کی وجہ سے تحریک آزادئ کشمیر کو تمام دنیا سے نہ صرف اخلاقی تائید و حمایت بلکہ مالی امداد بھی ملنا شروع ہو گئی۔

سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے پاکستان سے امریکہ جاتے ہوئے میں نے واشنگٹن، لندن، نکوسیا، استنبول اور قاہرہ کا بھی دورہ کیا اور وہاں کی حکومتوں سے روابط بڑھانے اور مسئلہ کشمیر کے متعلق پاکستان کے مؤقف کی وضاحت کرنے کا فرض انجام دیا۔ مسئلہ کشمیر نے نہ صرف پاکستان اور بھارت کے لئے بلکہ عالمی امن کے لئے بھی خطرہ پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے ساری دنیا کے عوام اس مسئلے میں گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ اور چونکہ پاکستان اور بھارت دونوں ہی مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنا اپنا مؤقف صحیح ثابت کرنے

میں مصروف تھے اس لئے دنیا بھر کے عوام کے ذہنوں میں مسئلہ کشمیر کی اصلی نوعیت و کیفیت معلوم کرنے کے لئے تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ روس کے علاوہ تقریباً ہر ملک کے بڑے بڑے اخبارات مسئلہ کشمیر پر اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے۔ چنانچہ میں جس ملک میں بھی گیا میں نے وہاں کے اخباری نمائندوں کو اپنے بیانات سننے کے لئے گوش بر آواز پایا۔ ان تمام ممالک میں نے جہاں کہیں بھی اخباری نمائندوں سے خطاب کیا وہاں کے اکثر اخبارات کے نمائندوں نے میری پریس کانفرنس میں شرکت کی اور میرے خیالات کو اپنی اخبارات میں نمایاں جگہ دی۔

قاہرہ کے دورہ کے بعد میں لندن پہنچا جہاں ہوائی اڈے پر برطانیہ میں مقیم سینکڑوں کشمیری اور پاکستانی باشندوں نے میرا خیر مقدم کیا۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں برطانیہ میں مقیم کشمیری مسلمان تحریک آزادی کشمیر کی امداد کرنے کے لئے وہاں کئی انجمنیں قائم کر چکے تھے۔ اور برطانیہ میں اس تحریک کی مقبولیت کے لئے تہہ دل سے کام کر رہے تھے۔ اور آزاد کشمیر لیگ کے زیر اہتمام ہم نے لندن کے ہول بورن ہال میں ایک جلسہ عام بھی منعقد کیا۔ یہ اجلاس جس کی صدارت برطانوی پارلیمان کے رکن مسٹر ہیکٹ ہیگز نے کی نہایت کامیاب ثابت ہوا۔ اس اجلاس میں کشمیری اور پاکستانی باشندوں کے علاوہ افریقی اور دوسرے ممالک کے باشندوں نے بھی کثیر تعداد میں شرکت کی۔ راقم الحروف نے انگریزی میں سامعین سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر بالتفصیل روشنی ڈالی اور حاضرین کو آگاہ کیا کہ یہ مسئلہ نہ صرف برصغیر بلکہ امن عالم کے لئے بھی ایک مستقل خطرہ بنا ہوا ہے۔ میں نے اس نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کی کہ پاکستان ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان سے الحاق کا کیوں مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سامعین پر یہ بھی واضح کیا کہ پاکستان اور کشمیر دونوں معاشی و اقتصادی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ اس اجلاس کے اختتام پر مسٹر ہیگز نے مسئلہ کشمیر پر میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے اعتراف

گیا کہ اس مسئلے کے متعلق میں نے جو نکات بیان کئے ہیں اگر وہ حقیقت پر مبنی ہیں تو سلامتی کونسل میں بھارت کے مقابلے پر پاکستان کی کامیابی یقینی ہے۔

خوش قسمتی سے ان دنوں برطانیہ میں ہمارے لئے ماحول نہایت سازگار تھا۔ کیونکہ حال میں بھارت کے آنجہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو امریکہ سے واپس بھارت جاتے ہوئے لندن میں ٹھہرے تھے تو انہوں نے یہاں اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے متعلق نمائندوں کے سوالات پر سخت برہمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بھارتی وزیر اعظم نے تنازعہ کشمیر پر اپنی تنگ مزاجی کا اظہار کرتے ہوئے سنجیدگی کا دامن چھوڑ کر نہایت عدم تدبر اور اپنی بدذوقی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے پاکستان کے بارے میں اس موقعہ پر جو الفاظ استعمال کئے تھے انہیں کوئی بھی جائز نہیں قرار دے سکتا تھا اور کوئی باشعور انسان بھی کشمیر کے متعلق ان کے مؤقف کو درست نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس اخباری کانفرنس میں انہوں نے ایسی ایسی ناشائستہ باتیں کہیں جو اُن کی شخصیت اور ذمہ دارانہ عہدہ کے شایان شان نہ تھیں۔

میں نے قیام لندن اور دورہ برطانیہ کے دوران وہاں کے اخبارات سے رابطہ قائم کئے رکھا اور لندن ٹائمز کے مدیر برائے امور بیرونی ممالک پروفیسر "رشبروک ولیمز" سے بھی ملاقات کی جو بڑی اچھی طبیعت کے مالک ہیں۔ پروفیسر بروک مسئلہ کشمیر کے بارے میں مکمل معلومات رکھتے تھے اور مجھے ان کے ساتھ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیالات میں بہت لطف محسوس ہوا۔ جس میں مسٹر بروک نے اعتراف کیا کہ قضیہ کشمیر سے متعلق پاکستان کا مؤقف نہایت معقول اور درست ہے۔ ان کے علاوہ میں نے لندن کے کئی دوسرے اخبارات کے مدیروں سے بھی ملاقاتیں کیں جو جنوب مشرقی ایشیا کے حالات و کوائف پر گہری نظر رکھتے تھے اور اکثر و بیشتر ان ممالک کے مسائل پر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اور مجھے یہ معلوم کرکے بےحد مسرت محسوس ہوئی کہ برطانوی صحافی تنازعہ کشمیر کے متعلق حکومت پاکستان اور حکومت آزاد کشمیر کے مؤقف کو سمجھنے اور اس کی حمایت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بعض برطانوی صحافیوں

نے جن کا نام لکھنا میں مناسب نہیں سمجھتا، مجھ سے صاف الفاظ میں کہا کہ جب سے اس تنازعہ کی بنا پڑی ہے۔ بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اس معاملے میں نت نئے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ان صحافیوں نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ اگر اس مسئلے کو ریاست جموں وکشمیر کی اکثریتی آبادی کی بنیاد اور جغرافیائی و اقتصادی لحاظ سے اس کے پاکستان کے ساتھ رشتوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے ہونا ناگزیر ہے۔

برطانیہ اور دوسرے ممالک میں (جن کا میں نے دورہ کیا) جس بات نے وہاں کے باشعور عوام کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ تھی کہ بھارتی حکومت نے جوناگڑھ اور حیدرآباد کی ریاستوں کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کے متعلق جو موقف اختیار کیا تھا۔ وہ کشمیر کے بھارت سے الحاق کے متعلق بھارتی حکومت کے موقف سے بالکل الٹ تھا۔ اور ساری دنیا پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ بھارت چت بھی میری اور پٹ بھی میری کی دوغلی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ مگر برطانوی اخبارات کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ تنازعہ کشمیر کے متعلق بھارت کے مؤقف کی حمایت کے لئے کیا انداز اختیار کیا جائے۔ کیونکہ قضیۂ کشمیر کو بھارت نے خواہ مخواہ اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا اور پاکستان بھی اسے اپنی موت وحیات کا مسئلہ سمجھتا تھا۔ لہٰذا برطانوی اخبارات، پاکستان کے موقف کو قابل قدر سمجھنے کے باوجود اس معاملے میں کھل کر پاکستان کی حمایت کرنے سے معذور تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ دولتِ مشترکہ کے سربراہ کی حیثیت سے برطانیہ کو دولت مشترکہ کے دو رکن ممالک بھارت اور پاکستان کے مابین قضیہ کے سلسلہ میں غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ تاکہ برطانیہ دونوں رکن ممالک سے اپنے خوشگوار تعلقات برقرار رکھ سکے۔

میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا کہ اس مسئلے پر برطانیہ کو دولت مشترکہ کے سربراہ کی حیثیت سے کیا موقف اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن سلامتی کونسل سے واپسی پر میں نے لندن

میں برطانوی اور دوسرے ملکوں کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ سوال ضرور پیش کیا کہ ہمیں ایک ایسے ادارے یعنی دولت مشترکہ کی رکنیت اختیار کئے رکھنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جس کا سربراہ ادارے کے دو ارکان کے درمیان تنازعہ کے تصفیہ میں ہمیں امداد فراہم نہ کر سکے۔ میرے اس برجستہ سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ البتہ تمام نمائندوں کے لئے یہ سوال بڑی دلچسپی کا باعث بن گیا اور برطانوی اخبارات سے اس بات کی امید بھی نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ میرے اس سوال پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کریں گے۔ میں نے برطانیہ میں قیام کے دوران لندن، برمنگھم، ناٹنگھم، نیوکیسل اور لیڈز کا دورہ بھی کیا۔ اور ان مقامات پر کئی جلسوں سے خطاب کیا۔ جن میں بہت سے برطانوی باشندوں نے بھی شرکت کی اور برطانیہ کے چھوٹے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات میں، لندن کے اخبارات سے زیادہ تحریک آزادئ کشمیر سے متعلق خبروں کو جگہ ملتی رہی جس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کا دفتر خارجہ لندن کے اخبارات کو خارجہ مسائل سے متعلق برطانوی حکومت کی پالیسی کے بارے میں ہدایات جاری کرتا رہتا تھا۔ علاوہ ازیں لندن میں مقیم بھارتی سفارتی عملہ وہاں کے اخبارات میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مسئلہ کشمیر پر پاکستانی مؤقف کی حمایت نہ کرنے پر مجبور کرتا رہتا تھا۔ مگر برطانیہ کے دوسرے شہروں سے شائع ہونے والے اخبارات برطانوی حکومت کے دفتر خارجہ کی ہدایات اور بھارتی سفارت خانے کے دباؤ سے آزاد رہ کر اظہار خیال کر سکتے تھے۔ میں نے برمنگھم میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ شاہی ظلم و تشدد کے واقعات بتائے تو اکثر سامعین پر جو کشمیر سے تعلق رکھتے تھے رقت طاری ہو گئی۔ اور برطانیہ میں مقیم کشمیری مسلمانوں نے تحریک آزادئ کشمیر کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکن امداد ہمیں فراہم کی اور اس ضمن میں برطانیہ میں کام کرنے والی آزاد کشمیر لیگ کے سابق صدر سید فضل شاہ (مرحوم) کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لندن میں قیام کے دوران برطانوی نشری ادارے (بی۔بی سی) نے بھی مجھے مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی دعوت دی اور بی بی سی کے ایک مُدیر نے مجھ سے درخواست کی میں اپنی تقریر میں مسئلہ کشمیر کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کروں کہ کم از کم اس کے متنازعہ فیہ پہلو عوام پر روشن ہو جائیں لیکن میری اس ہدایت کے مطابق تقریر کرنے پر ہی بھارتی سفارت خانہ سیخ پا ہو گیا۔ اور بھارتی ہائی کمشنر نے بی۔بی سی سے اس سلسلے میں سخت احتجاج کیا۔ میں اس کے بعد جس ملک کے دورہ پر بھی گیا وہاں کے بھارتی سفارت خانوں کی جانب سے میرے دوروں پر بڑی تنگ مزاجی اور برہمی کا مظاہرہ کیا جاتا رہا۔ اور بھارت کے یہ سفیر مسئلہ کشمیر کے متعلق ہمارے مؤقف کی وضاحت کو ناکام بنانے کی سعی ناکام میں مصروف رہے۔

میں نیو یارک پہنچا تو سلامتی کونسل کا اجلاس شروع ہونے میں ابھی چند روز باقی تھے۔ علاوہ ازیں سلامتی کونسل کے مختلف اجلاسوں کے درمیان بھی اتنا وقت مل سکتا تھا کہ امریکہ کے اہم شہروں کا دورہ کیا جا سکے۔ لیکن امریکہ میں جلسہ منعقد کرنے کے لئے کافی دن پہلے تاریخ مقرر کر کے، انتظامات مکمل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بڑے پیمانہ پر جلسہ منعقد کروانے کے لئے مخصوص اداروں کے ذریعے جلسہ کی تشہیر کروانی بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے بوسٹن، فلیڈلفیا یونیورسٹی، واشنگٹن اور نیو یارک میں مسئلہ کشمیر پر اپنے موقف کے مطابق روشنی ڈالنے کے لئے محدود قسم کے جلسے منعقد کرنے کا انتظام کروایا۔ بوسٹن میں، میں نے دو مرتبہ طلباء کے جلسوں سے خطاب کیا۔ اور میں نے دیکھا کہ چند امریکی طلباء مسئلہ کشمیر کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے اور فلیڈلفیا یونیورسٹی میں، میں نے ایسے امریکی مضمون نگاروں سے بھی خطاب کیا جو امریکہ کے مختلف جرائد کے لئے مسئلہ کشمیر کے متعلق مضامین لکھ چکے تھے۔ لہذا میں نے ان مصنفین سے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے تبادلہ خیالات

کیا۔

پھر میں ایک ہفتہ کے لئے واشنگٹن کے دورہ پر گیا تو وہاں میں نے امریکی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی مسئلہ کشمیر کے بارے میں تقریریں کیں۔ امریکی ریاست "آریزونا" کے ایک مسلم لیگی رہنما مسٹر مبارک علی شاہ نے اس موقعہ پر ایک دعوت شبینہ کا بھی اہتمام کیا جس میں امریکی کانگریس (اسمبلی) کے ارکان بھی کافی تعداد میں موجود تھے۔ اور مجھے یہ پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ امریکی کانگریس کے ارکان کو واشنگٹن میں قیام کے دوران کسی اختلافی مسئلہ پر اپنا ہمنوا بنانا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے اس دعوت کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر اپنے نقطۂ نظر کی بڑھی تفصیل سے وضاحت کی۔ دعوت میں شریک امریکی کانگریس کے ارکان نے بھی مسئلہ کشمیر پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اور قابلِ ذکر بات یہاں یہ ہے کہ امریکی کانگریس کے ارکان کے لئے یہ بات بالکل نئی اور قابلِ توجہ تھی کہ وادیٔ جموں وکشمیر کی سرحد کے ایک طرف سامراج کے ایک طاقتور مخالف اشتراکی روس اور دوسری طرف مغربی سرمایہ پرست ممالک کے سب سے بڑے دشمن اشتراکی چین سے ملتی ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے منکشف ہوتے ہی دعوت میں شریک تمام امریکی ارکان نے مسئلہ کشمیر سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا۔ اور میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جس ذہنیت کا مظاہرہ یہ امریکی کانگریس کے ارکان کر رہے تھے۔ ہر امریکی باشندہ تقریباً اسی قسم کی ذہنیت کا مالک ہے دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی ممالک کے بلاک کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں آ گئی تھی اور اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ امریکہ نے یورپ کے بعض ملکوں کو کثیر مالی امداد بھی دی ہے۔ لہٰذا اہل امریکہ اپنے آپ کو بین الاقوامی سیاست سے کسی طرح بھی الگ تھلگ نہیں رکھنا چاہتے۔ بلکہ امریکہ روس کے مخالف تمام

ممالک کی قیادت کرنے کا دم بھی بھرتا ہے

واشنگٹن میں ہم نے کئی مقامات پر جلسوں سے خطاب کیا کیونکہ وہاں کئی ایسی انجمنیں اور کلب بھی موجود ہیں جو جنوب مشرقی ایشیا کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان انجمنوں اور کلبوں کے ارکان کی تعداد تو بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ لوگ ایشیائی سیاست کے متعلق مسائل سے واقفیت رکھنے کی کوشش ضرور کرتے۔ چنانچہ ان کلبوں اور انجمنوں کے ارکان سے مسئلہ کشمیر کے متعلق بات چیت کی نوبت میں یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اس سلسلے میں اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس مسئلے پر بھارت اور پاکستان کے درمیان تنازعہ موجود ہے۔ ان میں سے اکثر ارکان جنوبی ایشیا کے مسائل کے بارے میں گہری معلومات بھی رکھتے ہیں۔ کلبوں اور انجمنوں کے ان جلسوں میں پاکستان اور بھارت کے سفارتی افسر بھی شرکت کرتے تھے اور اکثر اوقات دونوں ملکوں کے سفارتی نمائندوں کے درمیان تنازعہ کشمیر کے متعلق گرما گرم بحث بھی چھڑ جاتی تھی۔

یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ بھارت امریکہ میں اپنا بہت زیادہ پراپیگنڈہ کرتا تھا۔ اور پاکستان کے ساتھ بھارت کے کشیدہ تعلقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ میں پاکستان کے خلاف نہایت خطرناک پراپیگنڈہ کیا جاتا تھا۔ ایک عام امریکی باشندہ پاکستان کے متعلق زیادہ معلومات نہ رکھتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کا سفارتی عملہ امریکہ میں پراپیگنڈے پر زور نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ بھارت کی جانب سے امریکہ میں جو زہر افشانی کی جاتی تھی، پاکستان کا سفارتی عملہ اس کا اثر زائل کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ دوست ممالک میں تشہیر کا کام بھی آسان نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کام کے لئے ایک تو کثیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری طرف تجربہ کار افراد درکار ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت پاکستان کے پاس نہ اتنی رقم تھی اور نہ اتنے تجربہ کار افسر موجود تھے۔ جو دوست ممالک میں پوری طرح پاکستان کی تشہیر کر سکتے۔ اس کے علاوہ بھارت اس لحاظ سے بھی پاکستان پر

ایک طرح سے سبقت رکھتا تھا کہ تمام دنیا بھارت کو مشترکہ ہندوستان کی حیثیت سے بخوبی جانتی تھی اور مہاتما گاندھی کے رجعت پسندانہ فلسفہ کے تعلق سے دنیا کے تمام ممالک بھارت کے نام سے بھی روشناس ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مہاتما گاندھی جی کے قتل کا حادثہ پیش آیا۔ تو تمام دنیا میں اس حادثے کی بھی بھرپور تشہیر کی گئی۔ ان حالات میں پاکستان کو بھارت کے مقابلے میں پیش کرنا آسان کام نہ تھا۔ پاکستان کے ہاتھ ایسے دو مواقع آئے جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے بارے میں دنیا کو متعارف کروایا۔ ان میں سے ایک موقع تو مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل کے سامنے پیش کرتے ہوئے پاکستان کو ملا اور دوسرا موقع اس وقت ہاتھ آیا جب اقوام متحدہ نے پاکستان کو اس بین الاقوامی ادارے کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کی دعوت دی۔

سلامتی کونسل کے اجلاس میں جنرل میک نوٹن سے درخواست کی گئی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کی کوشش کریں جس کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جا چکا ہے۔ جنرل میک نوٹن ان دنوں سلامتی کونسل کے صدر تھے۔ چنانچہ انہوں نے تصفیہ کشمیر کا اہم کام اپنے ذمہ لیتے ہوئے اس سلسلہ میں پہلے عبوری رپورٹ اور اس کے بعد مکمل رپورٹ تیار کر کے پیش کی۔ جنرل نوٹن کی یہ رپورٹیں ان اصولوں کی روشنی میں تیار کی گئی تھیں کہ جنہیں فریقین تسلیم کر چکے ہیں۔ ان اصولوں میں مرکزی حیثیت عوام کی آزادانہ رائے کے مطابق ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے تسلیم شدہ اصول کو حاصل تھی۔ جنرل میک نوٹن نے فریقین کے سامنے بات واضح کر دی تھی کہ وہ مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کے سلسلے میں جن اصولوں کو تسلیم کر چکے ہیں ان سے روگردانی نہ کریں۔ اور جو اختلافی مسائل باقی رہ گئے ہیں ان کے تصفیہ کی کوشش جاری رکھی جائے۔ جنرل میک نوٹن نے فنی نکتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے ریاست سے غیر ملکی فوجوں کے انخلاء کے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بحیثیت مجموعی غور کرنا شروع کر دیا۔ اور اس ضمن میں کمیشن کے تیار کردہ منصوبے میں کچھ ردّ و بدل بھی کیا۔ جب جنرل میک نوٹن بھی مسئلہ کشمیر کا تصفیہ کروانے میں کامیاب

نہ ہوئے تو یہ تنازعہ ایک مرتبہ پھر سلامتی کونسل کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس مرتبہ پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری سر محمد ظفر اللہ خان نے کونسل کو خطاب کرتے ہوئے کہا "جیسا کہ میں نے سلامتی کونسل کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس سے پیشتر بھی بتایا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں اب تک بھارت جو موقف اختیار کرتا رہا ہے۔ اس کے مطابق اگر کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کے فیصلے کا اختیار دیا جائے تو ریاست کا اکثریتی طبقہ ریاست کا پاکستان سے الحاق کے حق میں اپنی رائے ظاہر کرے گا۔

اس تقریر کے دوران پاکستان کے وزیر خارجہ نے اپنے مشتعل جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اس تنازعہ کا تصفیہ آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے ہی ہونا ضروری ہے۔ اور اس وقت کوئی نئی یا تازہ شرائط پیش کرنے کا سوال نہیں ہے بلکہ سوال صرف اس بات کا ہے کہ ان قرار دادوں پر عملدرآمد کیا جائے جنہیں فریقین اس سے پیشتر تسلیم کر چکے ہیں۔"

وزیر خارجہ پاکستان نے اپنی حکومت کی جانب سے سلامتی کونسل پر یہ بات بھی واضح کی کہ اس سلسلے میں ہر قسم کے بیرونی دباؤ کو ختم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے ضروری ہیں۔"

(۱) ریاست سے تمام بیرونی فوجیں فی الفور نکال لی جائیں۔

(۲) ریاست میں ایک غیر جانبدار حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔

(۳) رائے شماری کے نگران کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔

(۴) ریاست میں مکمل سیاسی آزادی کی ضمانت دی جائے۔

اس باب کے اختتام سے پیشتر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی ناکامیوں کے ساتھ ساتھ اس کی کامیابیوں کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ یہ کمیشن ریاست میں جنگ بندی کروانے اور ناظم رائے شماری کے تقرر کے سوال پر فریقین کے درمیان مصالحت

کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز کو ناظم رائے شماری مقرر کرنے کے سوال پر بھی فریقین کی رضامندی حاصل کر لی گئی ہے جو ہر لحاظ سے ناظم رائے شماری کا اہم عہدہ سنبھالنے کے اہل سمجھے جاتے ہیں۔ پھر جب کمیشن نے "تقضیہ کشمیر کے تصفیہ" کے لئے اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کرنے کی سفارش کی تو اسے سلامتی کونسل نے منظور کر لیا۔ جس کے بعد کمیشن کو ختم کر دیا گیا۔

(۱۴)

سراوون ڈکسن اور ڈاکٹر فرانک پی گراہم کے مشن!

آسٹریلوی ہائی کورٹ کے جج سراوون ڈکسن کو اقوام متحدہ کا نمائندہ منتخب کر کے برصغیر کا دورہ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ فیصلہ ۱۲ اپریل ۵۰ء کو کیا گیا اور سراوون ڈکسن ۲۷ مئی کو اپنے مشن پر برصغیر پہنچ گئے۔ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر فریقین کی رائے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے پاکستان اور بھارت کے نمائندوں اور کشمیری رہنماؤں سے کئی بار ملاقاتیں کیں اور مقبوضہ کشمیر کی صحیح صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے ریاست کے مقبوضہ حصے کا طویل دورہ کیا۔ فریقین کے نمائندوں کے طویل مذاکرات کے بعد سراوون ڈکسن نے پاکستان اور بھارت کے وزرائے اعظم کو بھی مسئلہ کشمیر پر بات چیت کرنے کی دعوت دی اور دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کے مذاکرات ۲۰ جولائی سے ۲۴ جولائی تک نئی دلی میں جاری رہے۔ جن میں سراوون ڈکسن نے بھی شمولیت کی لیکن یہ گفت و شنید بھی پہلے مذاکرات کی طرح بے نتیجہ ثابت ہوئے۔ حکومت پاکستان نے سراوون ڈکسن کی یہ تجویز مان لی کہ ریاست جموں و کشمیر سے بھارت اور پاکستان کی مسلح افواج واپس بلالی جائیں اور آزاد فوج کے ساتھ ساتھ مقبوضہ کشمیر کی ڈوگرہ فوج اور وہاں کی مسلح رضاکار تنظیمیں بھی توڑ دی جائیں۔ حکومت پاکستان تو آزاد کشمیر سے اپنی فوجوں کی واپسی کی تجویز

کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ تھی لیکن بھارتی حکومت یہ تجویز ماننے کے لئے تیار نہ ہوئی اور اُس نے ریاست سے اپنی تمام مسلح افواج نکالنے کی تجویز سے انکار کر دیا۔ حالانکہ سر ڈکسن اس سلسلے میں بھارت کو کچھ ایسی رعائتیں دینے پر بھی آمادہ تھے جو اس معاہدے کے دائرہ عمل سے خارج تھیں۔ مگر بھارتی حکومت کسی صورت میں بھی اس تجویز کو کامیاب بنانے پر رضامند نہ تھی۔ اور یہ بات ایک مرتبہ پھر واضح ہو گئی تھی کہ بھارتی حکومت مقبوضہ کشمیر سے اپنی مسلح افواج ہٹانے کو تیار نہیں تاکہ وہاں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کیلئے راہ ہموار ہو سکے۔ اس ضمن میں سر اوون ڈکسن نے اپنی رپوٹ میں لکھا ہے "ریاست سے بھارتی فوج کے انخلا پر بھارتی حکومت کی رضامندی حاصل کرنا کسی صورت میں بھی ممکن نہیں ہے۔ بھارتی حکومت ریاست میں ایسی فضا قائم کرنے کی اجازت دینے کو بھی تیار نہیں ہے کہ وہاں آزادانہ و منصفانہ رائے شماری کروائی جا سکے۔ اور وہاں کے عوام کو اپنی رائے کے آزادانہ اظہار سے روکنے کیلئے بھارت کو بیجا دباؤ ڈالنے کا موقع نہ مل سکے"۔

وزرائے اعظم کے درمیان مذاکرات کی ناکامی کے بعد یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ریاست سے غیر ملکی افواج کے انخلاء کے مسئلے پر پاکستان اور بھارت کے درمیان مصالحت نہیں ہو سکتی۔ اس مرحلے پر سر ڈکسن واپس جا کر اپنے مشن کی ناکامی کے متعلق رپورٹ دے سکتے تھے لیکن انہوں نے برصغیر میں اپنے قیام کی مدت میں اضافہ کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ اور کوئی ایسی راہ نکالنے کی کوشش میں لگے رہے کہ یہ مسئلہ ریاست میں رائے شماری کروائے بغیر ہی کسی طرح حل کروا لیا جا سکے۔ انہوں نے اس منصوبے کے کئی متبادل حل تلاش کئے جن میں سے ایک ریاست کی تقسیم کا بھی تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ریاست کے بعض علاقوں میں رائے شماری کروا لی جائے اور باقی حصے کو پاکستان اور بھارت کے درمیان تقسیم کرا دیا جائے۔

مگر بعد میں مسٹر ڈکسن نے ریاست کی تقسیم کی تجویز واپس لے لی۔ کیونکہ ایک تو بھارت ریاست کا کوئی حصہ بھی اپنے قبضہ سے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ تو دوسری طرف پاکستان بھی اپنا یہ مؤقف ترک کرنا نہیں چاہتا تھا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام کی رائے لئے بغیر کیا جائے۔

سر ڈکسن نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ وادیٔ کشمیر میں رائے شماری کروائی جائے اور ریاست کے باقی علاقے پاکستان اور بھارت کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں۔ تاہم انہوں نے اس بات کی وضاحت نہ کی کہ یہ تقسیم کن بنیادوں پر کی جائے۔ اور سر ڈکسن نے یہ بات بھی تسلیم کی کہ ریاست میں آزادانہ وغیر جانبدارانہ رائے شماری سے قبل مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں۔

(۱) جس علاقے میں رائے شماری کروائی جائے اُس کے انتظامات عارضی طور پر اقوام متحدہ کے نمائندہ ادارے کے سپرد کر دیئے جائیں۔

(۲) اقوام متحدہ کے اسی انتظامی ادارے کو ریاست سے ہر قسم کی فوج کے انخلاء کا اختیار ہونا چاہیئے۔ اور اگر ضرورت پیش آئے تو یہ ادارہ پاکستان اور بھارت کی مختصر فوج ریاست میں انتظامات کرنے کے لئے طلب کرنے کا مجاز ہو۔

(۳) ریاستی عوام کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار اور سیاسی قسم کے دیگر معاملات میں پاکستان اور بھارت کو مساوی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

حکومت پاکستان کا مؤقف یہ تھا کہ ریاست میں سلامتی کونسل کی قراردادوں اور کمیشن برائے ہندو پاکستان کی تجاویز کے مطابق غیر جانبدارانہ و آزادانہ رائے شماری کرواتے ہوئے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کیا جائے۔ اور حکومت پاکستان اس سلسلے میں کوئی نئی تجویز یا منصوبہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ اس کے باوجود حکومت پاکستان نے اس شرط پر سر ڈکسن کی تجویز پر غور کے لئے کانفرنس میں شرکت

کرنا منظور کرلی کہ بھارت ریاست میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کروانے کیلئے ایسے ضروری اقدامات کرنے پر رضامندی ظاہر کرے جن سے فضا سازگار ہو سکے۔

بھارتی حکومت نے جو مسٹر ڈکسن کی اس متبادل تجویز سے صرف خود ہی فائدہ اٹھا سکتی تھی، وہ تمام پیشگی اقدامات اختیار کرنے سے انکار کر دیا جو مسٹر ڈکسن نے تجویز کیے تھے۔ اقوام متحدہ کے نمائندے نے اس سلسلے میں اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ بھارتی وزیراعظم ریاست کے محدود علاقے میں رائے شماری کے منصوبے پر بھی اس صورت میں عمل کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کہ ان کی درج ذیل شرائط منظور کی جائیں۔

(۱) بھارتی فوج ریاست میں حسب سابق موجود رہے اور ریاست کا انتظام بھی اس کے ہاتھ میں رہے۔

(۲) شیخ عبداللہ کی حکومت اسی طرح برسر اقتدار رہے۔ اور

(۳) پاکستان کو رائے شماری کے علاقوں میں عمل دخل کی کوئی اجازت نہ دی جائے۔

آخر تمام دنیا کی طرح سراوون ڈکسن پر بھی یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ بھارت ریاستی عوام کو اپنی رائے کے آزادانہ اظہار کا موقعہ دینے پر بالکل آمادہ نہیں ہے۔ اور وہ اپنے مشن کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے برصغیر سے واپس روانہ ہو گئے۔ سر ڈکسن نے سلامتی کونسل کے سامنے اپنے مشن کی ناکامی کے بارے میں رپورٹ پیش کر دی جس میں ریاست کے الحاق کے قانونی اور دوسرے پہلوؤں کے متعلق ایسا انداز اختیار کیا گیا تھا جو ہم میں سے اکثر کے لئے حیران کن ثابت ہوا۔ پاکستان کے وزیر امور کشمیر نے پاکستان کی پارلیمنٹ میں مسئلہ کشمیر پر تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ ڈکسن کی رپورٹ پر مجھ سے قبل پارلیمنٹ کے ارکان نے جسطرح حیرانی کا اظہار کیا ہے مجھے بھی اس رپورٹ پر اسی طرح حیرانی ہوئی ہے کیونکہ ڈکسن نے اپنی رپورٹ میں سب سے پہلے تو یہ کہا ہے کہ وہ ان ہدایات پر عمل کرانے میں ناکام ثابت ہوا ہے جو سلامتی کونسل کی طرف سے انہیں ریاست جموں و کشمیر سے غیر ملکی

فوجوں کے انخلاء کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جاری کی گئی تھیں ۔ کیونکہ بھارت اِن کی تجویزکو ماننے کے لئے تیار نہ تھا جبکہ دوسری بات مسٹر ڈکسن نے یہ کہی ہے کہ انہوں نے بھارت کو مسئلہ کشمیر کا پُرامن حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں متبادل تجاویز بھی پیش کیں ۔ لیکن بھارت اِن تجاویز کو قبول کرنے پر بھی رضامند نہ ہُوا ۔ اور تیسری بات جو مسٹر ڈکسن نے اِس رپورٹ میں بیان کی یہ ہے کہ بھارت کی ہٹ دھرمی کے باعث سلامتی کونسل کو مسئلہ کشمیر حل کرنے کی کوشش کو ترک کرکے پاکستان اور بھارت کو اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کیلئے اپنے حال پہ چھوڑ دینا چاہئے ۔

اسی موقعہ پہ پاکستان کے وزیرامورکشمیر ایم اے گورمانی نے بھی پاکستان کی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا " سر ڈکسن نے سلامتی کونسل کے سامنے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ وہ پاکستان اور بھارت پہ زور دے کہ وہ خط متارکہ جنگ پر اپنی اپنی فوجوں کی تعداد کم کردیں ۔ اور جنگ بندی لائن پہ صرف اتنی ہی فوجیں رکھیں جتنی کہ امن کے زمانے میں سرحدوں پہ رکھی جاسکتی ہیں ۔ بالفاظ دیگر مسٹر ڈکسن یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کی حکومت کو زیادہ سے زیادہ محفوظ رہنے کا موقع فراہم کیا جائے اور ریاست کی دو تہائی آبادی کو شیخ عبداللہ کی کٹھ پتلی حکومت کے رحم وکرم پہ چھوڑ دیا جائے ۔ جو کشمیری عوام کو بغیر کسی خطا کے قید خانوں میں ٹھونسنے کی عادی بن چکی ہے ۔ بلکہ یہاں تو بھارت کے بارے میں وہی مثال صادق آتی ہے کہ جب مجرمانہ افعال اعدادوشمار کی حد سے بھی گزر جائیں تو یہی تبیح و مجرمانہ افعال معصومانہ افعال میں بلکہ شاندار کارناموں کی صورت میں بدل جاتے ہیں ۔ آپ ہی بتایئے کیا ہمیں اِس بات پر یقین کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا جا رہا کہ سلامتی کونسل اس صورت میں کوئی عملی اقدام کرنے پہ آمادہ ہو سکتی ہے کہ جب اِس کے کسی مستقل رکن ملک کا مفاد اور سلامتی پوری طرح خطرے میں پڑ گئی ہو ۔ سر ڈکسن نے یہ تجاویز پیش کرتے ہوئے غالباً اُن سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں اور خطرناک

صورت حال پہ نگاہ نہیں ڈالی اور نہ انہوں نے اس امر کا احساس کیا ہے کہ اسطرح وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کر کے ایک خطرناک خلیج پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی جگہ انہیں اقوام متحدہ کے نمائندہ کی حیثیت سے مقرر کیا گیا تھا۔ اور انہیں مسئلہ کشمیر کے محض ایک مصلحت کنندہ سے کہیں زیادہ اختیار حاصل تھے"۔

سلامتی کونسل کے سامنے سر اوون ڈکسن کی رپورٹ پیش کی جانے کے بعد ۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء کو سلامتی کونسل کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے اس بات کی سخت اور پُرزور مذمت کی گئی کہ ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کے تنازعہ کا فیصلہ کرنے کے لئے مقبوضہ کشمیر میں ایک نام نہاد قانون ساز اسمبلی قائم کر دی جائے۔ اس سے پہلے ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۰ء کو مقبوضہ کشمیر کی برسر اقتدار سیاسی جماعت "نیشنل کانفرنس" کی جنرل کونسل نے سفارش کی تھی کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے مقبوضہ کشمیر میں ایک قانون ساز اسمبلی کا قیام عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ سلامتی کونسل نے اپنی ۲۱ اپریل اور ۳ جون ۱۹۴۸ء اور ۱۴ مارچ ۱۹۵۰ء کی قراردادوں اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جون ۱۹۴۹ء کی قراردادوں ہی کی تصدیق کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کا قطعی اور آخری فیصلہ ریاست کے عوام ہی کریں گے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکے گا کہ ریاست میں جمہوری طریقہ سے اقوام متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کروائی جائے۔

سر اوون ڈکسن کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل امور پر فریقین کے درمیان اتفاق رائے نہ ہونے کے باعث کوئی معاہدہ نہیں ہو سکا۔

(۱)، ریاست میں رائے شماری کرانے سے پیشتر ریاست سے فوجوں کے انخلاء

کا طریق کار۔

(ب) ریاست میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کی ضمانت دینے کیلئے مقبوضہ کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت کے اختیارات میں کس حد تک کمی کی جا سکتی ہے آخر سلامتی کونسل نے جزوی طور پر سر اوون ڈکسن کا اس مشن سے استعفیٰ منظور کرتے ہوئے ایک اور شخص کو پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعہ کشمیر کا تصفیہ کروانے کیلئے مصالحت کنندہ مقرر کر دیا۔ جسے مندرجہ ذیل ہدایات دے کر برصغیر کے دورے پر روانہ کر دیا گیا۔

(ا) سلامتی کونسل اقوام متحدہ کے نمائندے کو برصغیر جانے کی ہدایت کرتی ہے۔ جہاں وہ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں سے مشورے کے بعد اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کے مطابق جموں و کشمیر سے بیرونی فوجوں کا انخلاء کروانے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنائے۔

(ب) پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ریاست سے تمام غیر ملکی فوجوں کا انخلاء عمل میں لانے کے سلسلے میں اقوام متحدہ کے مقرر کردہ نمائندے سے پورا تعاون کریں۔

(ج) اقوام متحدہ کے نمائندہ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ برصغیر پہنچنے کے بعد تین ماہ کے اندر سلامتی کونسل کو اپنی رپورٹ مرتب کر کے پیش کرے۔

سلامتی کونسل نے اپنی قرارداد کے ذریعے پاکستان اور بھارت کی حکومتوں کو یہ ہدایت بھی کی کہ تمام اختلافی امور پر اقوام متحدہ کے مصالحت کنندہ کی تجاویز کو تسلیم کریں۔

اس دفعہ سلامتی کونسل نے ڈاکٹر فرانک پی گراہم کو برصغیر ہند و پاکستان کیلئے اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کر کے انہیں ہدایت کی کہ ریاست سے غیر ملکی فوجوں کے انخلاء پر زیادہ سے زیادہ

توجہ دیں۔ اور ڈاکٹر گراہم نے سلامتی کونسل کی ہدایت پر سراوون ڈکسن کی جگہ ریاست جموں و کشمیر سے غیر ملکی افواج کے انخلاء اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے مطابق فریقین کے درمیان عارضی معاہدۂ صلح کروانے کا کام سنبھال لیا۔ ریاست سے غیر ملکی فوجوں کا انخلاء کروانے کے منصوبہ پر عمل درآمد کروانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ یہ کام پاکستان اور بھارت کے باہمی تعاون کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر فرانک گراہم نے اس ضمن میں جو کوششیں بھی کیں ان کی تفصیلات تو اس مختصر سی کتاب میں درج کرنا ممکن نہیں ہے۔ تاہم یہ بات اقوام متحدہ بھی پوری طرح تسلیم کر چکی ہے کہ ریاست سے غیر ملکی افواج کے مسئلہ انخلاء نے کشمیر کے تنازعہ کا تصفیہ کروانے کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں۔ ڈاکٹر گراہم نے سلامتی کونسل کے سامنے تین رپورٹیں پیش کیں۔ لیکن جہاں تک ریاست سے غیر ملکی افواج کے انخلاء کا تعلق ہے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کوئی قدم آگے نہ بڑھایا جا سکا۔ حالانکہ سلامتی کونسل اپنی کئی قراردادوں کے ذریعے پاکستان اور بھارت کو ہدایات جاری کر چکی ہے کہ وہ ریاست سے اپنی افواج کا انخلاء کرنے پر اپنے باہمی اختلافات ختم کر دیں تاکہ ریاست میں رائے شماری کا مرحلہ قریب آسکے۔ لیکن بھارت سلامتی کونسل کی یہ تمام قراردادیں یکے بعد دیگرے مسترد کرتا رہا۔

ڈاکٹر گراہم نے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں کو جنیوا میں بات چیت شروع کرنے کی بھی دعوت دی لیکن دونوں ملکوں کے درمیان یہ مذاکرات بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے، اور اس کے بعد ڈاکٹر گراہم نے سلامتی کونسل کے سامنے اپنی آخری رپورٹ پیش کر دی جس میں انہوں نے بھارت کی ہٹ دھرمی کو مسئلہ کشمیر کا حل تلاش کرنے کے سلسلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ اور ڈاکٹر گراہم کی یہ رپورٹ بھی مسئلہ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی ٹال مٹول کرنے اور الفاظ کے ہیر پھیر میں مطلب خبط کرنے کی اپنی

پرانی پالیسی کا زندہ ثبوت ہے جس پر کہ اقوام متحدہ شروع سے ہی کاربند رہی ہے۔

سلامتی کونسل نے ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان اور بھارت کو ہدایت کی کہ ڈاکٹر گراہم کی نگرانی میں اس مسئلے کے بارے میں فوری طور پر بات چیت شروع کر دی جائے کہ ریاست سے غیر ملکی افواج کے انخلاء کا کام مکمل ہو جانے کے بعد خطہ متارکۂ جنگ پر بھارتی اور آزاد کشمیر افواج کی کتنی کتنی تعداد رہنی چاہئے۔ قرارداد میں یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ خط متارکۂ جنگ کے اس طرف بھارت بارہ ہزار سے لے کر اٹھارہ ہزار تک اور خطِ متارکہ جنگ سے اس طرف آزاد کشمیر حکومت اپنی تین ہزار سے لے کر چھ ہزار تک فوج رکھنے کے مجاز ہیں۔ لیکن بھارت نے سلامتی کونسل کی یہ سفارش ماننے سے بھی صاف انکار کر دیا اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی بنیادوں پر جنیوا میں دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات شروع ہو گئے۔ حکومت پاکستان نے اس موقع پر یہ تجویز پیش کی کہ اگر یہ مذاکرات بھی ناکام ہو جائیں اور فریقین کے لئے ڈاکٹر گراہم کی پیش کردہ بارہ تجاویز پر غور کرنا ضروری ہو جائے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان سلامتی کونسل کی قرارداد مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کی بنیاد پر دوبارہ مذاکرات شروع کروائے جائیں۔ جس میں خطِ متارکۂ جنگ پر قیام کر سکنے والی بھارتی اور آزاد کشمیر افواج کی تعداد متعین کی گئی ہے۔ آخر کار جنیوا میں پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے درمیان اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے دوسرے حصّہ کی بنیاد پر مذاکرات شروع ہوئے۔ کمیشن کی اس قرارداد کے حصّہ اوّل پر عمل درآمد کیا جا چکا تھا۔ اور دوسرے حصّہ میں کہا گیا تھا کہ پاکستان اس صورت میں آزاد کشمیر سے اپنی فوج واپس بلا سکتا ہے کہ بھارت بھی مقبوضہ کشمیر سے اپنی فوج واپس بُلا لے۔ اس لئے لازم ہے کہ مسئلہ

کشمیر کے تصفیہ کی کوششوں کو آگے بڑھانے کے لئے دونوں ملک کمیشن کی ہدایات کے مطابق ریاست سے اپنی اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ جنیوا میں دونوں ملکوں کے درمیان بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھا بھی تھا کہ ڈاکٹر گراہم نے بات چیت میں مصروف پاکستانی وفد کو بتایا کہ بھارتی حکومت کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ راگست ۱۹۴۸ء کی روشنی میں مقبوضہ کشمیر سے اپنی فوج کی جتنی تعداد نکالنے پر رضامند ہے وہ اس قدر نہیں ہے کہ حکومت پاکستان کو اسے تسلیم کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جنیوا مذاکرات کی ناکامی کے بعد فریقین نے ڈاکٹر فرانک گراہم کے بھارتی منصوبہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بات چیت شروع کی لیکن اس بات چیت کے کامیاب ہونے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کیونکہ سابقہ مذاکرات سے ہی یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ بھارت صرف اپنے ڈھب اور مفاد کے مطابق ہی بات چیت کرنے کا عادی ہے اور ہمیشہ اپنی بات پر ہی اڑے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر گراہم کے اس مصالحتی منصوبہ کے بعض نکات سے سلامتی کونسل کی قرارداد مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کی بھی نفی ہوتی تھی۔

ڈاکٹر گراہم کے اس مصالحتی منصوبہ میں کہا گیا تھا کہ ریاست سے غیر ملکی افواج کا انخلا رعمل میں لانے کے آخری مرحلہ پر خطِ متارکہ جنگ پر رکھی جا سکنے والی فوجوں کی ایک بار تعداد کا تعین ہو جانے کے بعد بھارت کو خط متارکہ جنگ کے اس پار بھارت کی اکیس ہزار فوج اور اس طرف آزاد کشمیر کی چھ ہزار فوج رکھی جا سکے گی۔ مگر سلامتی کونسل کی قرارداد مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء میں خط متارکہ جنگ پر رکھی جا سکنے والی فوجوں کی ایک بار تعداد کا تعین ہو جانے کے بعد بھارت کو خط متارکہ جنگ پر اٹھارہ ہزار تک کی بجائے ۲۱ ہزار فوج رکھنے کی اجازت دینے کا کوئی جواز نہ پیدا ہوتا تھا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں خط متارکہ جنگ کے اسطرف آزاد فوج تین ہزار سے چھ ہزار

تک رکھنے کی اجازت تھی۔ اور بھارت کو آزاد فوج سے ساڑھے تین گنا زیادہ فوج رکھنے کی اجازت دینا کسی صورت میں بھی دانشمندی نہیں تھی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آزاد کشمیر کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوتا تھا بلکہ مصالحتی منصوبہ کے آٹھویں پیراگراف کی خلاف ورزی بھی ہوتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ریاست سے فوجوں کا انخلاء اس طرح کیا جائے کہ جنگ بندی کے معاہدہ کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہ ہونے پائے اور ڈاکٹر گراہم کی یہ تجویز ریاست سے فوجوں کا انخلاء کروانے کے دوران اور اس کے بعد بھی بھارت کو آزاد کشمیر کے خلاف جارحانہ کاروائی کرنے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ بلکہ اس طرح آزاد کشمیر کا علاقہ بھارتی جارحیت کے لئے بالکل غیر محفوظ ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور جیسا کہ حکومت پاکستان نے کہا تھا ڈاکٹر گراہم کی یہ تجویز منظور کر لینے کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان بھارت کی ہٹ دھرمی کے سامنے سر جھکاتا چلا جائے اور اگر پاکستان یہ تجویز مان لیتا تو اس کا یہ نتیجہ بھی نکلتا کہ پاکستان، بھارت کو اپنی ہٹ دھرمی کی پالیسی پر کاربند رہنے کی شہ دے رہا ہے۔

مختصر یہ کہ ان تمام کوششوں کے نتیجے میں بھی کشمیر کا تنازعہ آج تک ایک عقدۂ لاینحل بنا ہوا ہے۔ اور دنیا کے دوسرے مسئلے جتنی تیزی سے روشنی میں آ رہے ہیں تنازعہ کشمیر اسی رفتار سے پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ حکومت پاکستان اور پاکستان کے عوام کی توجہ بھی مسئلہ کشمیر سے زیادہ نہری پانی اور خوراک کے مسائل پر مرکوز ہو کر رہ گئی ہے اور پاکستانی عوام بھی اب رفتہ رفتہ اپنے مسائل کے مقابلے میں تصفیہ کشمیر کو ثانوی حیثیت دینے لگے ہیں۔ جو نہایت خطرناک رجحان ہے۔

جہاں تک بین المملکتی سطح پر دفاعی اور جنگی مفادات کا تعلق ہے مغربی بلاک امریکہ و برطانیہ کی سربراہی میں مشرق وسطےٰ کا دفاعی و جنگی ادارہ قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ اور پاکستان اس سلسلے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے مگر بھارتی حکومت پاکستان کے

اس دفاعی معاہدہ میں شمولیت سے بہت خوف و خطرہ محسوس کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ پاکستان کے اس اقدام سے بھارت کے استحکام اور اس کی آزادی کے لئے سخت خطرہ پیدا ہو جائے گا مگر پاکستان مسئلہ کشمیر، نہری پانی، خوراک کی کمی اور اپنی دفاعی ضروریات کے مسائل سے پیدا ہونے والے حالات کے پیشِ نظر اس دفاعی معاہدے میں شامل ہو سکتا ہے ——— لیکن اگر پاکستان اور بھارت کے رہنما اپنے تنازعات کا حل تلاش کرنے کیلئے سنجیدگی سے بات چیت شروع کر دیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اِس سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہو گا کہ سلامتی کونسل جس کے سر پر پاکستان اور بھارت کے اس اہم تنازعہ کا تصفیہ کروانے کا بوجھ آن پڑا ہے، اپنی ایک بڑی ذمہ داری سے نجات حاصل کر سکے گی۔

مگر اب امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے بھارت کے لئے کثیر فوجی امداد نے صورت حال بالکل بدل کر رکھ دی ہے۔ لہذا پاکستان اشتراکی ممالک روس، چیکوسلواکیہ اور خاص طور پر چین کی طرف سے اپنا دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے جبکہ دوسری طرف اب بھارت امریکہ سے مراسم بڑھا کر ملائشیا وغیرہ جیسے ممالک کی انڈونیشیا کے مقابلہ میں حمایت کر رہا ہے۔ اور پاکستان انڈونیشیا سے بھی اپنے گہرے دوستانہ تعلقات پیدا کر چکا ہے۔ لہذا موجودہ حالات میں جبکہ تمام دنیا کے حالات نہایت تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں بھارت اپنے بیشمار داخلی مسائل میں بھی گھرا ہوا ہے اور مستقبل قریب میں بھارت کا داخلی استحکام بھی ختم ہو کر وہاں افراتفری پھیل جانے کا خدشہ ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں لسانی جھگڑے نے نہایت سنگین صورت حال اختیار کر لی ہے سارا ملک خوراک کی شدید قلت کے باعث سخت غذائی بحران کا شکار رہے۔ یہ سارے حالات بھارت میں شدید خلفشار پیدا کرنے کا موجب بن رہے ہیں۔ اور اسی بات

کا بھی اندیشہ بڑھتا جارہا ہے کہ بھارت مختلف حصوں میں بٹ کر رہ جائے۔
تاہم بھارت کے مستقبل کے بارے میں کوئی واضح پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔
کیونکہ اس کی تاریخ شروع سے اب تک اسی قسم کے حالات و واقعات سے
بھری پڑی ہے۔

---

(۱۵)

وادیٔ کشمیر کے عوام اور اُن کی جدوجہدِ آزادی

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کو کامیاب بنانے کیلئے کشمیری عوام نے جو آلام و مصائب برداشت کئے اور جو قربانیاں پیش کیں انہیں کسی طرح بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ریاستِ جموں و کشمیر دو(۲) بڑے گنجان آباد خطوں پر مشتمل ہے۔ جن میں سے ایک کو وادیٔ کشمیر اور دوسرے کو ریاستِ جموّں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وادیٔ کشمیر شروع سے ہی ریاست کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی ہے۔ کیونکہ ریاست کا صدر مقام سری نگر وادیٔ کشمیر میں واقع ہے جو ریاست کا سب سے زیادہ زرخیز علاقہ ہے اور اسی کے نام پر پوری ریاست کو ریاستِ کشمیر کا نام دیا گیا ہے۔

ریاست کے ڈوگروں کو ریاستی فوج میں بالادستی کیونکر حاصل ہوئی؟ اس کی تحقیق کرنے میں ہمارے مؤرخین آج تک ناکام رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ریاستی فوج میں ڈوگروں کی بالادستی نے ریاستی مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں کو اقتدار سے محروم رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ برِصغیر کو آزادی ملنے سے پہلے تک کشمیر میں مسلمانوں کو اپنی ذاتی حفاظت کیلئے بھی اسلحہ رکھنے کی اجازت

نہ تھی۔ مگر کشمیر کے غیر مسلم باشندوں کو ڈوگرہ حکومت کے تعاون سے راشٹریہ سیوا سنگھ اور اسی قسم کی دوسری انتہا پسند جماعتیں قائم کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ چنانچہ جموں اور ریاست کے دوسرے شہروں میں اس قسم کی کئی جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ دوسری طرف ریاست کا اکثریتی طبقہ مسلمان تھا جو ایک مضبوط سیاسی جماعت بنانے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اور ریاست کے مسلمان خوفزدہ ہو کر ہندو دہشت پسند تنظیموں کی تیاریاں بھی خاموشی سے برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ برِ صغیر کی آزادی سے ذرا پہلے سری نگر میں مسلم کانفرنس کا جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق پاکستان سے کیا جائے۔ کشمیری مسلمانوں کی طرف سے تو ریاست کے پاکستان کیساتھ الحاق کی حمایت اتینی تھی ہی لیکن ریاست کے پنڈت پریم ناتھ بزاز جیسے فراخدل ہندو راہنماؤں کی جانب سے بھی ریاست کے پاکستان سے الحاق کے مطالبہ کی حمایت کرنے پر بھارتی حکومت اور بیرونی دنیا کی آنکھیں کھل جانی چاہئیے تھیں۔ نیز ریاست کے ایسے اخبارات نے بھی جن کی ادارت ریاست کے روشن دماغ ہندو کرتے تھے۔ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے آزادانہ وغیر جانبدارانہ رائے شماری کروانے کے مطالبہ کی ہی حمایت کی اور اس مطالبے کی حمایت میں ریاست کے اخبار "ہمدرد" اور "کشمیر ٹائمز" نے نمایاں حصہ لیا جن کے مدیر ریاست کے ہندو باشندے تھے۔ ریاست کے مشہور سوشلسٹ راہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز نے قیامِ پاکستان کے بعد ایک وفد لے کر نئی دہلی اور کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرنے کے لئے بھارت اور پاکستان کے

وزرائے اعظم سے ریاست میں رائے شماری کروانے کے سوال پر بات چیت کی جائے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ ریاستی باشندوں کا وفد لے کر روانہ ہوتے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ نگران کی گرفتاری سے ریاست میں رائے شماری کروانے کا مطالبہ اور زور پکڑ گیا۔ پنڈت بزاز کی جانب سے ریاست میں رائے شماری کروانے کا مطالبہ اور ان کی گرفتاری کے اقدامات بھارت کے اس دعوے کو جھٹلانے کیلئے کافی ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر بھارت کا ایک ضروری حصہ ہے، جبکہ بھارت اپنے اس جھوٹے اور بے بنیاد دعوے کو سچ ثابت کرنے کیلئے گزشتہ اٹھارہ سال کے دوران کروڑوں روپے صرف کرنے اور کشمیری مسلمانوں کی لاکھوں جانیں تلف کرنے کے باوجود بھی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں ناکام رہا ہے۔

کشمیری اخبارات کی طرف سے ریاست میں رائے شماری کروانے کا مطالبہ کرنے میں "کشمیر ٹائمز" نے نمایاں حصہ لیا۔ جس پر اخبار کے مالک مسٹر مہتہ اور مدیر مسٹر جے۔ کے ریڈی کو ریاست بدر کر کے ان کا پریس ضبط کر لیا گیا۔ ایک دوسرے اخبار "ملت" کے مدیر جو کشمیر ایڈیٹرز کانفرنس کے سیکرٹری بھی تھے اور سری نگر کے اخبار "اصلاح" کے مدیر کی گرفتاری کے احکام بھی جاری کر دیئے گئے۔ اور ریاست کے ان تمام صحافیوں کو جو پاکستان کے حامی تھے اس قدر پریشان کیا گیا کہ وہ اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار نہ کر سکیں لہذا وہ پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تاکہ یہاں رہ کر وہ اپنے نقطہ نظر کا نہایت آزادی سے اظہار کر سکیں۔ اور ریاست کے جن صحافیوں نے ترک وطن نہ کر کے ریاست میں ہی مقیم رہنے کا فیصلہ کیا انہیں اپنے اخبارات کی اشاعت بند کرنے اور ڈوگرہ شاہی کا انسانیت سوز سلوک برداشت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ریاست کے دوسرے تمام آزاد خیال اخبارات کو بھی یکے بعد دیگرے بند کر دیا گیا اور آج مقبوضہ کشمیر میں ایک بھی ایسا اخبار موجود نہیں ہے جو مسئلہ کشمیر پر

آزادی سے اپنے زاویۂ نگاہ کا اظہار کرسکے۔

ریاست میں بھارتی فوج کے داخل ہونے سے پہلے ریاست کی سیاسی فضا سخت کشیدہ ہو رہی تھی۔ سری نگر اور دوسرے اہم مقامات پر سیاسی اجتماعات کئے جا رہے تھے اور پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا مطالبہ کرنے کیلئے ہر جگہ احتجاجی جلوس نکالے جا رہے تھے۔ کشمیری راہنماؤں کے ایک وفد نے جس کی قیادت مولینا محمد یوسف شاہ کر رہے تھے۔ اس موقعہ پر ریاست کے وزیر اعظم راجہ جنگ سنگھ اور نائب وزیر اعظم ایل۔ آر بترا سے ملاقات کی اور انہیں آخری بار انتباہ کیا کہ "نیشنل کانفرنس" کے ہاتھ میں اقتدار دے کر ریاست کے بھارت کیساتھ الحاق کا راستہ ہموار کیا گیا۔ تو یہ اقدام ریاست کی تباہ کاری کا موجب بن جائے گا لیکن ڈوگرہ حکومت پر وفد کے اس بر وقت انتباہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اگرچہ ڈوگرہ حکومت نے اب تک واضح الفاظ میں ریاست کا بھارت سے الحاق کرنے کا اعلان نہ کیا تھا مگر ان کی سرگرمیاں اور ان کی پالیسی میں روزمرہ کی تبدیلیاں اس امر کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ وہ کس تباہ کن راستے پر گامزن ہیں۔ اگست ۴۷ء کے دوران مہاتما گاندھی کے دورۂ سری نگر اور مہاراجہ کے ساتھ ان کے طویل مذاکرات کے بعد سے ریاست کے حکام نے بھارتی وزارتِ امور داخلہ کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا تھا۔ اور ریاست کے وزیر اعظم رائے بہادر پنڈت رام چندر کاک کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ سے برطرفی بھی ریاستی حکومت کی پالیسی میں تبدیلی کی غماض تھی۔ کیونکہ پنڈت کاک ریاستی حکام اور بھارتی حکومت کے درمیان نئے گٹھ جوڑ کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ ریاست میں نئی وزارت کے قیام کے ساتھ ہی کشمیری عوام پر بھی ظلم و تشدد کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے جو ریاست کے پاکستان سے الحاق کا مطالبہ منوانے کیلئے ڈوگرہ شاہی کے ہتھکنڈوں کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے ریاست کے نئے وزیر اعظم راجہ جنگ سنگھ نے کشمیری

عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کرنا شروع کر دیا اور ان کے جلسے جلوسوں پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ریاستی حکام "نیشنل کانفرنس" کی پشت پناہی کر رہے تھے جسے مستقبل قریب میں ریاست کا بھارت سے الحاق کروانے کیلئے مہاراجہ ہری سنگھ کا آلۂ کار بننا تھا۔ جن دنوں ریاست کے دارالحکومت میں یہ سیاسی جوڑ توڑ ہو رہے تھے۔ پونچھ اور دوسرے ریاستی علاقوں میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے بھی شروع ہو گئے تھے۔ "نیشنل کانفرنس" کے انتشار پسند راہنما بخشی غلام محمد اور غلام صادق جنہیں ڈیڑھ سال پیشتر "کشمیر چھوڑ دو" کی مہم چلانے کے الزام میں ریاست بدر کیا گیا تھا دوبارہ ریاست میں آن دھمکے اور جب وہ ریاست میں داخل ہوئے تو وہی ڈوگرہ شاہی کے نمائندے جن کے خلاف بغاوت کے الزام میں انہیں ریاست سے باہر نکالا گیا تھا۔ ان کا پرتپاک استقبال کر رہے تھے۔

ریاست کی غیر جانبداری اور اس سے متعلق پاکستان اور بھارت کے ساتھ معاہدوں کے بلند بانگ نعروں کے باوجود ڈوگرہ حکومت اور "نیشنل کانفرنس" کا خفیہ گٹھ جوڑ زیادہ عرصے تک کشمیری مسلمانوں سے چھپا نہ رہ سکا کیونکہ انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ڈوگرہ حکومت ریاست کے مستقبل کے بارے میں خفیہ معاہدے کرنے میں مصروف ہے لہذا انہوں نے ڈوگرہ شاہی کی ان پوشیدہ سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی بھرپور جدوجہد شروع کر دی۔ کیونکہ اب وہ ریاست میں زیادہ عرصے تک ظالمانہ ہندو راج برداشت کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ تاہم بھارتی حکومت نے انہیں ان کی خواہشات کے خلاف ڈوگرہ شاہی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔

ریاست کے بھارت سے جبری الحاق کا اعلان کرنے سے پیشتر میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ اور مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر کو جوان دنوں قائد اعظم محمد علی جناح

سے ملاقات کیلئے کراچی گئے ہوئے تھے، ان کی عدم موجودگی میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر ایک ماہ کیلئے ریاست بدر کر دیا گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد ہی جب قبائلی عوام بھی ریاست کو اس خطرناک صورت حال سے بچانے کیلئے ریاست کی حدود میں داخل ہونے شروع ہوئے تو وہاں کے مسلمانوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ریاست بھر میں سیاسی سرگرمیاں اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئیں۔ مگر مہاراجہ نے ایک طرف تو بھارتی فوج کو ریاست میں داخل ہونے کی دعوت دیدی اور دوسری طرف شیخ عبداللہ کو آلۂ کار بنانے کی سرتوڑ کوشش کی جا رہی تھی تاکہ وہ اپنے سیاسی ہتھکنڈوں کے ذریعے ریاستی مسلمانوں کے اس سیلِ بیکراں کو روکنے کی کوشش کریں جو ڈوگرہ شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کیلئے بے قرار ہے۔ اس وقت ریاستی مسلمانوں نے جو پاکستان کے حامی تھے ایک مسلح مگر منظم جماعت "مسلم نیشنل گارڈز" کے نام سے قائم کر لی تھی جسے بعدازاں ڈوگرہ حکومت کے مسلح رضاکاروں نے نہایت بے رحمی سے کچل ڈالا۔

کشمیر کے غیر مسلّح اور فنِ حرب سے ناواقف مسلمان بھارتی و ڈوگرہ فوج اور انتہا پسند ہندو تنظیموں کے مسلح رضاکاروں کا کسی صورت میں بھی مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اور ان گئے گذرے حالات میں ریاست میں مسلح بغاوت شروع کرنے کا تو سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ لیکن ڈوگرہ شاہی کے خلاف کشمیری مسلمانوں میں نفرت و حقارت کا جذبہ اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ ڈوگرہ حکومت اپنے ظلم و تشدّد کے فاشسی ہتھکنڈوں سے ریاستی مسلمانوں کی آواز نہ دبا سکتی تھی۔ ریاستی مسلمانوں پر ڈوگرہ پولیس لاٹھی چارج اور فائرنگ کے حربے استعمال کرتی رہی۔ ریاست کے شہروں میں تحریک آزادی کو دبانے کیلئے کرفیو نافذ کیا جاتا رہا اور ڈوگرہ پولیس کے ظلم و ستم کی حد تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ سری نگر کی جامع مسجد میں مسلمانوں کے ایک پُرامن اجتماع

پر بھی گولی چلادی گئی جس سے متعدد مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے۔ لیکن ریاستی پولیس کی کشمیری مسلمانوں پر یہ زیادتیاں بھی محض ایک وقتی اثر رکھتی تھیں۔ اور کشمیری حریت پسندوں کے دلوں میں آزادی و خود مختاری کا جو فطری جذبہ ایک دفعہ جنم لے چکا تھا وہ ہزاروں مسلمانوں کی جانی قربانیوں کے باوجود آج بھی اسی طرح موجزن ہے۔

آج کی طرح تحریک آزادئ کشمیر کے اس ابتدائی دور میں بھی کشمیر کے ان فطری طور پر آزادی پسند مسلمان عوام کو مقبوضہ کشمیر کی کٹھ پتلی حکومت کے قید خانوں میں انسانیت سے بعید اور ناقابل برداشت مظالم برداشت کرنا پڑے۔ اگرچہ ریاست پر بھارتی تسلط سے پیشتر بھی ریاست کے قوم پرستوں کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا جاتا رہا ہے۔ مگر ریاست کی کٹھ پتلی بھارتی حکومت کے دور اقتدار میں تو اس کے ہاتھوں ریاستی عوام کو جیسی جیسی عبرتناک سزائیں اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑی ہیں، اس کا ذکر کرنے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ قوم پرست ریاستی عوام کو مقدمہ چلائے بغیر جیل خانوں میں ڈالے رکھنا کٹھ پتلی حکومت کا شروع سے ہی معمول بنا رہا ہے۔ مگر اپنے اس ابتدائی دور میں کٹھ پتلی ڈوگرہ حکومت نے ریاست میں امن وامان بحال رکھنے اور قانون کی حفاظت کرنے کی آڑ لے کر ہزاروں مسلمانوں بلکہ ریاست کے آزاد خیال غیر مسلم سیاسی راہنماؤں کو بھی قید کرنا شروع کر دیا۔ ان میں ریاست کے مسلمان راہنماؤں کے علاوہ غیر مسلم صحافی۔ وکیل۔ طلبار اور تاجر بھی شامل تھے، جن میں سے اکثر کو بعد میں قید سے رہا کر کے ریاست بدر بھی کر دیا گیا۔

ریاست کی انتہا پسند ہندو رضا کار جماعت جسے قومی ملیشیا کا نام دیا جاتا ہے اپنے ظلم و تشدد اور بربریت وحشت پسندانہ کارروائیوں میں ہٹلر کی نازی فوج سے

بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اس انتہا پسند مسلّح رضا کار جماعت میں ریاست کے وہ ہندو غنڈے شامل کئے گئے ہیں جو ریاست کا بھارت سے جبری الحاق کرنے سے پہلے بھی وہاں کے امن پسند مسلمان عوام اور رہنماؤں کیلئے ایک مستقل عذاب بنے ہوئے تھے ہندو غنڈوں کی یہ مسلح رضا کار تنظیم بھارتی فوج کو ریاست پر قبضہ کرنے میں مدد دینے کیلئے قائم کی گئی تھی اور ریاست کے جن علاقوں تک بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر بھارتی فوج نہیں پہنچ سکتی تھی وہاں ہندو غنڈوں کی اس دہشت پسند رضا کار تنظیم سے کام لیا جاتا تھا۔ اور اس دہشت پسند تنظیم کے ارکان کو ریاستی پولیس سے بھی زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ کیونکہ وہ جسے چاہتے بغیر کسی بھی حکمنامے کے گرفتار کر سکتے تھے اور جس مکان کی بھی چاہیں تلاشی لے سکتے تھے۔

ریاست کے مسلمان راہنماؤں یا عوام کی تو خیر حیثیت ہی کیا تھی، ریاست کے سابق وزیر اعظم رائے بہادر رام چندر کاک جیسے باحیثیت اور وفادار شخص کو بھی ہندو دہشت پسندوں کی اس تنظیم کے ارکان نے ایک مرتبہ پکڑ کر گھاس کی بٹی ہوئی رسیوں سے باندھ لیا اور انہیں سری نگر کی سڑکوں پر گھماتے پھرے۔ اسی طرح کئی دوسرے عزت مند شہریوں کو بھی پکڑ کر اور ان کے منہ کالے کر کے ان کا جلوس نکالا گیا۔ غرض کہ اس غنڈہ تنظیم کے رضا کار جس شریف شہری کو بھی گرفتار کرتے اسے حوالات میں بھیجنے سے پہلے پوری طرح ذلیل و خوار کیا جاتا اور اسے بے عزت کرنے کیلئے نہایت غیر انسانی طریقے استعمال کئے جاتے۔ اکثر سیاسی قیدیوں کو تو دُرّے مار مار کر بے ہوش کر دیا جاتا۔ مقبوضہ کشمیر کے اکثر قید خانوں میں سیاسی قیدیوں تک کو بھی بھوکا رکھا جاتا۔ اور کشمیر کے ایک مسلمان سیاسی راہنما غلام حسن بندہ نے تو مسلسل فاقہ کشی کے باعث وہیں جان دے دی تھی۔

مقبوضہ کشمیر کے قید خانوں میں "اے کلاس" کے قیدیوں کو بھی قلم دوات اور کاغذ

مہیا نہیں کیا جاتا تھا۔ اور نہ ہی کسی سیاسی قیدی کے خاندان کو مالی امداد فراہم کی جاتی تھی۔ درحقیقت مقبوضہ کشمیر کے یہ قید خانے ہٹلر کے دور میں قائم کئے گئے جرمنی کے بیگار کیمپوں سے بھی بدتر تھے۔ جن میں ہزاروں قیدیوں کو سال ہا سال کے لئے قید کر کے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور ان سیاسی قیدیوں کو جسمانی ایذا رسانیوں کے ساتھ ذہنی تکالیف بھی پہنچائی جاتی تھیں۔ چنانچہ جب قائداعظم نے وفات پائی تو کشمیر کے مسلمان سیاسی قیدیوں کو یہ خبر اس انداز میں سنائی گئی کہ قائداعظم انتقال کر گئے ہیں اس لئے اب پاکستان کا وجود زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ۱۹۴۸-۴۹ء کے دوران جو مسلمان سیاسی راہنما مقبوضہ کشمیر کے ان قید خانوں میں نظر بند تھے وہی اس امر کا اندازہ کر سکتے کہ قائداعظم کی وفات پر بھارتی حکام کے اس معاندانہ تبصرے سے ان ہزاروں مسلمان قیدیوں کے دلی جذبات و احساس کی کیا کیفیت ہو گی۔

جب کسی روپوش سیاسی راہنما کو گرفتار کرنے کیلئے مقبوضہ کشمیر کے مسلمان باشندوں کے گھروں کی تلاشی لی جاتی تھی تو سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں کو بھی بغیر کسی خطا کے طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی تھیں ـــ ایک دفعہ "مسلم کانفرنس" کی مہری نگر شاخ کے جنرل سیکرٹری جناب عبدالسلام دلال (مرحوم) زونی مار علاقہ میں روپوش ہو گئے۔ تو مقبوضہ کشمیر کی اس نام نہاد قومی ملیشیا کے رضاکاروں نے اس علاقے میں رہنے والے مسلمانوں کی خانہ تلاشی کیلئے علاقے کے تمام مسلمان باشندوں کو جن میں نوجوان خواتین معصوم بچے اور ضعیف العمر لوگ بھی شامل تھے۔ رات کے وقت یخ بستہ چشمے کے اندر کھڑا کئے رکھا۔ اسی طرح کسان مزدور کانفرنس کے صدر عبدالسلام یاتو نے آچابل کے علاقے میں پناہ لے رکھی تھی، تو ان دہشت پسند ہندو رضاکاروں نے وہاں کے سارے علاقے میں چھاپے مار کر بارہ افراد کو گرفتار کر لیا اور ایک

ہندو غنڈہ جے۔ این کا کہ تو رات بھر انہیں کوڑوں سے مارتا رہا۔ کیوں کہ ان دہشت پسندوں کو یہ شبہ تھا کہ عبدالسلام یاتو نے ان کے پاس پناہ لے رکھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر گاؤں کے ہندو غنڈے وہاں کے چوہدری بن بیٹھے تھے اور ان کی "نشدد پسند چودھراہٹ کو ریاست میں ایک انقلاب کا نام دیا جاتا تھا۔ پھر یہ مسلح ہندو رضا کار جس گاؤں میں بھی جاتے تھے وہاں کے باشندے مارے خوف وہراس کے گھروں میں چھپ جاتے تھے۔ کیونکہ امن پسند مسلمان عوام پر رعب ڈال کر انہیں لوٹنا اور مار پیٹ کرنا ان رضا کاروں کا معمول بن چکا تھا۔

مقبوضہ کشمیر کے نام نہاد قوم پرستوں اور حکمرانوں کو شروع شروع میں تو یہ بھی امید نہ تھی کہ وہ ریاست میں مضبوطی سے اپنے قدم جما سکیں گے بلکہ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ اپنے وقتی اقتدار سے فائدہ اٹھا کر کسی نہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر لی جائے۔ لہٰذا وہ ریاست کے دولت مند باشندوں سے قومی دفاعی فنڈ کے نام پر بھاری رقوم وصول کرتے رہتے تھے۔ خاص طور سے ضلع اننت ناگ میں تو ان نام نہاد قوم پرستوں نے دولت جمع کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔ اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دفاعی فنڈ کا کیا کیا جاتا تھا۔ مگر ان نام نہاد قوم پرستوں کو اس بہانے سے لوٹ مار کرنے کا موقع خوب ہاتھ آ گیا تھا۔ پھر ریاست کے مسلمان باشندوں پر بغیر کسی معقول وجہ کے تعزیری ٹیکس عائد کر دیئے جاتے تھے۔ غرضیکہ ریاستی مسلمانوں کو زدوکوب کرنے، لوٹنے اور اپنی طاقت کے زعم میں طرح طرح سے ڈرانے دھمکانے اور کچلنے کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان نام نہاد قوم پرستوں نے اس دور میں استعمال نہ کیا ہو۔

علاوہ ازیں ریاست کے جن علاقوں پر بھارتی فوج قابض تھی وہاں قتل و غارت گری کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار تو بھارتی فوج نے ان نام نہاد

قومی ملیشیا کے چند رضاکاروں کو بھی اپنی گولی کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا کیونکہ یہ قومی رضاکار مسلمان تھے۔ بھارتی فوج کے وحشیانہ مظالم کا سب سے بڑا مظاہرہ بارہ مولا اور اس کے نواحی علاقوں میں کیا گیا جہاں مسلمانوں کے سینکڑوں مکانوں سے ان کا مال واسباب لوٹ کر انہیں نذرِ آتش کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو نہایت بے رحمی سے گولیوں کا نشانہ بنایا گیا اور نوجوان مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے ان پر مجرمانہ حملوں کا ارتکاب کرنا تو بھارتی فوج کا معمول بن گیا تھا۔ اور مقبوضہ کشمیر کے شہروں اور دیہاتوں میں شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہوئے گھومنے والے بھارتی فوج کے ہندو اور سکھ نوجوانوں کے ہاتھوں کسی بھی مسلمان خاتون کی عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ جب ریاست کے کٹھ پتلی وزیرِاعظم کے سیکرٹری ڈی۔ پی دُہر کی ہدایت پر راشٹریہ سیوا سنگھ کے مسلح رضاکار دیری ناگ کے علاقہ میں بھیجے گئے تو انہوں نے یہاں پہنچ کر قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا کئی دن تک بازار گرم کئے رکھا اور ریاست کی کٹھ پتلی حکومت بیٹھی آرام سے تماشہ دیکھتی رہی۔

ریاست کی کٹھ پتلی حکومت کے ہاتھوں کشمیری مسلمانوں کو اس قدر جانی نقصان نہیں برداشت کرنا پڑا جس قدر کہ جسمانی اذیتیں اور مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے کیونکہ ریاست میں ایک عرصے تک سیّاحوں کی آمدورفت بھی بند رہی جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تقریباً ختم ہو کر رہ گیا۔ ریاست کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کے باعث ریاست کی زرعی پیداوار میں بھی کافی کمی واقع ہو گئی اور کشمیری مسلمان فاقہ کشی کا شکار ہونے لگے۔ پھر ڈوگرہ شاہی مظالم کے خلاف جنگ آزادی کے دوران بھی سارا عرصہ مسلمان کاشتکار اپنی زمین کاشت نہ کر سکے کیونکہ ریاست میں ہر جگہ مسلمانوں کے خون کی پیاسی ڈوگرہ اور بھارتی فوج ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔ علاوہ ازیں کشمیری مجاہدین کی جنگِ آزادی کے دوران ہی ریاست کی کٹھ پتلی حکومت نے جسے اپنا مستقبل غیر محفوظ نظر آتا تھا۔ پیش بندی کے طور پر ریاست

ہیں مکئی کی کاشت پر بھی پابندی لگا دی تھی کیونکہ اسے خوف تھا کہ آئندہ یہ مکئی کے کھیت بھی کشمیری اور قبائلی مجاہدین کو پناہ گاہوں کا کام دیں گے اور وہ ان میں چھپ کر اپنے مورچے قائم کرتے ہوئے حکومت کے خلاف اپنی جنگی سرگرمیوں کا سلسلہ بخوبی جاری رکھ سکیں گے۔ ان سب حالات کا بحیثیت مجموعی یہ نتیجہ نکلا کہ مقبوضہ کشمیر کے تمام علاقوں میں قحط کے آثار پیدا ہو گئے۔ اور اناج کی قیمتیں اس قدر بڑھ گئیں کہ کشمیری مسلمانوں نے اناج کی گرانی اور بے روزگاری سے تنگ آ کر آزاد کشمیر میں پناہ حاصل کرنا شروع کر دی۔

بھارتی فوجوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے ان راستوں میں بھی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی جن کے ذریعے ریاست میں تجارتی مال باہر سے لایا جاتا تھا۔ اور جو نئے راستے بنائے گئے تھے وہ اپنی دشوار گزاریوں اور طوالت کے باعث اس مقصد کیلئے ناکارہ ثابت ہوئے تھے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی اشیائے ضرورت کی قیمتیں وہاں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اور ذرائع آمد و رفت کے مسدود ہو جانے سے کشمیریوں کے تیار کردہ فن و ہنر اور دستکاریوں کے نادر نمونوں کی قیمتیں بھی منڈی میں بالکل گر گئیں۔ ریاست سے ہر قسم کے پھلوں۔ عمارتی لکڑی اور اسی قسم کی دوسری اشیاء کی برآمد بھی بند ہو گئی۔ اور ان اشیاء کی تجارت سے جن کشمیری مسلمانوں کا روزگار وابستہ تھا وہ فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے یہاں تک ہزاروں بے روزگار و ستم رسیدہ اور قحط زدہ کشمیری مسلمانوں کو ترک وطن کر کے آزاد کشمیر اور پاکستان کے علاقوں میں پناہ لینی پڑی علاوہ ازیں ریاست کے ہزاروں مسلمان طلبا، سیاسی کارکنوں اور تاجروں کو بھی بھارتی فوج اور اس کی مددگار انتہا پسند ہندو تنظیموں نے مظالم ڈھا کر مجبور کر دیا تھا کہ وہ سردی کے موسم میں برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کو عبور کر کے پاکستان یا آزاد کشمیر میں پناہ حاصل کریں۔

ریاست کی کٹھ پتلی حکومت نے ریاست سے باہر جانے والی مخصوص اشیاء کی تجارت

دوبارہ بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ مگر اب یہ بات کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ کشمیر کے مسلمان تاجر اب بھارت جاتے ہوئے شدید خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ جبکہ اس سے پیشتر بھارت کے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران انہیں بھارت کے شہروں میں ہزاروں کی تعداد میں بے دریغ قتل کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ کشمیر کے غریب مسلمان مزدور بھی اب بھارت کے شہروں میں جاتے ہوئے سخت خوف و ہراس محسوس کرتے ہیں کہ وہاں ان کی جانیں محفوظ نہ رہ سکیں گی۔ مزید برآں ریاست میں آمد و رفت کے تمام ذرائع اور نقل و حمل کے انتظامات بھی ابھی تک اچھی طرح درست نہیں ہو سکے ہیں اور غالباً اس وقت تک درست نہ ہو سکیں گے۔ جب تک کہ ریاست پر بھارتی حکمرانوں کا غاصبانہ قبضہ موجود ہے۔ پھر ریاست کی تمام اہم اشیائے درآمد و برآمد کی تجارت پر بھی اب بخشی غلام محمد، اس کے عزیز و اقارب اور حکومتی نوکر شاہی کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے اور جو لوگ پہلے ان اشیاء کی تجارت کرتے کرتے اس کام کے ماہر ہو گئے تھے انہیں ریاست کی تجارت سے نکال باہر پھینک دیا گیا ہے۔

کشمیر کے تجارت پیشہ افراد کی مفلوک الحالی اور ریاست کے تجارتی مال و اسباب کی نکاس کے فقدان نے ریاست کے ہر شعبہ کی اقتصادی حالت پر گہرا اثر ڈالا ہے اس پر ریاست کے غیر یقینی سیاسی حالات اور ریاست کی آمدنی میں کمی نے کشمیری عوام کے اقتصادی و معاشی حالات کو بد سے بدتر بنا دیا ہے۔ دوسری طرف مقبوضہ کشمیر کے نا عاقبت اندیش اور مفاد پرست نوکر شاہی حکام مستقبل کے خطرناک نتائج کا اندازہ لگائے بغیر مقبوضہ کشمیر کی مختصر سی آمدنی کو بے کار اور بے مقصد سیاسی و انتظامی محکموں پر صرف کرنے میں مشغول ہیں جبکہ ریاست کے کٹھ پتلی اور نوکر شاہی حکام عوام کے دکھ درد اور تکالیف سے بے پرواہ صرف اپنی عیاشیوں میں مگن رہتے ہیں اور جو نام نہاد قوم پرست راہنما اپنے آپ کو وطن کا محافظ، ملک کا راہنما اور

عوام کا خیر خواہ ظاہر کرتے ہیں۔ انہیں عوام کی خوشحالی و آسودگی سے کوئی سروکار نہیں اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ایک عام کشمیری باشندہ "نام نہاد سوراج" اور "نئے کشمیر" کے وجود میں آنے کے بعد آج کے مقابلے میں اس سے پہلے کہیں زیادہ خوش حال و آسودہ ہوا کرتا تھا۔

مقبوضہ کشمیر کی غذائی صورتِ حال بھی دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اور یہاں کے عوام یہ تمام آلام و مصائب صرف انہیں اپنی تحریک آزادی کا ایک لازمی حصہ سمجھ کر ہی برداشت کر رہے ہیں۔ جبکہ یہ ساری مصیبتیں ان پر ریاست کے بھارت سے جبری الحاق کے نتیجے میں نازل ہو رہی ہیں۔

ایک طرف تو "انجمن نصرتِ اسلام" جیسے تعلیمی ادارے بھی ریاست کی کٹھ پتلی حکومت کی مالی امداد سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جو ڈوگرہ راج کے دوران بھی مالی امداد حاصل کر کے کسی نہ کسی صورت جاری رہے ہیں۔ دوسری طرف تعلیمی میدان میں کشمیری مسلمان پہلے ہی پسماندہ تھے۔ مگر جب سے نام نہاد قوم پرستی کے ذریعے "ایک نیا کشمیر" وجود میں آیا ہے، ریاست کی کٹھ پتلی حکومت نے کشمیری مسلمانوں کو عام تعلیمی سہولتوں سے بھی محروم کر دیا ہے۔ اور دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں بھی کشمیری عوام کی پسماندگی ان کی ترقی اور خوش حالی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

"نئے کشمیر" کے عالمِ وجود میں آنے کے بعد ڈوگرہ شاہی کے ظلم و تشدد کے علاوہ نام نہاد قوم پرست حکومت کی بد دیانتی، خویش پروری اور مظالم میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور کٹھ پتلی حکومت اپنے ابتدائی دور سے اب تک مسلسل بدعنوانیوں کا مجسمہ بنی ہوئی ہے۔ جس کے ہر شعبہ میں انقلابی تبدیلیاں لانے کی اشد ضرورت ہے۔ کیونکہ مقبوضہ کشمیر میں ڈوگرہ راج سے لے کر اب تک ہمیشہ صرف

ایک ہی قانون کا سکہ چلتا رہا ہے۔ اور وہ ہے "لاقانونیت" یا "جنگل کے قانون" کا سکہ! اور اس کے خلاف کسی قسم کی صدائے احتجاج بلند کرنا بھی بے معنی سا ہوتا ہے کشمیری عوام نے شروع شروع میں گذشتہ بیس سال کی طویل جدوجہد کے بعد جو تھوڑی بہت سہولتیں، آزادیاں اور بنیادی حقوق حاصل کئے تھے کٹھ پتلی حکومتوں نے وہ سب کے سب بھی غصب کر لئے ہیں اور اب مقبوضہ کشمیر میں ایک ایسی آمرانہ حکومت قائم ہے جو اپنی سیاسی حکمت عملی کے خلاف ایک لفظ بھی عوام کی نقطہ چینی کا سننے کو تیار نہیں ہے۔ صرف ریاست کا محدود ہندو طبقہ ہی جو چند ہزار افراد سے زیادہ نہیں ریاست کے موجودہ سیاسی حالات اور سماجی صورت حال سے مطمئن ہو سکتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مخصوص طبقہ کو کٹھ پتلی حکومت کا اقتدار اعلےٰ ریاستی محکموں میں بڑی بڑی آسامیاں اور کئی قسم کے مالی فوائد حاصل ہو گئے ہیں جو اس سے پہلے ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ ریاست جموں و کشمیر میں ان تمام سیاسی و سماجی حالات کی تصدیق بھارت کے مؤقر اخبار "سٹیٹ مین" کے نمائندہ مقیم سری نگر کے ان قسط وار مضامین سے کی جا سکتی ہے۔ جو انہوں نے اس اخبار میں لکھے۔

درحقیقت کشمیر کی داستان آزادی، آہوں، کراہوں، آنسوؤں اور خاک و خون کے واقعات سے بھرپور ہے اور جب بھی مقبوضہ کشمیر میں کوئی سیاسی تبدیلی لانے کی جدوجہد شروع کی جاتی ہے۔ کشمیری عوام ان مظالم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں اس احتجاج کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ ایک دفعہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان کے ایک رکن نے بارہ مولا اور سری نگر کا دورہ کیا تو وہاں کے طلبا نے کٹھ پتلی حکومت کے حفاظتی اقدامات کے باوجود کمیشن کے رکن کو نہ صرف یادداشت پیش کی بلکہ ریاست میں کئی مقامات پر ریاست کے پاکستان

سے الحاق کے حق میں مظاہرے بھی کیئے گئے۔

بھارت اور اس کی کٹھ پتلی ریاستی حکومت کی طرف سے متواتر اپنی متشددانہ قوت استعمال کرنے اور کشمیری مسلمانوں کو کچلنے کی کوشش کے باوجود وادی کشمیر میں تحریک جنگِ آزادی کی وہ آگ جو کشمیری عوام کے سینوں میں بھڑک اٹھی تھی آج بھی اسی طرح فروزاں ہے، جس طرح کہ اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ اور ہمیں یقین ہے کہ جب بھی موقع آئے گا اور کشمیر کی تحریکِ آزادی کو از سرِ نو تیز تر کرنے کی ضرورت در پیش ہوگی تو کشمیری عوام ہمارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ مقبوضہ کشمیر میں وہاں کے سیاسی کارکنوں کو جب سے بم پھینکنے اور دوسری تخریبی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے الزام میں مقدمہ چلا کر سزائیں دی گئی ہیں، ان واقعات و حادثات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ کشمیری مسلمان اپنے وطن مالوف کی آزادی کیلئے جنگ بندی لائن کے اس طرف آباد مسلمانوں کو ان کی مشترکہ جنگ آزادی میں مدد فراہم کرنے کے لئے ہر ممکن قربانی پیش کر سکتے ہیں۔ غرضکہ کشمیری مسلمانوں نے ماضیٔ قریب میں اپنی کمزوریوں کے باوجود بھارتی اور ڈوگرہ شاہی ظلم و تشدد کا جس پامردی سے مقابلہ کیا ہے وہ یقیناً آنے والی نسلوں کے لئے بھی مشعلِ راہ ثابت ہوگا

اگست ۱۹۵۳ء میں جب ایک در پردہ سازش کے ذریعے شیخ عبداللہ کی کٹھ پتلی حکومت کا بھی تختہ الٹ دیا گیا تو ایک رات وہ گلمرگ کے ایک ہوٹل میں محوِ خواب تھے کہ سری نگر میں فوجی انقلاب آگیا اور پنڈت نہرو کے اس "محبوب و منظورِ نظر" کشمیری راہنما کو بڑے اہتمام کے ساتھ گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زنداں ڈال دیا گیا۔

شیخ عبداللہ کو اس وقت معزول کر کے قید کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریاست کا بھارت کے ساتھ جبری الحاق کرنے کے مسئلے پر پنڈت نہرو اور ان کے حامیوں

کی رائے سے اختلاف رکھنے لگے تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ شیخ عبداللہ پر بھی اب یہ بات بخوبی واضح ہو گئی تھی کہ رجعت پسند ہندوؤں اور کانگرسی حکمرانوں کے ساتھ مل کر حکومت کا کام کرنا اب ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ اس وقت تک بھارت کی عنانِ حکومت پنڈت جواہر لعل نہرو جیسے کانگرسی کے ہاتھ میں ہی تھی جو بڑی فراخدلی اور روشن دماغی کے مالک تصور کئے جاتے تھے۔ مگر پنڈت نہرو سے اختلاف رکھنے کے جرم میں ہی شیخ عبداللہ کو گذشتہ دس بارہ سال سے قید و بند کی سزائیں بھگتنا پڑ رہی ہیں۔ تاہم شیخ عبداللہ نے یہ طویل سزا بڑی جوانمردی اور عزم و استقلال سے برداشت کی اور کر رہے ہیں۔ اور وہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے مؤقف پر اب بھی قائم ہیں۔ اگرچہ انہیں اپنے اس مؤقف پر ڈٹے رہنے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنا پڑا۔ مگر کسی قسم کا لالچ بھی انہیں اپنے مؤقف سے روگردانی کرنے پر مائل نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ اس نکتے کو خوب سمجھ چکے ہیں کہ رائے شماری کشمیری عوام کا پیدائشی حق ہے۔ جس سے انہیں اب زیادہ عرصے تک کسی طرح بھی محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی کڑی سے کڑی سزا یا رسوا کن کارروائی شیخ عبداللہ کے پائے استقلال میں اب تک لغزش پیدا کر سکی ہے۔ اپنے اس مؤقف کی خاطر شیخ عبداللہ کے علاوہ ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی بارہ سال تک مسلسل تکالیف اور پریشانیاں برداشت کرنا پڑی ہیں اور آج بھی وہ طرح طرح کی مشکلات و مصائب میں گھرے ہوئے ہیں۔

مستقبل میں کشمیر کے مسلمہ راہنما کی حیثیت سے شیخ عبداللہ کی قیادت ایک بار پھر مستحکم ہو گئی ہے۔ اور کشمیر کی پوری جدّوجہد آزادی میں انہیں ایک ایسا بلند مقام حاصل ہو چکا ہے جو اب تک کوئی دوسرا کشمیری راہنما حاصل نہیں کر سکا۔ کشمیری عوام شیخ عبداللہ سے مستقبل میں بھی اپنی امیدیں وابستہ رکھنے

ہیں حق بجانب ہیں اور ان کے وہ دوسرے ساتھی بھی مستحق تحسین و تعریف ہیں جو آج بھی بھارتی حکمرانوں کی ناانصافیاں اور زیادتیاں برداشت کرتے ہوئے قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ اور ایسی ہی شخصیتوں کے کشمیری راہنما تحریک آزادی کشمیر کو کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرنے کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

(۱۶)

پاکستان کے ساتھ کشمیر کے رشتے

تنازعۂ کشمیر پیدا ہونے کے بعد پاکستان اور کشمیر کے درمیان سماجی، ثقافتی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی اور اقتصادی رشتوں کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کوریا اور ویٹ نام کا قضیّہ پیدا ہونے سے پیشتر کشمیر کا تنازعہ دنیا کا ایک اہم ترین تنازعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اور بین الاقوامی سیاست میں بھی اسے نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ نیز اقوام متحدہ کے زیر غور مسائل میں بھی تنازعۂ کشمیر ہمیشہ سرِ فہرست رہا ہے۔ اس کے علاوہ دولت مشترکہ بھی اس مسئلے کی طرف توجہ دیتی رہی ہے جو آج تک حل نہیں کیا جا سکا۔ اقوام متحدہ تنازعۂ کشمیر کو پُر امن اور جمہوری طریقے سے حل کرنے کی انتھک کوشش کر چکی ہے۔ لیکن جیسا کہ اقوام متحدہ کے نمائندہ کی رپورٹ میں اعتراف کیا گیا ہے۔ یہ بین الاقوامی ادارہ بھی ریاست جموں و کشمیر سے غیر ملکی فوجوں کا انخلاء عمل میں لا کر ریاست میں رائے شماری کروانے کا مسئلہ حل نہیں کر سکا۔ ریاست سے غیر ملکی افواج کے انخلاء کا مسئلہ تنازعہ کشمیر کے پر امن حل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اگرچہ اب اس بات کی ایک دفعہ پھر اُمید پیدا ہو گئی ہے کہ صدر پاکستان اور بھارتی وزیر اعظم باہمی بات چیت کے ذریعے دونوں ملکوں کے مابین تمام اہم مسائل کا حل تلاش کرنے کی دوبارہ کوشش کریں۔ ہمیں امید تو یہی رکھنی چاہیے اور ہماری خواہش بھی یہی ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات کا کوئی

پرامن حل نکل آئے۔ مگر سابقہ تجربات اس کی نفی کرتے ہیں۔ کیونکہ بھارت اور پاکستان اس وقت تک اچھے ہمسایوں کی طرح نہیں رہ سکتے۔ جب تک کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی ایسا حل نہ نکل آئے جو دونوں کے لئے تسلی بخش ہو۔ اگر مسئلہ کشمیر کا کوئی پرامن حل نہ نکل سکا تو یہ مسئلہ دونوں ممالک کے درمیان کسی نہ کسی وقت وسیع پیمانے پر جنگ چھڑ جانے کا موجب بن جائے گا۔ جس سے عالمی امن کے لئے بھی خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے ساتھ ریاست کے چالیس لاکھ باشندوں کا مستقبل وابستہ ہے۔ اور اگر اس قضیے کا کوئی حل مستقبل قریب میں بھی نہ ڈھونڈ نکالا گیا اور حالات کو بدستور بد سے بدتر ہونے کا موقع ملتا رہا تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کشمیر کے عوام کا پیمانۂ صبر لبریز ہو کر چھلک پڑے اور وہ بھارت کے اس غاصبانہ تسلط کے خلاف اپنے جذبات نفرت و حقارت سے مغلوب ہو کر آخر کار کوئی ایسا خطرناک اقدام کرنے پر مجبور ہو جائیں جس کا انجام نہایت ہولناک ہو۔ اس لئے اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرنے کے بعد اس کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جو مبنی بر حقائق ہونے کے علاوہ دنیا کی نگاہ میں اپنا منطقی جواز بھی رکھے۔

کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کو جائز قرار دینے کے لئے متعدد دلائل پیش کئے جا چکے ہیں جبکہ ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی جواز باقی نہیں ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے مہاراجہ کو جب ریاست پر اپنی حکمرانی کی امید باقی نہ رہی تو اُس نے ریاست کو اپنے ہاتھ سے جاتا دیکھ کر اُسے بھارت کے حوالے کر دیا۔ اور ریاست کے بھارت سے الحاق کی کاغذی کارروائی پر دستخط کر دیئے۔ جبکہ بھارتی فوج کے پاس ریاست میں مستقل قیام کے لئے کوئی اخلاقی اور قانونی جواز باقی نہیں ہے۔ اور یہ بات بلاوجہ نہیں ہے دنیا کے آزادی پسند ممالک مسئلہ کشمیر پر بھارتی پالیسی کی حمایت سے دست کش ہوتے جا رہے ہیں۔ اور انہوں نے کشمیری عوام کی کھل کر حمایت

کرنی شروع کر دی ہے جو اپنے حق خود ارادیت کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔

پاکستان اور کشمیر کے درمیان سب سے پہلا رشتہ تو دونوں خطوں کی قدرتی جغرافیائی حدود نے قائم کیا ہے ۔ اور جغرافیے کا ایک مبتدی بھی اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا ایک فطرتی جزو ہے جس کا الحاق پاکستان کے سوا کسی دوسرے ملک سے نہیں کیا جا سکتا ۔ ریاست کے شمال میں ہندوکش کا کوہستانی سلسلہ اور ریاست کے شمال مغرب کا پہاڑی علاقہ مغربی پاکستان اور ریاست جموں اور کشمیر کے درمیان مشترکہ طور پر پھیلے ہوئے ہیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پاکستان اور کشمیر ایک ہی ملک کے خطے ہیں ۔ پاکستان اور کشمیر کے درمیان اس قسم کی کوئی قدرتی حدِ فاصل موجود نہیں ہے جیسی کہ بھارت اور کشمیر کے درمیان واقع ہے ۔ نیز پاکستان اور کشمیر کے درمیان جو سرحدی خطوط کھینچے جاتے ہیں وہ قطعی طور پر غیر فطری اور انسانی ذہن کی اختراع ہیں ۔ کیونکہ بلحاظ آب و ہوا زراعت اور طبعی حالات وغیرہ سے یہ دونوں خطے آپس میں اتنی یکسانیت رکھتے ہیں کہ پہلے سے معلوم ہوئے بغیر ہی اگر کسی شخص کو پاکستان یا کشمیر کے ان جغرافیائی خطوں کے مشاہدے کا موقع دیا جائے تو وہ ان دونوں خطوں میں کوئی امتیاز نہ کر سکے گا ۔

وادیٔ کشمیر کے برف پوش پہاڑوں سے تین بڑے دریا راوی ، چناب اور جہلم نکل کر پاکستان کے میدانی علاقوں کو سیراب کرتے ہوئے دریائے سندھ میں جا گرتے ہیں ۔ یہ دریا پاکستان کے قدرتی آبی وسائل ہیں جبکہ دریائے سندھ ، راوی اور جہلم کشمیر کی وادیوں سے نکلنے والے ایسے دریا ہیں جو سرے سے بھارت کی سرزمین میں سے گزرتے ہی نہیں ۔ بھارتی حکومت ان دریاؤں کا پانی روک کر بھارت کی طرف لے جانے کے منصوبے تیار کرتی رہتی ہے ۔ اور بھارت اگر اپنے اس خطرناک منصوبے میں کامیاب ہو گیا تو اس سے مغربی پاکستان کی زراعت اور اس کا نظام آب رسانی

تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری سر ظفر اللہ خان نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں تنازعہ کشمیر کے مسئلے پر خطاب کرتے ہوئے پاکستان اور کشمیر کے باہمی تعلق پر مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی تھی۔

" سلامتی کونسل کے ارکان کو جو نقشہ تقسیم کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک کوہستانی سلسلہ کشمیر کو بھارت سے علیحدہ کر رہا ہے جس نے ریاست اور بھارت کی درمیانی سرحد کا احاطہ کر رکھا ہے۔ صرف پٹھان کوٹ کے قریب جو بھارت کی سرحد پر ریل گاڑیوں کا آخری اسٹیشن ہے اس کوہستانی سلسلہ کے درمیان ایک مختصر سا میدانی علاقہ واقع ہے جو بیس سے تیس میل تک چوڑا ہے اور اس کے بعد ریاست جموں و کشمیر کی سرحد پر پہاڑیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے ان میں سے اکثر پہاڑ بہت بلند ہیں جنہیں عبور کر کے ریاست کی حدود میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ ریاست کشمیر اور بھارت کو آپس میں ملانے والی ہر سڑک اس بیس سے تیس میل تک لمبے چوڑے میدانی علاقے سے گزر کر جاتی ہے۔ اور اس کوہستانی سلسلہ کی موجودگی میں بھارت کو اس بات کا خوف نہیں ہونا چاہئے کہ بھارت کے خلاف کشمیر کی جانب سے جارحانہ کارروائی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس مختصر سے میدانی علاقے کے علاوہ بھارت اور ریاست جموں و کشمیر کے درمیان آمدورفت کا اور کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔"

چوہدری سر ظفر اللہ خان نے مزید کہا کہ جہاں تک پاکستان اور ریاست جموں و کشمیر کی سرحدی صورت حال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے بالکل برعکس ہو جاتا ہے۔ اگر پاکستان اور ریاست جموں و کشمیر کے درمیان سرحدی صورت

حال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان سرحدی خط زیادہ تر میدانی علاقہ سے گزرتا ہے۔ اور وادیٔ کشمیر کے پہاڑوں سے تین دریا نکل کر دونوں کی سرحد سے گزرتے ہوئے مغربی پاکستان کے میدانی علاقوں میں داخل ہوتے ہیں۔ —— پاکستان اور ریاست جموّں وکشمیر کے درمیان مواصلاتی نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے چوہدری ظفراللہ خاں نے بتایا کہ پاکستان سے ریاست کے جغرافیائی رشتوں کے بعد پاکستان اور ریاست جموّں و کشمیر کے درمیان ذرائع مواصلات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ کسی خطے میں آمدورفت کے انتظامات بھی جغرافیائی محلّ وقوع کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر ہی کئے جاتے ہیں۔ اور برِصغیر کی تقسیم سے پیشتر کشمیر کو جانے والی تینوں بڑی سڑکیں بھی پاکستان سے گزر کر ہی جاتی تھیں۔ مگر برصغیر کی تقسیم کے بعد جب بھارتی فوجیں ریاست جموّں وکشمیر میں داخل ہوئیں تو پٹھان کوٹ کو پہلی بار سڑک کے ذریعے ریاست کی دارالحکومت سری نگر سے ملایا گیا۔ اور یہ سڑک بھی تقریباً نو ہزار فٹ بلند درّہ بانہال سے گزر کر جاتی ہے جو سال میں تین چار ماہ تک برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ ریاست میں ایک مختصر سی ریلوے لائن بھی ہے جو جموّں سے پاکستان کے سرحدی شہر سیالکوٹ سے ہوتی ہوئی مغربی پاکستان کی طرف آتی ہے۔ علاوہ ازیں وادیٔ کشمیر سے نکلنے والے تینوں بڑے دریا مغربی پاکستان کے میدانی علاقوں کو سیراب کرتے ہیں۔ لہٰذا ریاست کا جغرافیائی محل وقوع اور مواصلاتی نظام یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ ریاست کا قدرتی الحاق بھارت سے نہیں بلکہ پاکستان سے ہی ہو سکتا ہے۔

پاکستان اور ریاست جموں وکشمیر کی مشترکہ سرحد کئی سو میل لمبی ہے جبکہ بھارت اور ریاست کے درمیان یہ مشترکہ سرحد بیس پچیس میل سے زیادہ لمبی نہیں ہے۔ بلکہ صرف پٹھانکوٹ کے قریب ایک پہاڑی سلسلہ بھارت اور ریاست جموّں وکشمیر کے درمیان سرحد قائم کرتا ہے اور ریاست جموّں وکشمیر اور بھارت کے درمیان کا سرحدی علاقہ بھی ریڈکلف کے جانبدارانہ فیصلہ کی نظرِ عنایت سے پاکستان کی بجائے بھارت کا علاقہ قرار دیا گیا ہے۔

اگرچہ بھارتی حکومت ریاست جموں وکشمیر پر اپنا غاصبانہ قبضہ قائم رکھنے کے لئے بھارت اور ریاست کے درمیان غیرفطری مواصلاتی نظام قائم کرنے کی کوششوں میں کثیر رقم صرف کر چکی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ بھارت وادیٔ جموں وکشمیر کے درمیان مواصلات کا یہ غیرفطری نظام موسمی حالات اور بارشوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے ——— اور متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے نے بھی یہ بات صاف الفاظ میں کہہ دی تھی کہ جب برصغیر کی کسی ریاست کا سربراہ اپنی ریاست کا بھارت یا پاکستان سے الحاق کرنے کا فیصلہ کرے تو ضروری ہے کہ اس ضمن میں اپنی ریاست کے جغرافیائی محل وقوع اور قدرتی تقسیم کے تقاضوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

زمانہ قبل از تاریخ سے ہی کشمیر اور برصغیر کے ان علاقوں کے درمیان جو اب پاکستان کہلاتے ہیں نہایت مستحکم اقتصادی ومعاشی رشتے بھی قائم تھے۔ ساری ریاست میں صرف دو ہی پختہ سڑکیں بانہال روڈ اور جہلم روڈ تھیں جو ریاست کو بیرونی دنیا سے ملاتی تھیں۔ اور یہ دونوں سڑکیں ریاست سے نکل کر صرف پاکستان میں داخل ہوتی ہیں۔ مگر ان کے مقابلے میں بھارت نے جو کٹھوعہ، پٹھان کوٹ ۱۹۴۷ء میں تعمیر کی تھی سال میں صرف چھ ماہ کے لئے کھلی رہتی ہے۔ کیونکہ یہ درہ بانہال کے برفانی کوہستانی علاقے سے گزرتی ہے۔ اور جہاں تک وادی جموں وکشمیر کے ذرائع آمد ورفت اور نقل وحمل کی ضرورت کا تعلق ہے، کٹھوعہ، پٹھانکوٹ روڈ وادی کو بیرونی دنیا سے ملانے والی مذکورہ بالا دو اہم سڑکوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی۔ جو ریاست کو پاکستان سے ملاتی ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل انہی دو سڑکوں اور جموں سے سیالکوٹ تک آنے والی ریلوے لائن پر ریاست کی تجارت اور صنعت وحرفت کا انحصار تھا۔ لہٰذا جب سے بھارت نے ریاست کے بڑے حصہ پر جبری قبضہ جمایا ہے ان سڑکوں اور ریلوے لائن کے بند ہو جانے سے ریاست کی تجارت کو ایسا زبردست دھچکا لگا ہے کہ وہ ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور گذشتہ ۱۵ سال کے دوران ریاست کی تجارت ایک دن کے لئے بھی پہلی سطح پر بحال نہیں

ہو سکی۔

ریاست پر بھارت کے غاصبانہ تسلط سے پیشتر کشمیری تاجران سڑکوں کے راستے ریاست کا خام ریشم، تازہ پھل، خشک میوے، اون، سونے چاندی کے تاروں سے کڑھے ہوئے قیمتی پارچات، جڑی بوٹیاں اور کئی دوسری اشیائے خوردنی برآمد کرتے تھے۔ اور ان کے بدلے دوسری اشیائے ضرورت درآمد کرتے تھے۔ مگر جب سے بھارت نے ریاست پر جابرانہ قبضہ کیا ہے ریاست کی تازہ پھلوں کی تجارت بالکل تباہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ کٹھوعہ، پٹھانکوٹ روڈ کے ذریعے تازہ پھلوں اور سبزیوں کی تجارت ناممکن ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وادیٔ کشمیر تک جانے والی یہ سڑک اس قدر طویل ہے کہ اس راستے سے باہر بھیجے جانے والے پھل اور سبزیاں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی خراب ہو جاتی ہیں۔ اور اگر طویل راستے سے وادیٔ کشمیر کے تازہ پھل اور سبزیاں بھارت کے شہروں میں پہنچ بھی سکیں تو بھارت میں ان چیزوں کی بہت کم کھپت ہے۔ اس کے علاوہ کشمیری باشندوں کی ایک بڑی تعداد باغبانی کے ذریعہ بھی اپنی روزی پیدا کرتی ہے۔ اگر ریاست کا پاکستان سے الحاق کر دیا جاتا تو کشمیری باشندوں کے اس فنِ باغبانی کو بھی بہت تقویت حاصل ہو سکتی تھی۔ لیکن کشمیری عوام کی خواہشات کے خلاف اگر بھارت نے ریاست پر اسی طرح اپنا غاصبانہ قبضہ جمائے رکھا تو مواصلات کے انتظامات ناقص ہونے کی وجہ سے وادیٔ کشمیر کی اس مخصوص پیداوار کی تجارت بھی مستقبل میں بالکل تباہ ہو جائے گی۔

ریاست پر بھارت کے جبری قبضہ کے بعد سے کر اب تک کٹھ پتلی ریاستی حکومت کے مالیہ میں پچاس فیصدی کمی واقع ہو چکی ہے۔ جو اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے کہ ریاست جموں و کشمیر بھارت کا حصہ نہیں بلکہ اس کے برعکس پاکستان کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے ریاست سے لاکھوں روپے کی عمارتی لکڑی برآمد کی جاتی تھی۔ مگر یہ عمارتی لکڑی چونکہ دریاؤں کے ذریعے ریاست سے باہر بھیجی جاتی تھی اور وادیٔ کشمیر سے

نکلنے والے تینوں بڑے دریا اب پاکستان سے گزرتے ہیں لہٰذا تنازعہ کشمیر پیدا ہونے کے بعد ریاست کے بھارت سے غیرفطری الحاق اور بھارت کو مقبوضہ کشمیر سے ملانے کے لئے سیف قدرتی ذرائع مواصلات کی وجہ سے ریاست کی مخصوص تجارتی اشیاء کی برآمدی تجارت بالکل ختم ہو گئی ہے کیونکہ بھارت کے نئے بنائے ہوئے راستے ریاست کو ان منڈیوں سے نہیں ملاتے جہاں ان اشیاء کی کھپت ہو سکے۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ریاست کا تجارت کا پیشہ طبقہ مکمل تباہی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان کے وزیر خارجہ جناب چوہدری سر محمد ظفراللہ خاں نے سلامتی کونسل سے خطاب کرتے ہوئے ان مسائل پر اس طرح روشنی ڈالی تھی :

" آیئے : اب ریاست کے اقتصادی و معاشی پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیں ۔ ریاست کی آمدنی کے ذرائع اور اس کی برآمدی تجارت میں عمارتی لکڑی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ عمارتی لکڑی کے درختوں کی گیلیاں پہاڑوں اور جنگلوں سے کاٹ کر چشموں اور دریاؤں میں ڈال دی جاتی ہیں ۔ اور پھر ان چشموں اور دریاؤں کے راستے یہ لکڑی پاکستان میں لائی جاتی رہی ہے ۔ وادیٔ کشمیر کی عمارتی لکڑی کی منڈیوں میں سے دو بڑی منڈیاں دریائے جہلم کے کنارے جہلم اور دریائے چناب کے کنارے وزیر آباد کے شہروں میں ہیں۔ وزیر آباد سیالکوٹ کے بعد دوسرا ابتدائی شہر ہے جبکہ جہلم شہر دریائے جہلم کے کنارے اس مقام پہ واقع ہے ۔ جہاں دریائے جہلم راولپنڈی اور وزیر آباد کے درمیان سڑک اور ریلوے لائن کو منقطع کرتا ہے ۔ غرضیکہ ریاست کی تمام تر عمارتی لکڑی پاکستان کے راستے ریاست سے باہر جاتی تھی ۔ اور پاکستان میں ہی اس کا تمام لین دین اور فروخت کی جاتی تھی ۔ کشمیر کی عمارتی لکڑی کو ریاست سے باہر لے جانے کے لئے نہ پہلے کوئی اور راستہ تھا اور نہ اب ہے ۔ اور سلامتی کونسل اس بات کی صحت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگا سکتی ہے کہ ریاستی حکومت کے مالیہ کا بیس۲۰ پچیس فی صد حصہ عمارتی لکڑی کی تجارت سے

حاصل کیا جاتا تھا۔"

کشمیر سے دوسری اشیائے تجارت کی برآمد کا ذکر کرتے ہوئے سر ظفر اللہ خان نے کہا کہ یہی صورت حال کشمیر کے تازہ پھلوں اور سبزیوں کی برآمدی تجارت کی بھی ہے۔ جن کے لئے سیالکوٹ اور راولپنڈی کی منڈیاں قریب ترین منڈیاں تھیں ——— جو چیز پاکستان اور کشمیر کے درمیان مضبوط ترین اقتصادی رشتہ قائم کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کشمیر سے نکلنے والے تینوں بڑے دریا مغربی پاکستان کے علاقوں سے گزرتے ہیں۔ جن پر مغربی پاکستان کے نظام آبکاری کا انحصار ہے۔ اور اس طرح یہ دریا مغربی پاکستان کے کم از کم نوے فیصد باشندوں کی زرعی خوش حالی کے ضامن بنے ہوئے ہیں۔ چوہدری سر ظفر اللہ خان نے ۱۹۵۱ء میں سلامتی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مسئلہ کشمیر کے اسی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی تھی۔

"پاکستان اور ریاست جموں و کشمیر کے درمیان ایک اور تعلق کو جسے پاکستان اور ریاست کے درمیان دوسرے تمام رشتوں پر فوقیت حاصل ہے، کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وادیٔ کشمیر کے تین بڑے دریا جو نکلتے ہیں اس کے بالائی حصے سے شروع ہوتے ہیں۔ دریائے سندھ، جہلم اور چناب ہیں۔ یہ دریا کشمیر کے پہاڑوں سے نکل کر بہتے ہوئے پاکستان کے میدانی علاقوں میں آتے ہیں اور ان پر پاکستان کی زرعی معیشت کا بہت بڑی حد تک دارومدار ہے۔ کیونکہ ان دریاؤں کے ذریعے مغربی پاکستان کا کم از کم نوے لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا ہے۔ اور اگر ریاست کا الحاق بھارت سے کیا جاتا ہے تو ان دریاؤں کا پانی لامحالہ رک جاتا ہے۔ لہذا پاکستان کے لیے آب رسانی کا یہ سلسلہ منقطع ہو جانے کا اندیشہ بے جا نہیں ہے جبکہ یہ صورت حال دریائے راوی، ستلج اور بیاس کے ساتھ پہلے ہی پیش آ چکی ہے جن کے منبع بھارت میں ہیں۔ مگر یہ دریا بھی زیادہ تر پاکستان کے علاقوں سے ہی

گزر کر اس کے وسیع علاقوں کے لئے آب رسانی کا کام دیتے تھے ——— یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو بھارت کی حکومت نے یہ تنازع رویّہ اختیار کیا کہ وہ چونکہ دریائے راوی، ستلج اور بیاس کے بالائی حصوں کی مالک ہے۔ لہٰذا ان دریاؤں کے پانی کا ایک ایک قطرہ خود ہی استعمال کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اور اگر وہ چاہے تو ان دریاؤں کا پانی پاکستان کو فراہم کرنے سے انکار کر سکتی ہے۔ چنانچہ بھارت نے اپنے اس موقف کا عملی طور پر بھیانک مظاہرہ کرتے ہوئے یکم اپریل ۱۹۴۸ء سے ان دریاؤں کا پانی پاکستان کے لئے روک لیا۔ اور ڈیڑھ ماہ تک ان تینوں دریاؤں کا پانی جاری نہ کیا۔ اور اس عرصے میں پاکستان سے زبردستی معاہدہ بھی کروایا گیا کہ وہ نہ صرف ان دریاؤں سے کی جانے والی آبپاشی کے انتظامات پر صرف ہونے والے اخراجات میں سے اپنے حصہّ کی رقم ادا کرتا رہے گا بلکہ پاکستان ان دریاؤں سے جتنا پانی بھی استعمال کرے گا اس کی قیمت ادا کرے گا۔"

کشمیر اور پاکستان کے درمیان اس اہم اقتصادی رشتے پر زور دیتے ہوئے چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان نے مزید کہا کہ "ایک لمحے کے لئے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ کشمیر کا الحاق بھارت سے کیا جا سکتا ہے تو کشمیر سے نکلنے والے ان تینوں دریاؤں سے متعلق بھی وہی صورت حال پیدا ہو جائے گی اور پاکستان نہ صرف ان دریاؤں کے پانی سے جو بھارت سے نکلتے ہیں بلکہ ان دریاؤں کے پانی سے بھی جو کشمیر سے نکلتے ہیں محروم ہو کر رہ جائے گا جس کا نتیجہ لازمی طور پر یہ نکلے گا کہ مغربی پاکستان کا ایک کروڑ نوے لاکھ ایکڑ زیر کاشت رقبہ بنجر ہو جائے گا۔ اور اس علاقے کے باشندے قحط و افلاس کا شکار ہو کر تباہی و بربادی کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لہٰذا کشمیر اور پاکستان کے درمیان یہ ایک اٹوٹ معاشی اور اقتصادی رشتہ ہے۔ جس کی مثال اس قسم کے کسی اور تنازعہ کے پس منظر میں نظر نہیں آتی۔

دوسری طرف کٹھ پتلی ریاستی حکومت کی طرف سے وادی کشمیر کی مخصوص برآمدی تجارت اور کشمیری صنعت و حرفت کو فروغ دینے بلکہ قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی ناکام ہو چکی ہے۔

جس کی بڑی وجہ آمد و رفت کے ناکافی ذرائع اور نقل و حمل کے ناقص انتظامات ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے پیشتر یہاں کے ہر بڑے شہر میں کشمیری تاجر نظر آتے تھے لیکن برصغیر کی آزادی کے بعد بھارت کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں بربریت اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا اور نئی دلی تک کے شہر میں جو کشمیر کو آزاد کروانے اور نئے کشمیر کی تعمیر کے مدعی سیاستدانوں کا مرکز ہے، کشمیری تاجران کے سرِ عام قتل اور لوٹ مار کی وارداتیں دیکھی گئیں اور سارے بھارت میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی گئی کہ کوئی بھی کشمیری تاجر یا مزدور بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں آزادی وسلامتی سے اپنا تحفظ حاصل کر کے گھوم پھر نہ سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ لیاقت نہرو معاہدہ سے بھارت میں فرقہ پرستی کی آگ بہت حد تک ٹھنڈی ہو گئی تاہم ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف جو تعصب پیدا ہو چکا تھا وہ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اور کشمیر کے مسلمان تاجروں کے لئے تو آج بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ پہلے کی طرح بھارت کے بڑے بڑے شہروں میں اپنی تجارت قائم کر کے اسے فروغ دے سکیں۔ اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے بھارت کے ایوان تجارت اور موقعتی طور پر قائم شدہ حکومت کے تجارتی ادارے بھی اس سلسلے میں بالکل مفید ثابت نہیں ہو سکے۔ کشمیر میں موجودہ صورت حال پیدا ہونے سے پیشتر مغربی پاکستان میں کشمیری تاجروں کی برآمدی تجارت بڑے عروج پر تھی۔ لیکن ریاست پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کے بعد مغربی پاکستان میں بھی ان کشمیری تاجروں کی برآمدی تجارت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

وادیٔ کشمیر پر بھارت کے جابرانہ تسلط کے ابتدائی دور میں کشمیری عوام کو اشیائے خوردنی کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اہل کشمیر اس دور کی تکلیفیں تو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے جب ریاست میں نمک سولہ روپے سیر فروخت کیا جاتا تھا۔ اور آج اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی کشمیری عوام کے عام سماجی و معاشی حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہو سکی۔ کیونکہ اب بھی ہزاروں کشمیری مسلمان پاکستان میں پناہ لے کر روزگار حاصل کرنے پر

مجبور ہیں۔ برصغیر کی تقسیم سے پیشتر ہزاروں کشمیری مسلمان مزدور روزگار کی تلاش میں متحدہ پنجاب کے علاقوں میں آجاتے تھے مگر اب ان کے لئے یہ راستہ بھی مسدود ہوگیا ہے۔ لہٰذا اگر کشمیری عوام کی اقتصادی و معاشی حالت بہتر بنانی مقصود ہے تو اس کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ریاست کے پاکستان سے دوبارہ تجارتی روابط پیدا کئے جائیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ریاست کا بھارت سے جبری اور غیر فطری الحاق ختم کرکے اسے پاکستان سے ملحق ہونے کا موقع فراہم کیا جائے۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ وادیٔ کشمیر کے کاشتکار عوام موسم سرما کے دوران بالکل بے کار اور بے روزگار رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ برفباری کی وجہ سے کاشتکاری کا سلسلہ بند کر دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لہٰذا تقسیم سے قبل یہ بے روزگار کشمیری مزدور موسم سرما کے دوران ہزاروں کی تعداد میں سابق صوبہ پنجاب کے شہروں میں آکر وہاں محنت مزدوری کے ذریعے اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لئے گزر اوقات کی صورت پیدا کرتے تھے۔ مگر جب سے بھارت نے وادیٔ جموں و کشمیر کے ایک بڑے حصے پر جبری قبضہ جما لیا ہے کشمیر کے یہ مفلوک الحال مزدور بھی مغربی پاکستان یا بھارتی پنجاب کے شہروں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بھارت میں مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ ایک فرقہ وارانہ قسم کی کشیدہ فضا قائم رہتی ہے، لہٰذا کشمیری مسلمانوں کے لئے بھارتی شہروں میں حفاظت سے نقل و حرکت کرنا ناممکن ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کا مزدور پیشہ مسلمان طبقہ بھی ریاست کے اندر محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت بالکل خراب اور ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ اور کشمیری عوام کی اقتصادی حالت کے متعلق ہماری اس رائے کی تصدیق اقوام متحدہ کے غیر جانبدار مبصرین کے درج ذیل تجزیئے سے بھی ہوتی ہے۔

• آخر میں کشمیر اور پاکستان کے درمیان مذہب اور تہذیب و ثقافت کے اہم رشتوں کا ذکر بھی ضروری ہے کیونکہ وادیٔ کشمیر اور مغربی پاکستان کے باشندے ایک

ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم یہاں اس بات کی وضاحت کر دینی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان باہمی تعلقات میں نسل کو اوّلین حیثیت حاصل نہیں ہے اور کشمیری عوام کا پاکستانی باشندوں کے ساتھ اسلام کا رشتہ بھی انہیں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست رکھنے کے لئے بہت کافی ہے۔ کیونکہ اسلام ان کے نزدیک ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جسے رسم و رواج اور تنگ نظری پر مشتمل دقیانوسی عناصر کا مجموعہ نہیں قرار دیا سکتا۔ بلکہ اسلام انہیں صرف ایک وسیع اخوت و مساوات کا درس دیتا ہے۔ اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی ضابطہ حیات پر عمل پیرا مسلمان ایک قوم ہیں۔ اور ریاست میں دو تہائی سے زائد آبادی انہیں مسلمان باشندوں پر مشتمل ہے۔ جبکہ پاکستان کے باشندوں کا مذہب بھی اسلام ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن مسٹر ملیس پرائس نے مانچسٹر گارڈین کی ۱۱ر نومبر ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار اس ناقابل تردید انداز میں کیا ہے

" دریائے جہلم کے بالائی حصہ کی جانب پاکستان اور کشمیر کی سرحد کو عبور کرتے ہی ہر شخص کو قدرتاً اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس سیاسی سرحد کے دونوں جانب آباد باشندوں میں کوئی واضح فرق نہیں ہے۔ اس سرحد کے ساتھ ساتھ دونوں طرف آباد عوام کی زبان ایک ہے۔ لباس میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں اور دونوں علاقوں کے عوام مذہب اسلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ مجھے ایک بار جہلم کی تنگ وادی سے سڑک کے راستے کشمیر میں جانے کا اس وقت اتفاق ہوا تھا جب اس علاقے میں برطانوی حکومت قائم تھی۔ یہ سڑک بھی برطانوی انجینیروں نے تعمیر کی تھی۔ جو اس وقت سری نگر کو جانے کا واحد راستہ تھا۔"

ٹائمز آف لندن کے نامہ نگار نے ۳ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اپنی رائے کا اظہار اسطرح کیا تھا۔

" دوسری طرف ریاست کے مغربی اضلاع پونچھ، مظفر آباد اور باغ میں ریاست

کے لاکھوں مفلوک الحال مسلمان باشندے ہیں جو ریاست میں جنگ پھیل جانے کی وجہ سے بے گھر اور تباہ حال ہو چکے ہیں۔ اور شدید سردی کے باوجود یہ پناہ گزین بن کر اپنے ہمسایہ و ہم مذہب ملک پاکستان میں بھاگ آنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ریاست کے صرف دس ہزار ہندو اور سکھ پناہ گزینوں کو مسلمانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بھارتی فوج کی وسیع پیمانے کی یلغار کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مینڈھر اور اس کے نواحی علاقوں سے ہزاروں پونچھی مسلمان اپنے گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینے کے لئے قافلوں کی صورت میں پاکستان کی طرف چل پڑے ہیں۔ اور ان میں سے کئی قافلے تو در بدر مارے پھرتے اور خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے ہوئے گذشتہ ایک سال سے مسافت طے کرنے میں مصروف ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان کی تقسیم مذہبی بنیادوں پر عمل میں لائی گئی ہے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف وہی افراد تنازعہ کشمیر کے متعلق بھارتی حکومت کے غلط اور ناقابل یقین مؤقف کی حمایت کر سکتے ہیں، جن کے صرف اپنے ذاتی مفادات بھارت سے وابستہ ہیں۔ عدل و انصاف اور انسانیت کا تقاضا تو یہی ہے کہ ریاست کا الحاق جلد از جلد پاکستان سے کیا جائے۔ جس کے عوام کا مستقبل پاکستان اور صرف پاکستان سے وابستہ ہے۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کے دفاع کا تعلق ہے بھارت پر نہیں بلکہ صرف پاکستان پر ہی ریاست کے دفاع کا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ریاست میں ۴۸-۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی کے دوران بھارت آزاد کشمیر کی بے سرو سامان فوج کے مقابلہ میں اس سے کئی گنا زیادہ فوج میدان کارزار میں لا کر بھی کشمیر کی جنگ جیتنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اور اس حقیقت کی روشنی میں یہ بات کسطرح کہی جا سکتی ہے کہ بھارت مستقبل میں ریاست جموں و کشمیر کو کسی ملک کے حملہ سے محفوظ رکھ سکے گا۔ پھر چین اور بھارت کے درمیان حالیہ سرحدی جھڑپوں سے پیدا ہونے والی جنگی صورت حال نے بھی یہ بات واضح کر دی ہے۔ بھارت جو خود اپنی حفاظت کرنے کے قابل بھی نہیں ہے وہ اس سرحدی ریاست کی حفاظت کسطرح کر سکے گا۔

اس کے برعکس اگر پاکستان کے دفاع کا جائزہ لیتے ہوئے کشمیر سے متعلق اس صورت حال پر غور کیا جائے اور پاکستان کے لئے ریاست کی دفاعی اہمیت کا اندازہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اگر ریاست میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بھارت کی فوج ڈیرے ڈالے پڑی ہو تو پاکستان کی دفاعی حیثیت مستقل خطرے میں رہتی ہے۔ اور ریاست کی دفاعی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ریاست نے مغربی پاکستان کی سرحد کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اور ان حالات میں جب کہ پاکستان کو اپنے مغربی اور مشرقی صوبوں میں اپنی طویل سرحدوں کو بھارت سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر اسے ریاست سے ملنے والی تقریباً پانچسو میل لمبی سرحد کی بھی حفاظت کرنی پڑے تو پاکستان کو ہمیشہ ایک بھاری فوج رکھنی پڑے گی۔ لیکن پاکستان کی اقتصادی حالت اُسے اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ ہمیشہ ایک بھاری فوج بھارت کے غیر متوقع حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے رکھے۔ لہٰذا اس صورت حال کی موجودگی میں ریاست جموں وکشمیر کے بغیر پاکستان کو ایک آزاد و خود مختار اور مکمل ملک تصور کرنا ایک بعید از قیاس بات ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے اگر پاکستان کو ایک آزاد و خود مختار اور علاقائی طور پر ایک مستحکم ملک کی حیثیت سے قائم رکھنا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ کشمیر کو پاکستان کا ایک جزو لاینفک قرار دیا جائے۔ اور جب تک ریاست جموں وکشمیر کا پاکستان سے الحاق نہیں ہو جاتا پاکستان کی آزادی و خود مختاری بھی مشکوک قرار دی جا سکتی ہے۔

پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری سر ظفر اللہ خان نے ۱۹۵۰ء کے دوران ہی سلامتی کونسل کی توجہ مسئلہ کشمیر کے اس اہم دفاعی پہلو کی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا تھا کہ مسئلہ کشمیر پر اس علاقے کی دفاعی اہمیت نے بھی بہت اثر ڈالا ہے۔ اور اگر ریاست جموں وکشمیر کا الحاق پاکستان سے کر دیا جائے تو اس سے بھارت کے دفاع پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا۔ مگر دوسری طرف اگر پاکستان کے دفاع کو پیش نظر رکھتے ہوئے موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو حالات اس کے برعکس یہ نظر آتے ہیں کہ مغربی پاکستان میں لاہور سے شروع ہونے والی ریلوے لائن وزیرآباد

سے ہوتی ہوئی راولپنڈی تک گئی ہے۔ جہاں سے وہ آگے پشاور کی طرف جاتی ہے۔ اور اس ریلوے لائین کے ساتھ ساتھ ہی ایک بڑی سڑک بھی جو لاہور سے پشاور تک چلی گئی ہے مغربی پاکستان کے کئی بڑے شہروں کو آپس میں ملاتی ہے اور ان علاقوں کا تمام تر دفاع اس امر پر منحصر ہے کہ یہاں کے مواصلاتی نظام کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھا جا سکے۔ اور اگر وادی جموں و کشمیر کو بھارت کے جابرانہ قبضے میں رہنے دیا جاتا ہے تو ان علاقوں کا مواصلاتی نظام اس طرف سے ہمیشہ کے لئے دشمن کے حملوں کی زد میں آجاتا ہے اور اس کے تباہ ہونے کا مستقل خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

مسئلہ کشمیر کے اس پہلو پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے چوہدری ظفر اللہ خان نے کہا کہ جہاں تک پاکستان کے دفاع کا تعلق ہے موجودہ صورت حال اُسے اپنی دفاعی تیاریوں سے دست کش ہونے پر مجبور کر رہی ہے۔ بھارتی افواج ریاست کے ملحقہ علاقوں سے ہمارے سرحدی صوبے اور قبائلی علاقوں میں بھی داخل ہو سکتی ہیں۔ جہاں سے اِن کے لئے افغانستان جانے کے لئے بھی راستہ کھلا ہوا ہے۔ اور ان تمام خدشات کے پیش نظر پاکستان کا دفاع بھی قطعی طور پر غیر مستحکم ہو جاتا ہے۔ لہذا پاکستان کو اپنی شمال مغربی سرحد کی حفاظت کے لئے دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ اور اس سے آگے اس علاقہ میں انٹرنیشنل الاقوامی سرحد تک بھی جسے ڈیورنڈ لائن کہتے ہیں اپنا دفاع کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہمیں ریاستی پہلو کی طرف سے ہر وقت بھارت کے متوقع حملے کا خطرہ لگا رہے تو ہم اپنی شمال مغربی سرحد کی حفاظت کیلئے کیا دفاعی اقدامات کر سکتے ہیں اور اپنے دفاعی انتظامات کو کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں؟ بلکہ موجودہ صورت حال میں پاکستان پر اپنی دفاعی ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ آ پڑے گا کہ جسے برداشت کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہے۔

غرضیکہ ریاست جموں و کشمیر کے تنازعۂ الحاق کے خواہ کسی پہلو پر بھی غور کیا جائے اس کا منطقی دقانونی نتیجہ لازمی طور پر صرف ایک ہی برآمد ہو گا، کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق پاکستان سے کیا جائے یا کشمیر میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ اس سے پاکستان کی سلامتی کو خطرہ لاحق نہ رہے۔

(۱۷)

بّرِ صغیر کی ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ!

حکومت برطانیہ نے برّ صغیر ہند و پاکستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کیا تو یہاں ایسی چھوٹی بڑی تقریباً پانچ سو ریاستیں موجود تھیں جنہیں پاکستان یا بھارت دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنا الحاق کرنا تھا۔ برطانوی دور میں متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے نے برّصغیر کی ریاستوں کے راجوں اور نوابوں سے اپنے آخری خطاب میں واضح طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ انہیں اپنی ریاستوں کا الحاق پاکستان یا بھارت دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کرنا ہو گا۔ وائسرائے نے والیانِ ریاست پر یہ بھی زور دیا تھا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنی اپنی ریاستوں کے الحاق کا اعلان ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء یا اس سے قبل ہی کر دیں۔ والیان ریاست کا یہ اجلاس جولائی ۱۹۴۷ء میں منعقد کیا گیا تھا۔ مگر اکثر والیانِ ریاست اپنی ریاستوں کا فوری طور پہ الحاق کرنے کے مسئلے پر متفق نہیں ہو سکے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک یہ والیان ریاست ذہنی طور پر اپنی اپنی ریاستوں کی سربراہی سے سبکدوش ہونے اور اپنی ریاستوں کا الحاق دوسرے ملکوں سے کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور اسکی بنیادی وجہ یہ تھی کہ برصغیر کی آزادی سے پہلے تک یہاں قدیم طرز کی نیم خود مختار ریاستوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اور یہ والیانِ ریاست دنیا کی دوسری قوموں اور ملکوں کے زیر اثر بڑی تیزی سے یہاں رونما ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا ساتھ دینے اور بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات کا ذہنی طور پہ ساتھ دینے کے قابل نہ تھے۔ اور نہ ہی

تغیّر پذیر حالات کے مطابق دُنیا کی دوسری ترقی پسند قوموں کے دوش بدوش قدم اٹھانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ بلکہ اکثر والیان ریاست کا تو یہی خیال تھا کہ دراصل برطانوی حکومت برصغیر کو کبھی آزاد نہیں کرے گی۔ ان نیم خود مختار ریاستوں پر اِن کی مطلق العنان حکومتیں اسی طرح ہمیشہ قائم رہیں گی۔ اور وہ اپنی رعایا کو اُن کی خواہشات کے خلاف پہلے کی طرح طاقت کے بل پر دبا کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ کیونکہ برصغیر کے یہ اکثر والیانِ ریاست صرف برطانوی سامراج کے بل پر من مانی حکومت کرتے تھے اور اکثر اوقات اپنے عوام کے خلاف یہ والیان، ریاست کی گدیاں محفوظ رکھنے کے لئے برطانوی فوج بھی بڑی بے رحمی سے استعمال کرتے تھے۔ جس کے ذریعے ریاستی عوام کو طاقت کے بل پر اپنے تابع رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

مگر اِن والیان ریاست کے اندازے کے خلاف برصغیر کو بہت عرصہ پہلے آزادی نصیب ہو گئی تھی۔ اور وہ بھارت اور پاکستان کی آزاد حکومتوں کے قیام سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پہلے سے تیار بھی نہ کر سکے تھے۔ چنانچہ برصغیر کی تقسیم کے وقت اکثر والیانِ ریاست اپنی اپنی ریاستوں کا الحاق کرنے کے بارے میں پہلے سے کسی سوچے سمجھے منصوبہ پر عمل کرنے سے قاصر رہے۔ البتہ چند دُور اندیش اور تجربہ کار والیانِ ریاست نے الحاق کے مسئلہ پر غور و فکر کرنے کے بعد اپنے بروقت فیصلوں کا اعلان کر دیا حالانکہ اِن والیانِ ریاست کا اس موقعہ پر یہ سوچنا بہت بڑی غلطی تھی کہ اگر انہوں نے وائسرائے کی ہدایت کے مطابق اپنی ریاستوں کا پاکستان یا ہندوستان سے غیر مشروط طور پر الحاق کا اعلان نہ کیا تو اسطرح وہ کسی نہ کسی طرح دیر تک اپنا قبضہ ریاستوں پر برقرار رکھ سکیں گے۔ کیونکہ یہ والیانِ ریاست نہ تو کانگرس کی نظروں میں اچھے سمجھے جاتے تھے اور نہ مسلم لیگ اِن کا وجود بہتر سمجھتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود برصغیر کی بعض ریاستوں کے والی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ انہیں اب بھی حکومت برطانیہ کی پشت پناہی حاصل رہے گی۔ اور اس طرح وہ اپنی ریاستوں کا وجود برقرار رکھ سکیں گے۔ مثال کے طور پر ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں نے اپنی من مانی آزادی و خود مختاری قائم

رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بھارت کی وزارت برائے ریاستی امور نے جس کے سربراہ آنجہانی پٹیل تھے ان ریاستوں کا وجود قانونی و اخلاقی طور پر ختم کر دیا۔ تاہم حیدر آباد (دکن) جوناگڑھ اور کشمیر کی ریاستوں کا مسئلہ ان کے لئے بھی اس قدر آسان نہ تھا۔ لہذا ان ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک مستقل تنازعہ کی صورت اختیار کر گیا۔

جہاں تک بھارت کی ریاستوں کے مستقبل کا تعلق ہے کل ہند نیشنل کانگریس" اس مسئلے کے متعلق اپنی ایک قطعی اور فیصلہ کن رائے رکھتی تھی۔ اور ریاستی امور کے لئے کانگریس کی ایک علیحدہ شاخ "ریاستوں کی کانگریس" کے نام سے کام کر رہی تھی خود بھارت کے پہلے وزیراعظم آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو بھی کچھ عرصہ بھارتی ریاستوں کی اس کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں "نیشنل کانگریس" ریاستوں میں مہاراجوں اور نوابوں کی حکومت اور ریاستی عوام پر ان کے ظلم و تشدد کی پالیسیوں سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اور برصغیر کی آزادی کے بعد برسراقتدار کانگریسی حکومت کی رائے یہ تھی کہ والیان ریاست کا اقتدار بہر صورت ختم ہو جانا چاہیئے چنانچہ بھارت کی آزاد حکومت قائم ہونے کے بعد جب والئی ریاست نے بھی بھارتی حکومت کی اس پالیسی کی راہ میں مزاحمت کرنے کی کوشش کی اسے بری طرح کچل دیا گیا۔ اور بھارتی حکومت نے اپنی اس حکمت عملی کا آخری مظاہرہ ریاست حیدر آباد (دکن) کے خلاف فوجی کاروائی کے ذریعے ریاست پر قبضہ کر کے کیا۔

چونکہ برصغیر کی آزادی کے بعد ہر ریاست کے لئے لازمی تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت کے ساتھ اپنا الحاق کرے لہذا برطانوی حکومت پر یہ بھی لازم آتا تھا کہ وہ اس ضمن میں تمام والیان ریاست کے لئے ایک واضح اور ٹھوس لائحہ عمل پیش کرے۔ اور برطانوی حکومت کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ برصغیر میں برطانوی حکومت کے خاتمے پر الحاق کے معاملے میں والیان ریاست کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں واضح طور پر احکام جاری کرے۔ چنانچہ برصغیر کے آخری وائسرائے نے والیان ریاست کو ہدایت کی کہ وہ اپنے الحاق کا فیصلہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اصولوں کو پیش نظر رکھیں:-

(۱) ریاست کا جغرافیائی محلِ وقوع ریاست کو کس ملک کے ساتھ ملحق کرنے کا مقتضی ہے۔

(۲) ریاست کے باشندوں کی اکثریت کس مذہبی رشتے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس معاملے میں "مشن ودھ ماؤنٹ بیٹن" کے مصنف "ایلن کیمبل جانسن" کی درج ذیل رائے دلچسپی سے خالی نہ ہو گی۔ جو اُن کی کتاب کے صفحہ ۱۹۲ پر درج ذیل ہے۔

"والیان ریاست کا یہ حق تسلیم کیا جا چکا ہے کہ وہ پاکستان یا بھارت کسی سے بھی اپنی اپنی ریاستوں کے الحاق کا اعلان کر سکتے ہیں۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۵ جولائی کو والیانِ ریاست کے نام جو اپیل جاری ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت ہند الحاق کے بارے میں برصغیر کے ان تمام والیان ریاست کی درخواستیں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک منظور کر سکتی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس اپیل سے ریاستوں کے الحاق سے متعلق دو اصولوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ اول بقول لارڈ ماونٹ بیٹن یہ کہ ریاست کے جغرافیائی محلِ وقوع کے تقاضے کیا ہیں؟ اور دوم یہ کہ ریاستی عوام کے اکثریتی طبقے کا تعلق کس مذہب سے ہے۔"

جب ۳ جون ۱۹۴۷ء کو حکومتِ برطانیہ نے برصغیر کے مستقبل کے فیصلہ کا اعلان کیا تو ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جس روز برصغیر کی آزادی کا اعلان ہو یعنی مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو، تو اس اعلان کے بعد اسی روز سے برصغیر ہند و پاکستان کی ریاستیں بھی برطانوی حکومت کے اقتدار سے آزاد ہو جائیں گی۔ اور انہیں مکمل آزادی حاصل ہو گی کہ وہ پاکستان یا بھارت دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنے الحاق کا اعلان کر دیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی برطانوی حکومت کے نمائندہ نے والیانِ ریاست کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنی ریاستوں کے جغرافیائی محلِ وقوع کے تقاضے، ان کے معاشی و اقتصادی حالات اور ریاستی عوام کی رائے کو بھی ضرور پیشِ نظر رکھیں۔

برصغیر کی آزادی سے متعلق جو قوانین وضع کئے گئے تھے ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ بھارت اور پاکستان کو برطانوی اقتدار سے آزادی حاصل ہونے کے ساتھ ہی برصغیر کی تمام ریاستیں

بھی برطانوی اقتدار سے آزاد ہو جائیں گی۔ اور اس کے بعد برطانوی نمائندے نے برصغیر کے والیان ریاست کو الحاق کے بارے میں جو واضح ہدایات جاری کیں اُن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

برصغیر کی آزادی کے کچھ عرصہ بعد تک کل ہند نیشنل کانگریس کے بھارتی رہنما اس بات کے زبردست حامی تھے کہ ریاستوں کا الحاق والیان ریاست کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ ریاستوں کے عوام کی خواہش کے تابع ہونا چاہیئے۔ اور ۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو بھارتی نمائندے آنجہانی سوامی آئینگر نے الحاق کے مسئلہ پر سلامتی کونسل کے اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے بھارتی حکومت کے مؤقف کی ان الفاظ میں وضاحت کی تھی۔

"اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ریاست کا والی سربراہ ریاست کی حیثیت سے ریاست کے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کے متعلق اسی صورت میں درخواست کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں اس کی ذاتی رائے اور ریاستی عوام کی رائے میں ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ لیکن اگر ریاست کے سربراہ اور وہاں کے عوام کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہو تو پھر ریاست کا الحاق کرنے کے سوال پر ریاست کے عوام کی رائے معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ اور جب ریاست کے عوام اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کر چکیں تو پھر ریاست کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ریاست کا الحاق عوام کی رائے کے مطابق کرے"۔ بھارتی نمائندہ نے اس موقعہ پر یہ بھی کہا کہ ریاستوں کے الحاق کے بارے میں بھارتی حکومت کا موقف بھی یہی ہے جس کی اوپر وضاحت کی گئی ہے۔

اسی طرح ۱۰ اگست ۱۹۴۸ء کو بھارتی حکومت نے ریاست حیدر آباد (دکن) کے متعلق ایک قرطاس ابیض جاری کیا جس میں بھارتی حکومت کے مؤقف کو اس بارے میں یوں بیان کیا گیا تھا۔

"بھارت کی حکومت اس مسئلے پر اپنی یہ قطعی اور فیصلہ کن رائے رکھتی ہے کہ برصغیر کی آزادی کے بعد یہاں کی ریاستوں کو جو حقوق واپس ملے ہیں اُن کی رُو سے ان حقوق کے استعمال کا حق

صرف ریاستوں کے عوام کو حاصل ہے۔ اور برصغیر کی ہر ریاست میں ایسے حالات پیدا کرنے ضروری ہیں کہ وہاں کے عوام اپنا اظہار رائے کا حق بغیر کسی قسم کی مداخلت کے نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کر سکیں"۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کشمیر، حیدر آباد (دکن) اور جونا گڑھ کی ریاستوں کے علاوہ برصغیر کی تمام ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ بغیر کسی پیچیدگی اور رکاوٹ کے حل ہو گیا۔ مگر ان تینوں ریاستوں کے مسئلہ الحاق پہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ چونکہ ریاست حیدر آباد دکن کا نواب مسلمان تھا لیکن ریاست میں اکثریت ہندو باشندوں کی تھی اسی طرح جونا گڑھ میں بھی مسلمان نواب کی حکومت تھی۔ اور سمندر کے راستے سے یہ ریاست پاکستان کے قریب بھی تھی مگر اس ریاست میں بھی اکثریت ہندو باشندوں کو حاصل تھی ـــ اور جہاں تک ریاستِ جموں و کشمیر کا تعلق ہے اس ریاست میں ہندو مہاراجہ کی حکومت تھی جبکہ ریاست میں مسلمان باشندوں کو غالب اکثریت حاصل تھی ریاست حیدر آباد دکن نے اگرچہ وقتی طور پر خود مختار رہنے کا اعلان کیا ریاستِ جونا گڑھ نے ۱۵ ستمبر ۴۷ء کو پاکستان کیساتھ الحاق کرنے کا اعلان کر دیا اور ریاستِ جموں و کشمیر کے مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کی درخواست پیش کر دی جسے بھارت نے مشروط طور پہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو منظور کر لیا۔ دوسری جانب ریاست حیدر آباد دکن کے بارے میں بھارتی حکومت نے یہ موقف اختیار کیا کہ پہلے ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کا غیر مشروط طور پر اعلان کیا جائے، اس کے بعد ریاستی عوام اپنی اس رائے کا اظہار کر سکتے ہیں کہ آیا وہ ریاست کا الحاق بھارت سے کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور حیدر آباد دکن کے الحاق سے متعلق بھارتی حکومت کا یہ انوکھا موقف نازی جرمنی کے اس فسطائی موقف سے مشابہت رکھتا تھا۔ جو اس نے آسٹریا پہ حملہ کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جبکہ اگست ۱۹۴۸ء میں بھارت نے حیدر آباد دکن کے متعلق اپنے اس نرالے مُوقف کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

" نواب نظام حیدر آباد دکن کی خواہش یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حالات کے پیشِ نظر

الحاق سے متعلق ریاست حیدرآباد (دکن) میں رائے شماری کروائی جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا مختصر سا مسلح گروہ عوام کی مرضی کو اپنے تابع رکھ سکے اور ریاست میں مسلمان رضاکاروں کو نظام کی مرضی کے مطابق ریاستی عوام کی رائے ظاہر کرنے پہ مجبور کیا جائے اور ریاست کے عوام کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ان رضاکاروں کو کھلی چھٹی دے دی جائے۔ مگر بھارتی حکومت سمجھتی ہے کہ جب تک ریاست میں ایک نمائندہ عبوری حکومت جس سے اکثریتی طبقہ مطمئن ہو قائم نہ کی جائے گی۔ ریاست میں رائے شماری کروانا عوام کو فریب دینے کے مترادف ہوگا۔"

ادھر مسئلہ کشمیر پہ حکومت پاکستان نے بھی شروع سے ہی یہ مؤقف اختیار کیا ہے جو بھارتی حکومت نے حیدرآباد کا بھارت سے الحاق کرنے کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا۔ لیکن بھارت جن باتوں کو ریاست حیدرآباد کے بھارت سے الحاق کے لئے جائز تصور کرتا تھا۔ انہی باتوں کو ریاست جموں و کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے بارے میں ناجائز تصور کرنے لگا ——!

نظام حیدرآباد (دکن) کی خواہش تھی کہ بھارتی حکومت کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کیا جائے جس سے ریاست کی آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے کوئی صورت پیدا کی جا سکے۔ لیکن بھارتی حکومت نے نظام حیدرآباد (دکن) کی یہ تجویز یکسر مسترد کر دی۔ جس کے بعد والئے حیدرآباد نے یہ پیشکش کی کہ ریاست میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کروائی جائے۔ تاکہ الحاق کے مسئلے پہ ریاستی عوام کی رائے حاصل کی جا سکے۔ مگر بھارتی حکومت نے یہ تجویز بھی ٹھکرا دی اور اس کی بجائے نظام حیدرآباد (دکن) کو یہ ہدایت کی کہ پہلے وہ ریاست کا بھارت سے غیر مشروط طور پر الحاق کرنے کا اعلان کرے۔ اس کے بعد ہی ریاست میں رائے شماری کروانے کے متعلق سوچا جا سکتا ہے۔ پھر جب بھارتی حکومت اور ریاست حیدرآباد کی حکومت کے درمیان الحاق کے بارے میں کوئی اصولی مفاہمت نہ ہو سکی تو بھارتی حکومت نے ریاست پہ حملہ کر کے زبردستی قبضہ کر لیا! ادھر یہ بھارتی فوج وہاں کے مسلمان باشندوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگی۔

اس کے بعد ریاست جوناگڑھ کے الحاق کا مسئلہ تھا جس کے متعلق والئی ریاست نے ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ فی الحال ریاست کی موجودہ حیثیت برقرار رکھی جائے اور اس کے بعد ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو نواب جوناگڑھ نے ریاست کے پاکستان سے الحاق کی درخواست کی۔ مگر بھارتی حکومت نے ریاست جوناگڑھ اور پاکستان کے درمیان اس معاہدہ پر سخت اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ ریاست جوناگڑھ کا اسطرح سے پاکستان سے الحاق اِن اصولوں کی خلاف ہے جن کے تحت برصغیر کی تقسیم کا فیصلہ کرنے کے بعد تقسیم عمل میں لائی گئی تھی۔ بھارتی حکومت نے اس ضمن میں سب سے بڑی یہ دلیل پیش کی کہ برصغیر کی تقسیم اسِ بنیادی اصول کے تحت عمل میں لائی گئی تھی کہ برصغیر کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ پاکستان کی حدود میں شامل کیے جائیں۔ اور جن علاقوں میں غیر مسلم باشندوں کو اکثریت حاصل ہے وہ علاقے بھارت کی حدود میں شامل کیے جائیں۔ لہذا اس اصول کی رُو سے بھارتی حکومت ریاستِ جوناگڑھ کے پاکستان سے الحاق کو جائز تصور نہیں کرتی۔ بلکہ بھارتی حکومت اسے بھارت کی آزادی اور اس کے علاقہ میں بالواسطہ مداخلت تصور کرتی ہے۔

اس کے بعد ریاست جموں و کشمیر کا بھارت سے الحاق کرنے کے سوال پر پاکستان کے وزیر خارجہ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں نے ۱۹۵۰ء میں سلامتی کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا "کیا پاکستان ریاست جموں و کشمیر کے بارے میں وہ الفاظ استعمال کرنے میں حق بجانب نہیں ہے، جو بھارت نے ریاست جوناگڑھ کے بارے میں استعمال کیے تھے کہ بھارت کے ساتھ کشمیر کے جبری الحاق سے ان اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی ہوتی ہے جن کو بنیاد بناتے ہوئے برصغیر ہند و پاکستان کی تقسیم کا فیصلہ کرنے کیلئے اس پر عمل درآمد کیا گیا تھا۔ اور یہ کہ اسطرح

ریاست جموں وکشمیر کا بھارت سے جبری الحاق کرنے پر پاکستان کی آزادی اور اس کے علاقے میں براہِ راست مداخلت بیجا ہوتی ہے اور بھارت کی اس مداخلت سے پاکستان کی سالمیت کو خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے"!

چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان نے اپنی اسی تقریر میں ریاست جوناگڑھ کا الحاق کرنے کے متعلق بھارتی حکومت کے مؤقف کی بنیاد پر مزید کہا کہ چونکہ ریاست جوناگڑھ میں ہندو باشندوں کو اکثریت حاصل تھی اس لئے ریاست کا الحاق بھارت سے ضروری سمجھا گیا۔ اور والیٔ جوناگڑھ کو ریاستی عوام کی رائے کے خلاف ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ لہٰذا اسی طرح کشمیر کا الحاق بھی پاکستان کے ساتھ غیر مشروط طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ اگرچہ ریاست جموں وکشمیر کا مہاراجہ ہندو تھا لیکن ریاست میں مسلمان باشندے بھاری اکثریت میں آباد تھے۔ علاوہ ازیں ریاست جموں وکشمیر کے جغرافیائی تقاضے بھی اس کے پاکستان سے الحاق کو لازمی قرار دیتے ہیں تو پھر بھارتی حکومت ریاست جموں وکشمیر کے بھارت سے الحاق کو کن اصولوں کے تحت جائز قرار دیتی ہے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے مسئلہ کشمیر پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے سلامتی کونسل سے کہا "بھارتی حکومت نے تجویز پیش کی تھی کہ ریاست جوناگڑھ کے الحاق کا مسئلہ بات چیت کے ذریعے طے کر لیا جائے۔ جس کا مطلب درپردہ یہ تھا کہ حکومت جوناگڑھ ریاست کے بھارت سے الحاق کو تسلیم کرے یا ریاست جوناگڑھ کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے بھارت اور جوناگڑھ کی حکومتوں کی مشترکہ نگرانی کے ذریعے ریاست میں رائے شماری کروائی جائے ——— اگر حکومت بھارت کی یہ تجویز معقول تھی تو پاکستان یہ تجویز پیش کرنے میں کیوں حق بجانب نہیں ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے ریاست میں پاکستان اور جموں وکشمیر کی حکومتوں کی مشترکہ نگرانی میں رائے شماری کروائی جائے"!

بھارتی حکومت نے ریاست حیدر آباد (دکن) کی طرح ریاست جوناگڑھ پر بھی فوج کی مدد سے قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے عوام کی رائے حاصل کرنے کا ڈھونگ رچایا۔ اور طاقت کے بل پر

ریاستی عوام کی رائے بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کے حق میں حاصل کرلی۔ پاکستان نے اس سلسلے میں سلامتی کونسل سے شکایت بھی کی۔ مگر اس پر کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی۔ اور اب تک سلامتی کونسل ریاست جوناگڑھ اور ریاست حیدرآباد (دکن) کے بھارت سے جبری الحاق پر پاکستان کے احتجاج کو طاقِ نسیاں کی نذر کرچکی ہے۔ اور مسئلہ کشمیر بھی آج تک حل نہیں کرسکی۔

ریاست جموں وکشمیر کے مسئلہ الحاق پر گزشتہ باب "کشمیر کے پاکستان سے رشتے" میں کافی بحث وتمحیص کی جاچکی ہے۔ تاہم جب مہاراجہ کشمیر نے ریاست کا بھارت سے الحاق کرنے کی کوششیں شروع کیں تو اس وقت ریاست کے عوام ریاست کی آزادی اور اس کے بھارت کے ساتھ جبری الحاق کے خلاف اپنی تحریک کا آغاز کرچکے تھے۔ اور شیخ محمد عبداللہ نے اس وقت کشمیر کی تحریک آزادی پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا۔

" ریاستی حکومت نے کشمیری عوام کو کچلنے کے لئے اپنی فوجی کارروائیاں ریاست میں شروع کردیں۔ جس کی وجہ سے پونچھ کے علاقے میں خوف وہراس پھیل گیا۔ مگر پونچھ میں زیادہ تر فوجی مسلمان آباد تھے جو متحدہ ہندوستان کی برطانوی فوج میں رہ کر فوجی تربیت اور تجربہ حاصل کرچکے تھے۔ ان لوگوں کے رشتہ دار جہلم اور راولپنڈی وغیرہ کے علاقوں میں آباد تھے۔ لہذا انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو ریاست سے باہر پاکستانی علاقوں میں پہنچادیا۔ اور واپسی پر ان علاقوں سے ہتھیار حاصل کرکے دوبارہ ریاست میں آگئے۔ اور اب یہ صورت حال ہے کہ ریاستی فوجوں کو ان کشمیری عوام کی فوج کے مقابلے میں اکثر مقامات سے پسپا ہونا پڑا ہے۔"

مگر اس کے بعد جب قبائلی عوام ریاست کے دُور دراز علاقوں سے پسپا ہوکر ایبٹ آباد کی طرف روانہ ہوگئے تو ریاست میں صورتِ حال اور بھی زیادہ نازک ہوگئی۔ کیونکہ ریاست کی ڈوگرہ فوج کے ساتھ اب بھارت کی کثیر تعداد فوج بھی ریاست میں داخل ہوکر مورچے سنبھال چکی تھی۔ لہذا کشمیری عوام میں زبردست خوف وہراس پھیل گیا جبکہ اس کے فوراً بعد ہی ریاست کے تمام علاقوں میں اور خاص طور پر جموّں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کردیا گیا۔ ایک موقعہ

پر قائدِ اعظم (مرحوم) نے راقم الحروف کو بتایا کہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ کشمیری مسلمان واقعی سخت خطرے میں ہیں تو انہوں نے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستانی فوج بھی ریاست میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا اُسے ایک انگریز مصنف "ایلین کیمبل جانسن" نے اپنی کتاب "Mission With Mount Betton" (ماؤنٹ بیٹن مشن کے ہمراہ) کے صفحہ ۲۳۲ پہ یوں بیان کیا ہے :-

"برصغیر کی موجودہ صورتِ حال سیاسی اور دفاعی لحاظ سے نہایت پیچیدہ ہے۔ لیکن "لارڈ ماؤنٹ بیٹن" اس صورتِ حال کے متعلق کسی قسم کے ذہنی خلفشار کا شکار نہیں ہوئے۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کشمیر کی موجودہ نازک صورتِ حال پہ قابو پانے کے سلسلے کی اس آخری کوشش میں ہی ان کا صلاح و مشورہ بھی نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی موجودگی نے ہی بھارتی حکومت کو پنجاب اور جوناگڑھ کی نازک صورتِ حال پر پریشانی میں گرفتار ہونے اور تباہ کن صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے سے محفوظ رکھا ہے۔ کیونکہ اچانک پیدا ہونے والی اس خطرناک صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ بلا تاخیر کسی مؤثر اور نتیجہ خیز فیصلے پہ پہنچا جائے۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن میں اس نازک موقع پہ شدید خطرناک حالات پہ قابو پانے کی صلاحیتیں بھی موجود دیکھیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے بتایا کہ گزشتہ جمعہ کے روز یعنی ۲۴ راکتوبر کو جب سیامی وزیر خارجہ کے اعزاز میں دی گئی ایک "بفے[۱] ڈنر" میں جب بھارتی وزیرِ اعظم سے میری ملاقات ہوئی تو پنڈت جواہر لعل نہرو نے سب سے پہلے مجھے یہ تشویشناک خبر سنائی کہ سرحدی قبائلیوں کو فوجی گاڑیوں کے ذریعے راولپنڈی روڈ تک لایا جا رہا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاستی فوجیں وہاں موجود ہی نہیں۔ لہٰذا اس سے بڑی نازک صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے۔ پھر ماؤنٹ بیٹن نے ۲۵ راکتوبر بروز ہفتہ ڈیفنس کمیٹی کے اجلاس میں جنرل لاک ہارٹ کے ہمراہ شرکت کی تو اس میں انہوں نے پاکستانی فوج کے ہیڈ کوارٹر سے آیا ہوا تار پڑھ کر

---

[۱] ایک ایسی دعوت جس میں کھڑے ہو کر کھایا جاتا ہے

سُنایا جس میں کہا گیا تھا کہ پانچ ہزار قبائلیوں نے حملہ کر کے مظفر آباد اور ڈومیل پر قبضہ کر لیا ہے اور قبائلی عوام کی ایک اور بھاری جمعیت کے ریاست میں پہنچنے کا بھی امکان ہے۔ اس رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ قبائلی عوام سری نگر سے قریباً بیس میل کے فاصلے پر ہیں۔

"ایلن کیمبل جانسن" نے مزید لکھا ہے۔ "بھارتی ڈیفنس کمیٹی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ریاست میں ہتھیار اور گولہ بارود بھیجا جائے تاکہ سری نگر کے لوگ اپنے آپ کو ان حملہ آوروں سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس کمیٹی کے اجلاس میں ریاستی فوج کی مدد کے لئے بھارتی فوج بھیجنے کے سوال پر بھی غور کیا گیا۔ لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس بات پر زور دیا کہ جب تک ریاستی حکومت کی طرف سے کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی درخواست نہ کی جا چکے ریاست میں بھارتی فوج کا بھیجنا خطرناک صورت حال کا موجب ہوگا۔ علاوہ ازیں ریاست کا یہ الحاق بھی صرف عارضی نوعیت کا ہونا چاہئے جو ریاست میں رائے شماری کروانے تک عبوری دور کے لئے کیا جا سکتا ہے۔ مگر ۲۵ راکتوبر تک ان اہم معاملات کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسٹر وی۔ پی مینن فوری طور پر سری نگر جائیں اور وہاں کی صحیح صورت حال معلوم کریں۔

چنانچہ بھارت کے ریاستی اُمور کے سیکرٹری مسٹر وی۔ پی۔ مینن نے سری نگر پہنچکر دیکھا کہ وہاں کی حالت بھارتی حکومت کیلئے سخت پریشان کن ہے، لہٰذا وی۔ پی مینن نے مہاراجہ سے ریاست کا بھارت سے الحاق کرنے کی درخواست حاصل کی اور مہاراجہ کو جموّں میں ڈٹے رہنے کا حوصلہ دے کر خود نئی دلّی واپس پہنچ گئے۔"

مسٹر کیمبل جانسن" نے تنازعہ کشمیر کے سلسلے میں متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے "وہ جون میں اپنے دورہ کے بعد سے مہاراجہ کشمیر پر مسلسل زور دیتے ہوئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے رہے ہیں کہ وہ ریاست کا الحاق کرنے سے پیشتر اپنے ریاستی عوام کی رائے حاصل کرنے کا اقدام کریں جو صرف عام انتخاب یا رائے شماری کے ذریعے ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اور اگر یہ طریقہ ممکن نہیں ہے تو عوام کے نمائندہ اجتماعات منعقد کر کے بھی رائے عامہ معلوم کی جا سکتی ہے۔ اور آخری اڑتالیس گھنٹوں کے دوران تو انہیں یقین ہو گیا کہ بھارتی حکومت ریاست جموں و کشمیر کی حاصل کردہ درخواست کے بعد ریاست میں فوج بھیجنے کے سوال پر خود ان کا اور بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف کا دفاعی امور کے متعلق مشورہ قبول کرنے کو آمادہ نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے ریاست کا بھارت سے الحاق کرنے کے مسئلہ پر بھارتی حکومت کی توجہ دوبارہ مبذول کروائی اور آخر کار حکومت بھارت کے فیصلہ پر ہی عمل پیرا ہونے کا فیصلہ کر لیا۔"

مسٹر کیمبل جانسن نے اپنی اسی کتاب میں بیان کیا ہے کہ جب ہندوستان کے روزنامہ سٹیٹس مین کے مدیر جناب سٹیفن نے اپنے اداریہ میں لکھا تھا کہ ریاست جموں و کشمیر میں بھارتی فوج کے داخل ہونے سے پاکستان اور بھارت کے تعلقات تشویشناک حد تک کشیدہ ہو گئے ہیں تو ماونٹ بیٹن نے اسٹیٹس مین کے مدیر کو مراسلہ بھیجا جس میں انہوں نے کہا تھا "کسی قوم کی تعمیر شعبدہ بازی کے ذریعے عمل میں نہیں لائی جاتی —— محمد علی جناح ایبٹ آباد میں یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ کشمیر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں گے۔ اگرچہ پہلے جوناگڑھ اور اس کے بعد حیدر آباد (دکن)، کے وفد کی بعید از فہم گرفتاری سے محمد علی جناح چراغ پا ہو گئے ہیں مگر کشمیر کے متعلق بھارت کا یہ اقدام مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ کیونکہ بھارت شروع ہی سے ریاست میں رائے شماری پر رضامندی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس موقعہ پر اگر ریاست میں بھارتی فوج داخل نہ ہوئی ہوتی تو ریاست میں قبائلیوں کے ہاتھوں ریاستی عوام کا اور سری نگر میں رہنے والے کئی سو برطانوی باشندوں کا قتل عام لازمی ہو جاتا۔ نیز بھارت نے اب تک جو اقدام بھی کیا ہے ریاست کے مہاراجہ کی طرف سے ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کا اعلان اسے قانونی طور پر جائز قرار دیتا ہے۔"

اور جہاں تک پاکستانی فوج کو ریاست میں داخل ہونے سے روکنے کا تعلق ہے، اس دلچسپ کتاب "ماونٹ بیٹن مشن کے ہمراہ" کا مصنف اسے یوں بیان کرتا ہے "آج ڈیفنس کمیٹی کا اجلاس جاری تھا کہ دوپہر کو "آکن لیک" نے ماونٹ بیٹن کو ٹیلی فون پر بتایا کہ انہوں نے محمد علی جناح کو رضامند

کر لیا ہے کہ وہ اپنی فوج کو کشمیر میں داخل ہونے کے احکامات جو انہوں نے گزشتہ شب جاری کئے تھے منسوخ کر دیں۔ قائداعظم کے یہ احکام مغربی پاکستان کے گورنر جن کے ہمراہ قائداعظم مقیم ہیں کے فوجی سیکرٹری کے ذریعے پاکستان کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی تک پہنچا دیئے گئے جو پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل میسروی کی جگہ کام کر رہے ہیں۔ مگر قائداعظم کے یہ احکام پاکر جنرل گریسی نے جواب دیا کہ وہ سپریم کمانڈر کی رضامندی حاصل کئے بغیر فوج کو اس قسم کے احکام جاری نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد ہی جنرل گریسی کی ہنگامی درخواست پر مسٹر "آکن لک" آج صبح لاہور روانہ ہو گئے۔ اور وہاں پہنچکر انہوں نے قائداعظم کو بتایا کہ جہاں تک کشمیر میں بھارتی فوج کے داخلے کا سوال ہے ریاست جموں و کشمیر کا تو بھارت سے الحاق ہو چکا ہے اور اب بھارتی حکومت ریاست کے مہاراجہ کی درخواست پر وہاں اپنی فوج بھیجنے میں ہر طرح سے حق بجانب ہے۔ اور پھر قبل اس کے کہ مسٹر آکن لک" قائداعظم سے جدا ہوتے قائداعظم نہ صرف یہ کہ کشمیر میں پاکستانی فوج کے داخلے کے احکام منسوخ کر چکے تھے بلکہ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو لاہور آنے کی دعوت بھی دے چکے تھے ——— ماؤنٹ بیٹن نے ٹیلیفون پر "آکن لک" کے ساتھ بات چیت میں کئی گھنٹے اضطراب میں وقت گزارنے کے بعد کافی تاخیر سے ڈنر میں پہنچکر بتایا کہ "معاملہ ختم ہو چکا ہے" مگر قائداعظم کی دعوت پر لاہور جانے کا سلسلہ پنڈت نہرو کی علالت کے باعث ختم ہو گیا۔ کیونکہ وہ لاہور نہیں جا سکتے تھے۔"

اور آج راقم الحروف کو یقین واثق ہے کہ اگر وہ پاکستان کے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح سے ہنگامی طور پر ملاقات نہ کرتا تو کشمیری عوام کی طرف سے پاکستانی فوج کشمیر میں یعنی سری نگر اور جموں میں داخل ہو جاتی اور ریاست جموں اور کشمیر کا یقیناً پاکستان کے ساتھ الحاق مکمل ہو چکا ہوتا۔ اور مجھے آج بھی اس بات کا یقین کامل ہے کہ اس صورت حال میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بھی نہ ہوتی۔ میرے پاس اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے ٹھوس ثبوت اور دلائل موجود ہیں۔ مگر میں اس وقت ان کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

البتہ کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے کے فیصلہ کو منسوخ کرنے کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے ہیں جس نے کشمیر کی تاریخ کا رخ ہی بدل دیا ہے اور آج ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کا مسئلہ مستقبل کا ایک تصفیہ طلب مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔

مسٹر کیمبل جانسن نے اپنی اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر بہاتما گاندھی نے ایک بیان دیا تھا جو انہیں چرچل سے مشابہہ کرتا ہے کہ "انجام خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان تو صرف کام کرنے یا مر جانے[1] کے مقولے پر عمل کر سکتا ہے۔ یعنی اگر ریاست کی مختصر سی سی فوج سپارٹنز کی طرح تھرموپلی کی نہایت بہادری سے حفاظت کرتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے یا شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ہمراہیوں جیسے مسلمان، ہندو اور سکھ ساتھی کشمیر کی حفاظت کرتے ہوئے جان بھی دے دیتے ہیں تو ان کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہے گا۔ کیونکہ یہ باقی بھارت کے لئے محض ایک بہادری کی درخشاں مثال ہو گی۔

پنڈت نہرو، پاکستان کے وزیر اعظم کے نام اپنے ۸ رنومبر ۱۹۴۷ء کے تار میں لکھتے ہیں کہ "دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس اہم اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ اگر ریاست کا سربراہ ریاست کے اکثریتی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ اور اگر ایک ریاست اس ملک سے اپنا الحاق کرتی ہے جبکے عوام اسکے مذہب کے پیرو کار نہیں ہیں جبکا پیرو کار ریاست کا اکثریتی طبقہ ہے تو ریاست کا دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے کا فیصلہ ریاستی عوام کی رائے کے مطابق کر لیا جائے۔ گویا بھارتی حکومت کو ایک مرتبہ پھر اسی بنیادی اصول کی بنا پر اپنا یہ موقف اختیار کرنا پڑا۔ بھارتی نمائندے گوپال سوامی آئنگر کا بیان یہاں دوبارہ پیش کیا جاتا ہے جو انہوں نے ۸ رمارچ ۱۹۴۸ء کو دیا تھا۔

"تاہم جب وہ (یعنی والئے ریاست) ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس کی ریاست کے عوام اس سے مختلف فیصلہ کرتے ہیں تو عوام کی رائے لینا ہی ضروری ہے۔ اور جب عوام اپنی

---

[1] DO OR DIE کی ضرب المثل مشہور ہے۔

رائے ظاہر کر دیں تو سربراہِ ریاست کو عوام کی اس رائے کے مطابق ہی فیصلہ دینا ضروری ہے"۔
یہ ہے بھارت کا وہ موقف جس کا اس نے کئی موقعوں پہ اپنے مفاد کے لئے اعادہ کیا ہے۔ مگر
یہاں یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ :۔

(ا) بعض ریاستیں بغیر کسی بحث و تمحیص یا رکاوٹ کے بھارت کے ساتھ اور بعض ریاستیں
پاکستان کے ساتھ الحاق کر سکتی تھیں۔

(ب) کچھ ایسی ریاستیں بھی تھیں جو غیر جانبدار رہ کر پاکستان اور بھارت دونوں کے ساتھ
اپنے تعلقات برقرار رکھنا چاہتی تھیں۔

(ج) ان کے علاوہ بعض ریاستیں ایسی بھی تھیں جن کے عوام اور سربراہانِ ریاست کے
درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ یعنی وہاں کے عوام اگر ریاست کا ایک ملک
سے الحاق چاہتے تھے تو سربراہانِ ریاست دوسرے ملک سے الحاق کے خواہشمند تھے۔
اوپر بیان کی گئی آخری صورت کے بارے میں تینوں متعلقہ حکومتیں یعنی پاکستان، بھارت
اور برطانیہ کا خیال تھا کہ اس قسم کی ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ عوام کی رائے حاصل کرتے
ہوئے اُس کی روشنی میں حل کیا جائے ــــــــــ مگر جہاں تک حیدر آباد (دکن)
اور جوناگڑھ کا تعلق ہے وہاں تو بھارت نے اپنے اس مبینہ مؤقف کو عملی صورت میں
تسلیم کیا لیکن کشمیر کے سوال پر اس اصول کو تسلیم کرنے کی بجائے بھارت، پاکستان کے
نہایت معقول اور احتجاجی رویّے کے باوجود آج تک ریاست جموّں وکشمیر میں رائے شماری
کروانے کے معاہدہ پہ عملدرآمد کیلئے آمادہ نہیں ہو سکا۔

تنازعۂ کشمیر کے ممکن حل

جب بھارت کے گورنر جنرل نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ریاست جموں و کشمیر کے بھارت سے الحاق کی درخواست اس وضاحت کے ساتھ منظور کر لی کہ ریاست میں رائے شماری الحاق کے بعد کروائی جائے گی تو اس وقت بھارت کے قانونِ آزادی میں یہ بات شامل نہ تھی کہ کوئی ریاست کسی ملک کے ساتھ مشروط طور پر بھی الحاق کر سکتی ہے۔ بلکہ بھارتی حکومت کے قانون آزادی کی رُو سے یہ الحاق صرف قطعی حیثیت میں اور غیر مشروط طور پر ہی ہو سکتا تھا جس میں کسی قسم کی تبدیلی بعد میں ممکن نہ تھی۔ لیکن بقول بھارتی گورنر جنرل کشمیری عوام کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ ریاست کا کس ملک سے الحاق کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اِن کی رائے اس معاملے میں ابھی معلوم نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے ایک ایسا خلاف آئین طریقہ استعمال کیا گیا جسے بعد میں مسئلہ کشمیر کے متعلق خصوصیت کے ساتھ بھارتی حکومت نے تسلیم کر لیا۔ مگر اس کے بعد جب مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل کے سامنے پیش کیا گیا تو بھارتی حکومت نے ریاست میں رائے شماری کے اصول کو ایک بار واضح الفاظ میں تسلیم کر لیا۔ حالانکہ حکومت پاکستان نے شروع ہی سے اس بات پر زور دیا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق سربراہ ریاست کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ ریاست کے عوام کی مرضی کے مطابق عمل میں لایا جانا چاہئے۔ اور ریاست میں رائے شماری کا اصول مسئلہ کشمیر کے تمام فریق تسلیم کرتے ہیں۔ سلامتی کونسل

نے الحاق کے مسئلے پر ضمنی قرار دادیں بھی اب تک منظور کی ہیں۔ ان سب میں واضح طور پہ یہ بات کہی گئی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کے بھارت یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا قطعی فیصلہ صرف رائے شماری کے جمہوری طریقے سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اور آج تک سلامتی کونسل اپنے اسی موقف پہ قائم ہے۔

اگرچہ تمام فریق اس بات پہ اتفاق رکھتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کا فیصلہ کرنے کا واحد طریق کار رائے شماری ہے۔ اور اسی اصول کے ماتحت اقوام متحدہ یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن بھارتی حکومت کا یہ رویہ اس مقصد کے حصول کی راہ میں ہمیشہ سب سے بڑی رکاوٹ بنا رہا ہے۔ اقوام متحدہ اس نتیجے پہ پہنچنے کے بعد ریاست میں رائے شماری کروانے کے لئے اپنا ناظم رائے شماری بھی مقرر کر چکی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ نوبت نہ آئی کہ وہ اپنا یہ عہدہ سنبھال کر ریاست میں رائے شماری کا کام شروع کروا سکے۔ اس تاخیر کی ایک بڑی وجہ ریاست سے غیر ملکی فوجوں کے انخلاء کا مسئلہ ہی ہے کہ جس نے آج تک تنازعہ کشمیر کو دونوں ملکوں کے درمیان معلّق کر کے رائے شماری کے مرحلے پہ آگے بڑھنے سے روک رکھا ہے۔ جہاں تک ریاست سے غیر ملکی افواج کے انخلاء کا تعلق ہے یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان اور آزاد کشمیر کی حکومتیں اس مسئلے پہ نہایت معقول موقف اختیار کرتی اور بھارت کو اس ضمن میں ہر ممکن رعایت دینے کی کوشش کرتی رہی ہیں مگر بھارت اس معاملے میں کبھی بھی تعاون کرنے پہ آمادہ نہیں ہوا۔

اگر ریاست میں کسی وقت بھی رائے شماری کروائی جائے تو مجھے اس کے نتائج کے بارے میں پہلے کبھی شک تھا اور نہ آج کوئی شبہ ہے کہ ریاستی عوام پاکستان کے حق میں رائے دینگے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ ریاست کے اسی فیصدی باشندے مسلمان ہیں۔ یہ مسلمان باشندے ریاست کی مختلف سیاسی جماعتوں سے بھی ہمدردیاں رکھتے ہوں گے۔ جن میں سے ایک جماعت "کل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس" کے نام سے ریاست میں کام کرتی ہے اور جہاں تک ریاست کے

قوم پرست رہنماؤں کا تعلق ہے اُن کی کثیر تعداد کل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس سے ہمدردیاں رکھتی ہے اور یہ سیاسی جماعت بھارتی نیشنل کانگرس سے ہمدردیاں رکھتی ہے۔ یہ قوم پرست دو قومی نظریئے پر یقین نہیں رکھتے۔ جس کی بنیاد پر کہ پاکستان قائم کر کے برصغیر کی تقسیم عمل میں لائی تھی۔ اس نظریئے کی بنیاد پر قوم پرست راہنما یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ریاستی عوام کی اکثریت ریاست کا بھارت سے الحاق چاہتی ہے اور جیسا کہ وہ بزعم خویش ریاست کا الحاق بھارت سے کر بھی چکے ہیں مگر پاکستان اور جموں کی آزاد حکومت کا یہ دعویٰ ہے کہ ریاست کے عوام کی اکثریت ریاست کا پاکستان سے الحاق چاہتی ہے۔ اور اس کی حمایت کشمیر کے مسلمان باشندوں کے علاوہ ہندو باشندے بھی کرتے ہیں کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ دعویٰ تو یقینی طور پر کیا جاسکتا ہے کہ ریاست کے پچانوے فیصد مسلمان باشندے ریاست کے پاکستان سے الحاق کے حامی ہیں۔ اور اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کشمیری عوام کی ایک ایسی محدود تعداد بھی موجود ہے جو "نیشنل کانفرنس" کے پروگرام سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ ریاست کے بھارت سے الحاق کی بھی لازمی طور پر حمایت کریں گے یا کرتے ہیں۔ اور اس معاملے کی صورت حال کچھ اسطرح ہے کہ "نیشنل کانفرنس" کے ایسے رہنما تو موجود ہیں جو ریاست میں کسی قوم پرست مسلمان رہنما کو وزیراعظم بنانے کے حق میں ضرور ووٹ دیںگے۔ لیکن ریاست کے مسئلہ الحاق پر وہ بھی ریاست کے بھارت سے الحاق کے حق میں رائے نہیں دیں گے۔ اور اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی بھی وقت غیر جانبدار مبصرین کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ بعض قوم پرست رہنما دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی جماعت کے پیروکار نیشنل کانفرنس کا رکن ہونے کی وجہ سے لامحالہ بھارت سے الحاق کے حق میں رائے ظاہر کریں گے لیکن ان قوم پرست راہنماؤں کا یہ دعویٰ بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا جب تک کہ رائے شماری کروانے کے بعد اس کا ثبوت نہ مہیا کر دیا جائے۔ کیونکہ گزشتہ اٹھارہ سال کے دوران اب صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے، جبکہ شیخ عبداللہ

اور اُن کے رفقائے کار نے بھی نیشنل کانفرنس سے قطع تعلق کر کے ریاست میں اپنی ایک نئی جماعت قائم کر لی ہے۔

اگر ریاست میں ۴۸-۱۹۴۷ء کے دوران یا ۱۹۵۰ء میں رائے شماری کروائی جاتی تو ریاست کے اسی فیصد عوام پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں رائے ظاہر کرتے لیکن چونکہ اس کے بعد حالات کسی قدر تبدیل ہو چکے ہیں اور بھارت کی کٹھ پتلی ریاستی حکومت نے ریاست میں زیادہ مضبوطی سے قدم جما کر حالات کو اپنے ڈھب پہ لانے کی جد و جہد شروع کر رکھی ہے۔ لہٰذا ریاست میں رائے شماری کے نتائج پہ کچھ فرق بھی پڑ سکتا ہے: تاہم مجھے اس بات کا اب بھی یقین کامل ہے کہ حالات کی یہ تبدیلی رائے شماری کے نتائج میں کوئی ایسی فیصلہ کن تبدیلی نہیں لا سکتی کہ وہ بھارت کے حق میں چلی جائے۔ اس لئے آج بھی اگر اقوام متحدہ کی آزادانہ و غیر جانبدارانہ نگرانی میں ریاست میں منصفانہ رائے شماری کروائی جائے تو ریاست کے عوام بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں رائے ظاہر کریں گے۔ اور رہا یہ دعویٰ اب بھی اپنے اندر اسی قدر صداقت رکھتا ہے جس قدر کہ ۴۸-۱۹۴۷ء میں رکھتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھارتی حکومت ریاست میں اخلاقی اور مادی اعتبار سے اپنا وقار بالکل کھو چکی ہے اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی وفات کے بعد تو ریاست میں بھارتی حکومت کی ساکھ اور بھی زیادہ گر چکی ہے۔

بعض سیاسی راہنما ریاست میں علاقائی طور پہ رائے شماری کروانے کی تجویز بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ جس کے مطابق ریاست کو مندرجہ ذیل علاقوں میں تقسیم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

(الف) دریائے چناب کے ساتھ ساتھ کا علاقہ کٹھوعہ، جموں اور اودھم پور کے اضلاع اور ریاسی کا کچھ حصہ۔

(ب) ضلع جموں کا باقی علاقہ یعنی میر پور ضلع ریاسی کا کچھ علاقہ اور پونچھ کے کچھ علاقے۔

(ج) آزاد کشمیر کا علاقہ جس میں ضلع میر پور کا کچھ علاقہ۔ پونچھ اور میر پور اضلاع کے

کچھ علاقوں کے علاوہ لداخ کے کچھ علاقے اور گلگت بھی شامل ہے

(د) وادیٔ کشمیر کا سارا علاقہ

لیکن اگر ہم کسی وجہ سے ساری ریاست میں رائے شماری کروانے کا منظور شدہ فیصلہ ترک کر کے ریاست میں مندرجہ بالا قسم کی علاقائی رائے شماری کروانے کے منصوبے پر عملدرآمد ہونے کے لئے رضامند ہو جائیں۔ تو اس کا صاف الفاظ میں مطلب یہ ہو گا کہ ہم اپنے موقف سے ہٹ کر پہلے ہی ریاست کی تقسیم کو قبول کر لیتے ہیں اور اس منصوبے کا مقصد یہ بھی ہو گا کہ ریاست کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور ان علاقوں میں علیحدہ علیحدہ رائے شماری کے ذریعے یہ فیصلہ کیا جائے کہ کونسا علاقہ بھارت کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے۔ اور کون سا علاقہ پاکستان سے الحاق کا خواہشمند ہے۔ لہٰذا اس منصوبے کے تحت رائے شماری کے ذریعے بالفرض اگر دریائے چناب کے ساتھ کا علاقہ جس میں ہندو اکثریت ہے اور یہ بھارت سے ملحقہ علاقہ بھی ہے، بھارت کے ساتھ شمولیت کے حق میں رائے ظاہر کرے تو بھارتی حکومت اس حصہ کو فوراً غیر مشروط طور پر بھارت میں شامل کرنے کا مطالبہ کرے گی۔ لہٰذا میں ریاست کے تمام علاقوں میں رائے شماری کے متوقع نتائج پر روشنی ڈالنے سے پیشتر اس منصوبے کے تحت ریاست کی علاقائی تقسیم کے بارے میں وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

بھارتی حکومت ریاست کو تقسیم کرنے کی اصولی طور پر مخالف ہے۔ حکومت پاکستان بھی کسی طرح ریاست کی تقسیم نہیں چاہتی۔ اور ایک دو سیاسی جماعتوں کے علاوہ ریاست کی تمام سیاسی جماعتیں بھی اس منصوبہ کی مخالف ہیں۔ جبکہ اقوام متحدہ کی طرف سے بھی ریاست کو تقسیم کرنے کی کوئی تجویز نہیں پیش کی گئی۔ البتہ سفارتی سطح پر ایک اس قسم کی تجویز ضرور پیش کی گئی تھی کہ ریاست کی اسطرح علاقہ وار تقسیم کر لی جائے کہ ریاست کے بھارت سے ملے ہوئے اور ہندو اکثریت کے علاقے بھارت میں چلے جائیں۔ مگر ریاست کی تقسیم تو اس صورت میں کی جاسکتی ہے کہ فریقین اسپر رضامند ہوں اسکے بغیر عملدرآمد ممکن نہیں ہے اور اگر بھارت مستقبل میں اتنا مجبور ہو جائے کہ ریاست

کی تقسیم کا منصوبہ تسلیم کرے تو پھر بھی پاکستان کے لئے کم از کم اس منصوبے پر رضامند ہونا بہت دشوار امر ہے۔ کیونکہ اگر دریائے چناب کے اس پار کا علاقہ بھارت کے قبضہ میں چلا جائے تو پاکستان کی اقتصادی اور دفاعی حالت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ مگر پاکستان چونکہ شروع سے ہی تمام ریاست میں رائے شماری کرواتے ہوئے اس کے مجموعہ نتیجہ کی بنیاد پر ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقف اختیار کئے ہوئے ہے لہذا اس کے لئے اب اپنے اس موقف سے روگردانی کرنا ممکن نہیں اور یہ مجبوری کسی حد تک بھارت کے ساتھ بھی ہے ——— مگر جہاں تک ریاست کی سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے انہوں نے ابھی تک کسی متبادل حل کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ لیکن اگر عالمی امن کے تحفظ کی خاطر ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی آخری کوشش کے طور پر یہ فیصلہ ریاست کی سیاسی جماعتوں کے سپرد کر بھی دیا جائے تو اس مسئلہ پر نہایت وسیع نادیہ نظر رکھتے ہوئے غور و خوض کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پاکستان اور بھارت کے درمیان نہری پانی کے متبادل انتظامات کے متعلق ایک معاہدہ کیا جا چکا ہے جس کے پیش نظر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا بھی اتنا مشکل نہیں ہے اور بعض سیاسی حلقوں میں اب ریاست کی تقسیم کا منصوبہ بھی قابل قبول و عمل محسوس کیا جانے لگا ہے۔

ریاست میں علاقہ وارانہ رائے شماری کے نتائج سے متعلق بلا شک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ:-

(الف) دریائے چناب کے اس پار کے علاقوں ادھم پور، جموں اور کٹھوعہ میں بھارت کو اکثریت میں ووٹ حاصل ہونگے۔

(ب) جموں کے باقی علاقوں اور ریاست کے دوسرے تمام علاقوں میں پاکستان کے حق میں زیادہ ووٹ ڈالے جائیں گے۔

مگر مجموعی طور پر اس علاقہ وارانہ رائے شماری کا بھارت کے حق میں صرف یہی نتیجہ نکلیگا کہ کٹھوعہ، جموں اور ادھم پور کے علاقوں میں بھارت کو زیادہ ووٹ مل جائیں۔ کیونکہ

یہ علاقے ہندو اکثریت کے ہیں اور بھارت کی سرحد سے ملے ہوئے بھی ہیں۔

بعض سیاسی حلقے کچھ عرصہ سے مسئلہ کشمیر کے ایک تیسرے حل پر بھی غور کرنے لگے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کی ایک مکمل طور پر آزاد و خود مختار جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ مگر موجودہ حالات میں ریاست جموں و کشمیر کی مکمل طور پر آزاد اور خود مختار حکومت کے قیام کا منصوبہ قابل عمل نہیں ہے۔ اور ایک اس قسم کی حکومت کا قائم رہنا بہت مشکل نظر آتا ہے کیونکہ اس منصوبے کی نفی کرنے والی بعض وجوہ جذباتی اور نفسیاتی نوعیت بھی رکھتی ہیں۔ اور اگر اس منصوبے پر غیر جذباتی ہو کر سوچا جائے تو اس سے ذہن میں مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(الف) کیا مالی و اقتصادی لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر کی آزاد و خود مختار حکومت کا قیام ممکن ہے۔

(ب) کیا ریاست کے معاشی و اقتصادی حالات اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ ریاست کی سرحدوں کے تحفظ کے لئے کسی قسم کی کوئی مستقل فوج قائم کی جا سکے۔

(ج) کیا ایک آزاد و خود مختار ریاست کی صورت میں اس بات کا خطرہ تو نہیں ہے کہ ریاست بین الاقوامی سطح کی سازشوں کا اکھاڑہ بن جائے۔ کیونکہ ریاست کی سرحدیں کئی ملکوں کی سرحدات سے ملتی ہیں۔

(د) کیا اقتصادی طور پر خوراک اور تجارت کے نقطۂ نظر سے ریاست جموں و کشمیر ایک مکمل طور پر آزاد و خود مختار ریاست رہ سکتی ہے۔

(س) کیا خود مختار ریاست جموں و کشمیر پاکستان یا بھارت کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

(ص) کیا بھارت، پاکستان اور خود مختار ریاست جموں و کشمیر اسی قدر باہمی طور پر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جسقدر کہ ریاست کے کسی ایک ملک سے الحاق کی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ چند ایسے بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب کوئی جذباتی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنا نہایت ضروری ہے ——— مگر جہاں تک ریاست کے رقبے اور آبادی کا تعلق ہے اس ریاست میں ایک آزاد و خود مختار حکومت کا قیام ممکن نظر آتا ہے اور یہ ریاست ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بن سکتی ہے۔ جہاں ساری دنیا کے سیاح آکر اپنی فراغت اور سیر و تفریح کے ایام نہایت سکون و اطمینان سے گزار سکتے ہیں۔ اور یہ سیاح لوگ جہاں اپنے غم و تفکرات سے یہاں آکر نجات حاصل کر سکتے ہیں وہاں ریاست میں اپنے قیام کے دوران کچھ رقم بھی جو فراغت سے خرچ کر سکیں گے۔ کشمیری عوام اور ریاست کی آمدنی کا ذریعہ بن جائے گی۔ مگر یہ اس تصویر کا صرف ایک پہلو ہے۔ اور اگر اس مسئلے پہ دوسرے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے تو یہ منصوبہ قطعی طور پہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتا جب تک کہ کوئی بیرونی ملک کثیر مقدار میں مالی و معاشی امداد فراہم کر کے ریاست کو اس کے پاؤں پہ نہ کھڑا کر دے، یہاں ایک آزاد و خود مختار حکومت کا قیام ممکن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ بفرض محال اگر اس آزاد ریاست کے بھارت اور پاکستان دونوں سے تجارتی تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں تو ریاست کی تجارت کا جو انجام ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اور اگر ریاست کی تجارت اس طرح ناکام ہو جاتی ہے تو کیا وہ اس صورت میں اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے۔ اور اپنی ان مالی مشکلات پر قابو پا سکتی ہے؟ ایسی حالت میں لامحالہ ریاست کو اپنی آزادی و خود مختاری اپنی حالت کے پیش نظر دوبارہ کسی دوسرے ملک کو پیش کرنا پڑے گی۔ لہذا راقم الحروف کے خیال میں بھی ریاست کی ایک آزاد و خود مختار حکومت کا قیام ان حالات میں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ بحالات موجودہ اسے ہر ہر قدم پہ ریاست کی تجارت اور مالی امداد کے لئے دوسرے ملکوں سے سودا بازی کرتے ہوئے اپنی آزادی و خود مختاری کو ہمیشہ خطرے میں محصور رکھنا پڑے گا۔ اور ریاست کی آزادی و خود مختاری کو قائم رکھنے کے لئے سب سے اہم سوال یہ ہوگا کہ کیا یہ آزاد حکومت اپنے محدود وسائل کی بنا پہ اپنے تحفظ و سلامتی کے لئے ایک مستقل

فوج اڑوس پڑوس کے زبردست قسم کی فوجی قوت رکھنے والے ممالک کے مقابلے میں رکھ سکیگی جو ریاست کی آزادی کی ضمانت دے سکے؟ اس سوال کا جواب صرف نفی میں دیا جاسکتا ہے کیونکہ ریاست کے مالی وسائل اس قدر محدود ہیں کہ وہ ایک باقاعدہ مستقل فوج بالکل نہیں رکھ سکتی۔ اور یہ سمجھ لینا ایک حماقت سے کم نہ ہوگا کہ ریاست کی خودمختار حکومت اتنی فوج بھی رکھ سکتی ہے کہ بوقت ضرورت اپنے کسی بھی حریف ہمسایہ ملک سے جنگ کر کے اپنی مدافعت کر سکے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر جن ملکوں سے ریاست کی سرحدیں ملتی ہیں آزاد حکومت کو اپنی آزادی وسلامتی برقرار رکھنے کیلئے ہمیشہ اِن کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر لگی رہیگی تاکہ کسی نہ کسی طرح وہ ریاست کی آزادی برقرار رکھنے کی ضامن بن سکے۔ پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے پاکستان اور پھر بھارت بھی ریاست کی اس آزاد و خودمختار حکومت تسلیم کریں اور اس کے بعد یہ دونوں ملک بین الاقوامی سطح پر بھی اس بات کی ضمانت دیں کہ وہ ہمیشہ ریاست جموں وکشمیر کی خودمختار و آزاد حیثیت کا احترام کریں گے۔ اس کے بعد ریاست جموں و کشمیر کی یہ حکومت پاکستان کے ساتھ اپنے دفاع اور خارجہ مواصلات و برآمدی و درآمدی تجارت کے متعلق بھی معاہدے کر سکتی ہے۔ اور صرف پاکستان کے ساتھ ہی ریاست کے لئے اس قسم کے معاہدے نہایت ضروری بھی ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر ریاست کا بنیادی کاروبار بالکل نہیں چل سکتا۔

اس کے علاوہ ایک اور صورت بھی قابل غور ہو سکتی ہے۔ اور وہ ہے جموں وکشمیر کی ایک نیم خودمختار ریاست کے قیام کا منصوبہ! مگر اس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ پہلے پاکستان اور اس کے بعد بھارت دونوں ہی ریاست میں ایک نیم خودمختار حکومت کے قیام کی ضمانت دیں۔ علاوہ ازیں اقوام متحدہ یا کوئی بین الاقوامی ادارہ بھی ریاست کی نیم آزاد حکومت کے تحفظ و بقا کی ذمہ داری قبول کرے اور اس کے بعد

ہی جاکہ اس منصوبے کے تحت ریاست میں وہاں کی تمام سیاسی جماعتوں کی مخلوط حکومت قائم کی جاسکتی ہے جسے پھر کم ازکم دس سال یہ موقع دیا جائے کہ وہ ریاست کی ترقی و خوشحالی کیلئے کام کر سکے۔ اور اس دوران یہ حکومت ریاست میں تعلیم عام کرنے کے لئے بھی وسیع تر قومی و عوامی مفاد کے مطابق منصوبہ بندی کے ذریعہ کام کرے۔ دس سال کے عرصہ میں بھی جب تک کہ ریاست میں تعلیم عام نہ ہو جائے پاکستان اور بھارت دونوں ریاست کو مالی امداد فراہم کریں نیز ریاستی عوام کو اس عرصہ میں زیادہ سے زیادہ سماجی و سیاسی آزادی بھی دی جائے۔ اور اس کے بعد یہ مخلوط حکومت ریاست میں عالمی عدالت یا کسی بین الاقوامی ادارے کی نگرانی میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ رائے شماری کروالے تاکہ یہاں کے عوام اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔ مگر اس رائے شماری سے قبل پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں اس بات کی بھی ضمانت دیں کہ وہ رائے شماری کے نتیجے کو ہر صورت منظور کر لیں گی۔ موجودہ حالات میں پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ تنازعہ کشمیر کا کوئی قابل عمل اور منصفانہ حل تلاش کرنے کی خاطر غور و فکر اور تدبّر سے کام لیں۔

آخر میں راقم الحروف یہ کہنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ اگر ریاست جموں و کشمیر کا پاکستان سے الحاق نہ ہو سکے گا تو سب سے زیادہ نقصان بھی پاکستان کو برداشت کرنا پڑے گا کیونکہ اس کے بغیر پاکستان کی آزادی و سلامتی ہمیشہ خطرے میں پڑی رہے گی۔ لیکن اگر ریاست میں رائے شماری کے ذریعے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی بجائے کوئی اور حل تلاش کیا جاتا ہے تو اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ پہلے یہ حل پاکستان کے لئے اور اس کے بعد ریاست جموں و کشمیر کے عوام کے لئے بھی قابلِ قبول ہو۔ علاوہ ازیں یہ حل جمہوری طرزِ فکر کا آئینہ دار ہونا بھی ضروری ہے۔

(۱۹)

قضیۂ کشمیر کا مستقبل

پیغمبرانہ انداز کی پیشگوئیوں کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ یہ بات مناسب ہوتی ہے کہ بے بنیاد قسم کے دعوے یا پیشگوئیاں کر کے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جائے مگر یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ برصغیر ہند و پاکستان پر اس قضیئے کے بڑے گہرے اثرات پڑ رہے ہیں۔ کیونکہ محض اسی ایک مسئلے کے حل پر ہی برصغیر کے کئی دوسرے اصل اور بنیادی مسائل کے حل کا بھی دار و مدار ہے۔ پھر تنازعۂ کشمیر بین الاقوامی صورتِ حال پر جو پہلے ہی بہت زیادہ کشیدہ ہو رہی ہے۔ بھی بڑا گہرا اثر ڈال رہا ہے۔ ادھر ویت نام ہند چینی اور فارموسا کے مسائل پر بھی عالمی جنگ چھڑ جانے کا ہر وقت خطرہ موجود ہے۔ جن کی وجہ سے بین الاقوامی حالات میں اس قدر کشیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی وقت بھی ہم اپنے آپ کو اپنی خواہش کے خلاف تیسری عالمگیر جنگ کی لپیٹ میں آجانے پر مجبور پائیں۔ کیونکہ موجودہ صدی کے اس نصف آخری دور میں بین الاقوامی نوعیت کے اس قدر گوناگوں اور پیچیدہ مسائل ہماری روزمرہ زندگی کو متاثر کرتے رہتے ہیں کہ کسی بھی پیش پا افتادہ مسئلے کے انجام سے متعلق کوئی قطعی اور فیصلہ کن رائے پیش کرنا نہ صرف نامناسب بلکہ غیر دانشمندانہ بھی سمجھا جائے گا۔

سلامتی کونسل کے مسئلہ کشمیر حل کرنے میں ناکامی کی وجہ سے ایسے حالات پیدا کر

دیئے گئے ہیں۔ جسے کسی صورت میں بھی تسلی بخش اور قرین انصاف نہیں کہا جاسکتا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ بھارت مسئلہ کشمیر کے متعلق اپنے رویہ میں آج اٹھارہ سال بعد بھی ذرہ برابر تبدیلی پیدا نہیں کی ہے۔ بلکہ بھارت کی فرقہ پرست مذہبی جماعتوں جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا وغیرہ نے تو پاکستان اور خاص طور پر کشمیر کے بارے میں اپنی معاندانہ سرگرمیاں اور زیادہ شدت سے تیز کردی ہیں۔ بھارت کی یہ نیم سیاسی و مذہبی جماعتیں پاکستان اور بھارت کے درمیان مصالحت کی ہر کوشش کو علی الاعلان ناکام بنانے کی سرگرمیوں میں ہمیشہ مصروف رہتی ہیں۔ بلکہ جن سنگھی اور مہاسبھائی لیڈروں نے بار ہا واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ تقسیم ہند کا منصوبہ ان کے لئے کبھی بھی قابل قبول نہیں تھا۔ لہٰذا وہ پاکستان کو بھارت میں دوبارہ مدغم کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ علاوہ ازیں یہ فرقہ پرست ہندو جماعتیں کٹھوعہ، جموں، اُدھم پور اور ریاست کے کئی دوسرے علاقوں میں احتجاجی مظاہرے بھی کروا رہی ہیں۔ ریاست میں پرجا پرشید جیسی بدترین فرقہ پرست تنظیم کے ان مظاہروں کا مقصد درج ذیل مطالبوں کے سلسلے میں ہے۔

(ا) ریاست جموں و کشمیر میں بھی بھارتی آئین حکومت کا نفاذ۔

(ب) ریاست میں دوبارہ ایک ایسی ذمہ دار حکومت کا قیام جس کا آئینی طور پر سربراہ ریاست کا مہاراجہ ہی ہو۔

(ج) جس طرح بھارتی آئین کے مطابق بھارتی جاگیرداروں سے ان کی اراضی لے کر انہیں معاوضہ دیا گیا ہے اسی طرح ریاست کے ہندو جاگیرداروں کو بھی ان کی جاگیروں کا معاوضہ ادا کیا جائے۔

(د) ریاست میں گائے کشی پر پابندی عائد کی جائے۔

جموں کے ہندو باشندے ریاست کا بھارت سے علی الاعلان اور مکمل طور پر الحاق کروانا چاہتے ہیں۔ جبکہ بھارت کی کانگریسی حکومت ریاست کا بھارت سے جبری الحاق

کرنے کیلئے نام نہاد آئینی طریقے تلاش کر رہی ہے - اور اس مقصد کیلئے اب کل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کا بھی بھارت کی کل ہند نیشنل کانگریس سے الحاق کیا جا رہا ہے —— حد تو یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کی نام نہاد قوم پرست حکومت ریاستی عوام کے کسی طبقے کو بھی اب تک مطمئن کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی - اور جموں کی ہندو آبادی بھی یہ خیال کرتی رہی ہے کہ ریاست کی نئی قوم پرست حکومت کے دور میں بھی وہ اسی طرح غلام ہیں جس طرح کہ وہ برطانوی دور حکومت میں غیر ملکی حکمرانوں کے غلام تھے - غرضکہ ریاستی عوام کے ہر طبقے کو یقین ہو چکا ہے کہ ریاست کی نام نہاد قوم پرست حکومت مستقبل میں بھی اب ریاستی عوام کی فلاح و بہبود کیلئے کوئی تعمیری کارنامہ سرانجام نہیں دے سکے گی - اور آج یہ قوم پرست ٹولہ اپنی کارکردگی کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس وجہ سے اقتدار حاصل کئے ہوئے ہے کہ اُسے بھارتی حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے - کچھ اسی قسم کی صورت حال دوسری طرف آزاد کشمیر کے عوام بھی محسوس کرتے ہیں جنہیں اب تک سیاسی اعتبار سے بہت نقصان پہنچا ہے - البتہ اسکی اقتصادی و مواصلاتی ترقی جواب تک ہوئی ہے - ایسی نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے -

جموں کے ہندو باشندوں کی تحریک نے اس بات کا امکان بھی پیدا کر دیا ہے کہ جموں کے بعض علاقے بھارت کے قبضہ میں چلے جائیں - کیونکہ ان علاقوں میں ہندو باشندوں کی اکثریت ہے - جبکہ یہاں سے تقریباً تمام مسلمان باشندوں کو مجبور کر کے رفتہ رفتہ نکال دیا گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ان علاقوں میں آباد مسلمان باشندوں کو یا تو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے - یا ان کو گھروں سے نکال کر زبردستی پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا ہے تاکہ ان علاقوں میں قطعی طور پر ہندو باشندوں کی اکثریت ہو جائے - اور چونکہ یہ علاقہ بھارت کی سرحد سے ملحق بھی ہے اس لئے عجب نہیں کہ اگر یہ علاقہ خود بخود بھارت کے مستقل قبضہ میں

آجائے ۔ کیونکہ مقبوضہ کشمیر کے ہندو راہنماؤں نے مقبوضہ کشمیر کی قوم پرست حکومت کے خلاف بھی اپنا محاذ بنالیا ہے کیونکہ یہ حکومت بھارت کی کٹھ پتلی حکومت سے زیادہ حیثیت ریاستی عوام کیلئے نہیں رکھتی ۔ آنجہانی پنڈت جواہر لعل نہرو نے جو قوم پرست حکومت کی آڑ میں ریاست جموں و کشمیر پر حکومت کرتے رہے ہیں متعدد بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ ریاست کا بھارت سے قانونی الحاق مکمل ہو چکا ہے ۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ مقبوضہ کشمیر کے ان ہندو راہنماؤں کو بھی مطمئن نہیں کر سکا ۔ جنہیں بھارت کی کٹر مذہبی اور انتہا پسند ہندو جماعتوں کی پشت پناہی حاصل ہے اور اس کا تفصیلی ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔ ایک مرتبہ تو ان فرقہ پرست ہندو جماعتوں کی احتجاجی تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ خود پنڈت نہرو بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ ریاست میں فرقہ پرستی سر اٹھا رہی ہے اور انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاست کے عوام بھارت کے ساتھ نہیں ہیں لیکن اگر پنڈت نہرو اپنے اس خیال کو ۴۸-۱۹۴۷ء میں ہی قضیۂ کشمیر حل کرنے کے سلسلے میں بھارت کی بنیادی پالیسی کے طور پر اختیار کر لیتے تو مسئلہ کشمیر کا حل آج اتنا مشکل نظر نہ آتا جتنا کہ بعض سیاسی راہنماؤں کو اس تنازعہ کا حل دور نظر آرہا ہے ۔ اگر بھارتی حکومت آج بھی قضیۂ کشمیر پر اسی نقطۂ نظر سے خلوص نیت کے ساتھ غور و فکر کر کے اس کا حل تلاش کرنے پر آمادہ ہو جائے اور سچے دل سے اس مسئلے کو انہی بنیادوں پر ختم کرنے کی کوشش کرے کہ جن بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم کا اصول وضع کر کے اس پر عمل درآمد کیا گیا تھا تو یہ قضیہ بغیر کسی جنگ و جدال کے صرف باہمی بات چیت کے ذریعے ہی نپٹایا جا سکتا ہے ۔ اور اس تنازعہ کو ختم کرنے کیلئے ہتھیار سنبھال کر عالمی امن کو خطرے میں ڈالنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ۔

ریاستی ہندوؤں کی اس احتجاجی تحریک پر نظر ڈالی جائے جو تنازعہ کشمیر کے حل سے گہرا تعلق رکھتی ہے تو یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جموں کے ہندو باشندے ریاست کے

مستقبل کا فیصلہ کرنے کیلئے رائے شماری کروانے پر بالکل رضامند نہ ہوں گے۔ جبکہ ۱۱ اکتوبر ۵۲ء کو پرجا پریشد کے صدر پنڈت پریم ناتھ ڈوگرہ نے ٹائمز آف انڈیا کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا بھی تھا کہ ریاست بھر میں مجموعی طور پر رائے شماری کروانا ریاستی عوام کے لئے خودکشی کے مترادف ہوگا۔ یہ رائے شماری اگر ناگزیر ہو تو صرف وادی کشمیر تک ہی محدود رہنی چاہیئے۔ علاوہ ازیں بھارت کی کئی دوسری انتہا پسند سیاسی و مذہبی جماعتوں نے بھی متعدد بار اسی نقطہ نظر کی حمایت کی ہے کہ جموں کا علاقہ بغیر رائے شماری کے غیر مشروط طور پر بھارت میں شامل ہونا چاہیئے اور جن سنگھ کے صدر آنجہانی ڈاکٹر مکرجی نے ۱۵ اگست ۵۲ء کو "سٹیٹس مین" میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک ریاست جموں و کشمیر کی تمام ریاست کے بھارت سے الحاق کو تسلیم نہیں کیا جاتا اس وقت تک جموں کے باشندے اپنے آپ کو وادی کشمیر کے باشندوں کے ساتھ شامل کرنے کو تیار نہیں ہیں اور اگر یہاں کے عوام کے اس فطری جذبہ کو دبانے کی کوشش کی گئی تو اس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ اور جموں کے عوام کی ریاست سے علیحدگی یقینی ہو جائے گی اور جموں کے ہندو باشندوں کے ان جذبات کو اگر یہ سمجھ کر نظر انداز کیا گیا کہ یہ مٹھی بھر فرقہ پرست اور انتہا پسند ہندو راہنماؤں کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے تو یہ حکومت بھارت کی سخت غلطی ہوگی۔

ان بیانات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بھارت اور مقبوضہ کشمیر کے ہندو راہنما ریاست میں مجموعی طور پر رائے شماری کروانے کے بھی سخت مخالف ہیں اور یہی چاہتے ہیں کہ جموں کے کچھ علاقے بہر صورت بھارت میں شامل ہو جانے چاہئیں۔ ان ہندو راہنماؤں کے بیانات اور احتجاجات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ریاست جموں و کشمیر کی تقسیم اس طرح کروانا چاہتے ہیں کہ:۔

(۱) آزاد کشمیر کا علاقہ پاکستان کے حصے میں آئے۔

(ب) پرجا ہندو تحریک کا علاقہ جس میں جموں وغیرہ کے اضلاع شامل ہیں بغیر رائے شماری کروائے غیر مشروط طور پر بھارت میں مدغم کر دیا جائے۔

(ج) وادیٔ کشمیر کے علاقے میں رائے شماری کروائی جائے۔

مگر ریاست کے تمام مسلمان باشندے خواہ وہ قوم پرست ہوں یا نہ ہوں اس مطالبے کے بالکل خلاف ہیں اور ریاست کے مسلمانوں نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ جموں میں مجموعی طور پر مسلمان باشندوں کو اکثریت حاصل تھی۔ لہٰذا بعض ہندو راہنماؤں کا یہ مطالبہ کہ جموں میں چونکہ ہندو باشندوں کو اکثریت حاصل ہے۔ اس لئے یہ علاقہ بغیر رائے شماری کروائے بھارت کے حوالے کر دیا جائے ناقابلِ عمل ہے۔ اور اس سے پوری ریاست جموں وکشمیر کی سالمیت اور استحکام کیلئے بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خود پنڈت نہرو نے بھی ایک بار یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ ریاست کی سالمیت بہر صورت قائم رکھی جائے مگر ان کی وفات کے بعد اب اس امر کا بھی خدشہ ہے کہ بھارت کی موجودہ کمزور حکومت وہاں کے انتہا پسند ہندوؤں کے مطالبے پر سر جھکاتے ہوئے ریاست کی تقسیم کا نظریہ قبول کر لے۔ اور اس سلسلے میں ۷ر اگست ۵۲ء کو کل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے جنرل سیکرٹری مولانا سید مسعودی نے بھارتی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ نعرہ اپنے اندر بڑے تباہ کن خطرات لئے ہوئے ہے کہ جموں اور لداخ کے علاقوں میں ہندو باشندوں کو اکثریت حاصل ہے۔ بلکہ یہ خیال ظاہر کرنا بھی بعید از عقل ہے کہ چونکہ ان علاقوں میں ہندو اکثریت ہے لہٰذا کشمیر کے ان علاقوں کو جن میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، سے ہندوؤں کی اکثریت والے لداخ اور جموں کے علاقوں سے علیحدہ رکھا جائے۔

دراصل انتہا پسند اور کٹر مذہبی ہندوؤں کا یہ نقطۂ نظر کہ جموں ہندوؤں کی اکثریت والا علاقہ ہے۔ ایک بالکل بے بنیاد نظریہ ہے۔ اور اس بعید از قیاس نظریے کی بنیاد

پر جموں کے علاقے کو رائے شماری کے بغیر بھارت میں شامل کرنے کا مطالبہ تو اس سے بھی زیادہ لغو اور بے بنیاد ہے مگر جموں کے انتہا پسند اور رجعت پسند ہندو راہنماؤں نے اپنے اس بے بنیاد نظریئے کا پرچار کرنے کے لئے بھارت کی فرقہ پرست ہندو جماعتوں کی حمایت حاصل کر رکھی ہے۔ خود پنڈت نہرو نے ۲۳ دسمبر ۵۲ء کو بھارتی پارلیمینٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ریاستی پرجا پریشد کے راہنماؤں نے بھارت کی بعض سیاسی جماعتوں سے خاص طور پر پنجاب اور دہلی کی سیاسی جماعتوں سے رابطہ پیدا کر رکھا ہے۔ پرجا پریشد کے ایک وفد نے حال ہی میں پنجاب اور بھارت کے دوسرے علاقوں کا دورہ کیا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ جس کا مقصد پرجا پریشد تنظیم کے لئے رضاکار پیدا کرنا اور اس مقصد کے لئے جالندھر، لدھیانہ اور امرتسر میں شاخیں قائم کرنا بھی ہے تاکہ پرجا پریشد تنظیم جموں کے علاقے میں اپنی منظم تحریک چلا سکے۔ ہمیں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ پرجا پریشد کے اس وفد نے پنجاب اور دہلی میں چندہ بھی جمع کیا ہے۔ اور اس نے اشیائے خوردنی و اسلحہ بارود کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔

پاکستان اور ریاست جموں و کشمیر کے خلاف ہر صورت حال کا مقابلہ کر کے بھی ریاست جموں و کشمیر پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمائے رکھنے کیلئے بھارت میں شروع سے ہی ہر قسم کی تیاریاں بڑے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ مگر اب امریکہ کی طرف سے بھارت کیلئے مونہہ مانگی اسلحہ و بارود اور جدید ترین جنگی ہتھیاروں کی امداد نے صورت حال ہی بالکل مختلف پیدا کر دی ہے اور پنڈت نہرو کی وفات کے بعد بھارت کے نئے وزیر اعظم مسٹر لال بہادر شاستری کے دور میں بھارتی حکومت نے پاکستان کے ساتھ اپنے رویے میں زیادہ معاندانہ و مخاصمانہ سختی پیدا کر لی ہے۔ لہذا اب آئندہ اس امر کا کوئی بھی امکان نظر نہیں آتا کہ بھارتی حکومت کسی معاملے میں بھی پاکستان سے صلح و صفائی

کا موقف اختیار کرے گی۔ جبکہ بھارت نے مقبوضہ کشمیر کا بھارت سے جبری الحاق کرنے کیلئے آخری اقدامات بھی کرنا شروع کر دیئے ہیں اور اب وہ یہ بات بھی بالکل نظرانداز کر رہا ہے کہ پاکستان اس کے ردِ عمل میں کیا اقدام کرے گا۔ تاہم اگر ٹھنڈے دل سے ان حالات کا تجزیہ کیا جائے جو بھارت نے اپنے اس قسم کے مخاصمانہ رویے کی بدولت پیدا کر رکھے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ بھارت نے پاکستان کے ساتھ جو طرزِ عمل ایک مسئلے پر اختیار کیا ہے وہی دوسرے نزاعی معاملات پر بھی اختیار کرے گا۔ حالانکہ اگر پاکستان اور بھارت اپنے باہمی تنازعات کا پرامن طریقہ سے بات چیت کے ذریعے تصفیہ کر لیں تو میرے خیال میں دونوں میں سے کسی ملک کو بھی کسی طاقت ور بلاک کے ساتھ شامل ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دوسری طرف اب یہ بات بھی بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعے مسئلہ کشمیر کا کوئی قابلِ عمل اور فیصلہ کن حل نکلنا روز بروز ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر پہلے بھی بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ سلامتی کونسل اس معاملے میں ایک با اختیار عدالت کی حیثیت نہیں اختیار کر رہی جو فریقین کے بیانات سننے کے بعد اپنا فیصلہ صادر کر کے اس پر عمل درآمد بھی کروا سکے۔ بلکہ اس ضمن میں سب سے بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ سلامتی کونسل محض ایک مصالحت کنندہ کا بے عمل کردار ادا کر رہی ہے جو کسی تنازعہ پر فریقین کے سامنے اپنی مصالحتی تجاویز پیش کر کے فریقین کو صرف زبانی طور پر ان تجاویز پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ کیونکہ سلامتی کونسل اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے سامنے اپنی مختلف مرحلوں کی تجاویز پیش کرنے کے علاوہ اب تک عملاً کچھ بھی نہیں کر سکی جبکہ یہ فیصلہ فریقین کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ان تجاویز کو تسلیم کر کے اس پر عمل درآمد بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ دونوں ملکوں کے سامنے منظوری یا استرداد کے لئے اپنی تجاویز پیش کرنے کا یہ سلسلہ سلامتی کونسل میں ایک طویل عرصے سے جاری ہے۔ مگر اس امر کا

اب مستقبل میں بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ سلامتی کونسل مسئلہ کشمیر کو عملی طور پر حل کرنے میں کامیاب بھی ہو سکے گی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سلامتی کونسل کو بھی اب اس بات کا یقین ہو گا کہ تنازعہ کشمیر حل کرنے کیلئے اس کی مزید کوششیں بھی آئندہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکیں گی۔

اگرچہ موجودہ صورتِ حال میں پاکستان اور بھارت دونوں میں سے کوئی ملک بھی زیادہ طویل عرصے تک جنگی اقدامات برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی دل سے تنازعۂ کشمیر پر آپس میں جنگ چاہتا ہے۔ تاہم اگر دونوں ملکوں کے درمیان دوبارہ جنگ شروع ہو گئی تو یہ تمام ایشیائی ممالک کیلئے بھی نہایت تباہ کن نتائج کی موجب ہو گی۔ اور اس سے پاکستان اور بھارت دونوں اقتصادی طور پر کھوکھلے ہو کر تباہ حالی کے خطرات میں گھر جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی آزادی و سالمیت سے ہی محروم ہونا پڑ جائے۔ ان حالات میں توقع کی جا سکتی ہے کہ دونوں میں سے کسی ملک کا سربراہ بھی اپنی حکومت کو جنگ کی خوفناک بھٹی میں کودنے کا مشورہ نہیں دے گا۔

میرے خیال میں تو اب مسئلۂ کشمیر حل کرنے کا آخری طریق کار یہ اختیار کرنا چاہیئے کہ اس تنازعہ پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کم از کم جنگ بالکل نہ ہونے دی جائے بلکہ کشمیری عوام ریاست کی آزادی کیلئے خود جدوجہد کرتے ہیں جس طرح کہ الجزائر، ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں کے عوام اپنی آزادی و خود مختاری کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ کشمیر کی آزادی کیلئے صرف کشمیری عوام کی جدوجہد ہی زیادہ مؤثر و مستحسن ہو سکتی ہے اور بھارت کی بالادستی کے خلاف کشمیری عوام ہی ایک زندہ و بیدار قوم کی حیثیت سے اپنی سیاسی آزادی کی جدوجہد کرتے ہوئے کامیابی و کامرانی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ آخر وہ آزادی بھی کس کام کی

جو دوسری قوموں کے ذریعے حاصل ہو۔ اور میرے خیال میں تو اسے صحیح معنوں میں آزادی بھی نہیں کہا جاسکتا جو کسی خطے یا ملک کے عوام اپنا خونِ شہادت پیش کر کے حاصل نہ کریں۔ اس ضمن میں، میں تحریک آزادیٔ کشمیر کو ایک نئے انداز میں از سر نو شروع کرنے کیلئے بھی مختصراً اپنے خیالات پیش کروں گا۔

یہ بات گذشتہ اٹھارہ سال کے دوران سب پر واضح ہو چکی ہے کہ بھارتی حکومت آج تک یہی کوشش کرتی رہی ہے کہ کشمیری عوام کو ریاست میں سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے آسودہ و خوشحال زندگی گزارنے کا موقع نہ دیا جائے۔ بلکہ ہمیشہ پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہی رکھا جائے۔ اگرچہ پنڈت جواہر لعل نہرو کسی نہ کسی طرح اپنے دمِ آخر تک ریاستی عوام کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم کشمیری عوام کو سیاسی و اقتصادی طور پر اس قدر اطمینان تو ضرور دلا دیا جائے کہ ریاست میں رائے شماری کروانے کا مطالبہ اپنی موت آپ مر جائے۔ لیکن آخری دم تک اپنی پوری کوشش کے باوجود جو انہوں نے اپنے ہی ڈھب سے جاری رکھی وہ اس سلسلے میں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے اور انہیں بارہا کشمیری عوام کو مطمئن رکھنے کے معاملہ میں اپنی ناکامی کا اعتراف بھی کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ بھارتی حکومت کو مقبوضہ کشمیر میں عوام کی اقتصادی بدحالی سے پیدا ہونے والی مسلسل سیاسی بے چینی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور ریاست کے طول و عرض میں عوام کی سیاسی بے چینی کی سرگرمیوں کو دبانے کیلئے بھارتی حکومت نے سینکڑوں کشمیری محبانِ وطن کو جیلوں میں ڈال رکھا ہے۔ جن میں شیخ محمد عبداللہ جیسا ہر دلعزیز اور محبِّ وطن کشمیری راہنما بھی شامل ہے جو گذشتہ دس بارہ سال کے طویل عرصے سے بھارتی حکومت کے ہاتھوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔ گذشتہ مہینوں میں شیخ عبداللہ کی رہائی کے بعد بھی کشمیری

عوام اپنی جدوجہد آزادی میں مصروف رہے ہیں۔ جس میں انہیں کشمیر کے ہر طبقہ کے باشندوں کی حمایت حاصل رہی ہے۔ لہٰذا اس فیصلہ کن موڑ پر پہنچنے کے بعد اب کشمیر کی تحریک آزادی کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کے لئے میں درج ذیل لائحہ عمل تجویز کرتا ہوں :-

(۱) حکومتِ پاکستان کشمیر میں جنگ بندی لائن کی حفاظت کرنے کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے۔ جس کا جواز یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے ۴۹ء میں حکومتِ پاکستان سے وعدہ کیا تھا کہ ریاستِ جموں وکشمیر میں جنگ بندی کے بعد رائے شماری کروائی جائے گی۔ مگر اب یہ بات گزشتہ سولہ سال کے دوران بالکل واضح ہو گئی ہے کہ اقوام متحدہ اپنا وعدہ پورا کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس ناکامی کی بڑی وجہ بھارتی حکومت کی ہٹ دھرمی ہے۔ لیکن حکومتِ پاکستان اس صورت میں بھی تمام متعلقہ فریقوں سے کہہ سکتی ہے کہ چونکہ وہ تمام ریاستِ جموں وکشمیر میں رائے شماری کروانے کا وعدہ پورا نہیں کر سکے۔ اس لئے پاکستان بھی اب اخلاقی و منطقی اور قانونی اعتبار سے جنگ بندی کے معاہدہ پر کاربند رہنے کا پابند نہیں ہے۔ کیونکہ جب وہ وعدے ہی پورے نہیں کئے گئے جن کے لئے جنگ بندی عمل میں لائی گئی تھی تو پھر کشمیری عوام کو جنگ بندی کی پابندی پر مجبور کرنے کا بھی کوئی مطلب نہیں ہے اور ان حالات میں کشمیری عوام کی نظر میں یہ جنگ بندی کوئی اہمیت نہیں رکھتی جبکہ یہ آج بھی اسی طرح بھارتی سامراج کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کراہ رہے ہیں اور انہیں ہر قسم کی آزادی و بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم رکھا جا رہا ہے۔

(ب) جب پاکستان جنگ بندی کے معاہدہ کی پابندی سے سبکدوش ہو جائے تو کشمیری عوام کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ کل جموں وکشمیر کی سطح پر ایک ہمہ گیر تحریک آزادی شروع کریں اور اس تحریک کیلئے کشمیری عوام آزاد کشمیر کو اپنا مستقر بنا کر منظم و متحد ہو جائیں اور اس کے بعد کشمیری عوام کو اپنے راہنماؤں کی قیادت میں تحریک آزادی چلانے کیلئے چھوڑ دیا جائے۔

(ج) حکومت آزاد کشمیر تحریک آزادی کے آغاز سے پیشتر دنیا کے تمام آزادی پسند اور امن دوست ممالک کو کشمیر کی صحیح اور ناگزیر صورت حال سے آگاہ کرے اور آزاد کشمیر کی حکومت جو ریاست کی تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو دنیا کے تمام آزادی پسند ممالک سے اخلاقی حمایت اور مالی امداد حاصل کرنے کی کوشش کرے اور یہ تمام تیاریاں مکمل ہونے کے بعد کشمیری عوام بڑے بھرپور انداز میں اپنی تحریک آزادی کا آغاز کر دیں اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک کہ ریاست کو بھارتی غلامی کے چنگل سے آزاد نہ کروالیں۔

بھارت میں آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس سے آج ہر ہوشمند شخص بخوبی واقف ہے۔ بھارت ایک وسیع وعریض ملک ہے جس میں ہر رنگ اور ہر نسل سے تعلق رکھنے والے باشندے آباد ہیں جو اپنے مختلف نظریات حیات پر یقین رکھتے ہیں اور بھارت کے تمام علاقوں میں آباد ہیں۔ ان باشندوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت بھی ایک دوسرے سے جدا جدا ہے۔ لہٰذا ایک کمزور حکومت کیلئے جیسی کہ بھارت ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ان تمام باشندوں کو ایک متحد و منظم قوم کی شکل دینے کیلئے مسلسل ظلم و تشدد اور عیاری و مکاری کے حربے استعمال کرتے ہوئے ہمیشہ عوام کے سروں پر مسلط رہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ بھارت کی اس

علاقائی سالمیّت اور استحکام میں زوال آنا شروع ہو چکا ہے اور یہ زوال پذیر حالات یونہی جاری رہیں گے۔ بلکہ مستقبل میں اس بات کا اندیشہ بھی ہے کہ بھارت اور چھوٹے چھوٹے علاقائی حصّوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ سارے بھارت میں علاقائی حقوق کے مطالبات کی تحریکیں مسلسل زور پکڑ رہی ہیں۔ اور اس معاملے میں بھی اب کوئی شک دشبہ باقی نہیں رہا کہ بھارت ایک قوم کی حیثیّت سے اپنا وقار کھو چکا ہے۔ اور یہ جھوٹا قومی وقار قائم رکھنا اب اس کیلئے ممکن نہیں رہا۔ بھارتی رہنماؤں کے متحدہ ہندوستان یا ایک ہندوستانی قومیت کے نظریئے کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ لیکن اگر بھارتی رہنما اپنے ملک کی اس نازک صورتِ حال کا بروقت تجزیہ کر کے اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کے قابل بنالیں تو یہ نہ صرف بھارت کیلئے بلکہ اس کے ہمسایہ ملکوں کیلئے بھی نہایت مفید طرزِ عمل ثابت ہوگا۔ اور اگر واقعی بھارتی حکومت میں اپنے سیاسی و سماجی مسائل پہ نظرِ ثانی کر کے جدید تقاضوں کے مطابق چلنے کا احساس پیدا ہو گیا تو وہ بھارت کی تعمیر و ترقی کی طرف ایک ٹھوس قدم متصوّر ہوگا۔ علاوہ ازیں اس صورت میں بھارتی رہنماؤں کو یہ بات بھی آخر تسلیم کرنا ہی پڑے گی کہ کشمیر بھارت کا حصّہ نہ کبھی تھا اور نہ آج ہے۔ اس لئے اس پر اپنی طاقت کے گھمنڈ میں زیادہ عرصے تک غاصبانہ قبضہ جاری رکھ کر اسے بھارت کا حصّہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور جو بھارتی راہنما کشمیر پہ بزعمِ قوت اپنا قبضہ جاری رکھتے ہوئے اسے بھارت کا حصّہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف کشمیر اور پاکستان بلکہ خود بھارت کیلئے بھی ایک نقصانِ عظیم کا موجب بن سکتے ہیں۔

(۲۰)

اسلامی ممالک اور کشمیر

۱۹۵۰ء میں سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے بعد واپسی پر میں نے قبرص، قاہرہ اور ترکی کا بھی دورہ کیا اور میں نے محسوس کیا کہ تمام اسلامی ممالک میں سے ترکی نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں تمام اسلامی ممالک سے آگے ہے اور جمہوریہ ترکیہ کی ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہو چکا ہے لیکن اگر کوئی شخص صرف استنبول یا انقرہ تک ہی اپنی سیاحت کو محدود رکھے یا ترکی میں صرف ایک مختصر عرصہ کیلئے ہی قیام کرے تو وہ جمہوریہ ترکیہ کی تعمیر و ترقی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اس سے یہ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے کہ ترکی کے عوام نے گذشتہ بیس سال کے دوران معاشرتی زندگی کے ہر شعبہ میں بے پناہ ترقی کی ہے اور چونکہ ترکی اقتصادی طور پر خود کفیل نہیں ہے اس لئے اس نے دوسرے ملکوں سے کئی قسم کے منافع بخش تجارتی و اقتصادی معاہدے بھی کر رکھے ہیں۔ ترکیہ کا جغرافیائی محل وقوع ایسا ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ روس اور ترکی کے درمیان کشیدہ تعلقات کی وجہ سے ترکی کو ہمیشہ روس کی جانب سے حملے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اسے درۂ دانیال کی ہمیشہ حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اور ایک چھوٹا ملک ہونے کی وجہ

سے ترکی زیادہ بڑی بحری فوج نہیں رکھ سکتا البتہ ترکی کی بری فوج اس کی اقتصادی حالت کے مقابلے میں بہت بڑی اور مضبوط و مستحکم ہے کیونکہ ایک بھاری فوج رکھے بغیر ترکی کی سرحدوں کی حفاظت ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی کے قومی خزانے کا بڑا حصہ فوج پر صرف ہوتا ہے۔ اور جیساکہ ہونا بھی چاہیئے۔ ترکی کا ہر نوجوان اپنے ملک کی فوج کا سپاہی ہے۔

ترکی کے عوام نے آمرانہ نظامِ حکومت کے تجربات حاصل کئے ہیں۔ اور نہایت کامیابی و صبر آزمائی کے ساتھ آمرانہ دورِ حکومت سے بھی گزرے ہیں حالانکہ کئی یورپی ملکوں کے عوام اپنے ممالک کی آمرانہ حکومتوں کو زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتے۔ تاہم ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے بعد اب ترکیہ سیاسی جماعتوں کے ذریعے طرزِ حکومت چلانے کے دور سے گزر رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ترکی تعلیمی میدان میں زیادہ ترقی کرے گا۔ اسے زندگی کے دوسرے تمام سماجی و اقتصادی شعبوں میں بھی ترقی حاصل ہوگی اور ہر معاملے میں خاص طور پر جمہوری طرزِ حکومت کے قیام میں ایشیا کے تمام ملکوں کی قیادت کرے گا۔ ترکی کی جمہوری حکومت کو حال ہی میں شدید جھٹکے بھی برداشت کرنا پڑے ہیں۔ جبکہ جاپان اسے اور دوسرے ایشیائی ممالک کو اس معاملے میں پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل چکا ہے۔

جب میں ۱۹۵۰ء میں ترکی کے دورہ پر گیا تھا تو اس وقت میں نے دیکھا کہ وہاں کے اخبارات نے بہت ترقی کی ہے اور بیشتر اچھے اخبارات حزبِ اختلاف کے پاس ہیں اور ان دنوں صرف ایک اخبار "یولس" (ULUS) حکومت کا حامی خیال کیا جاتا تھا۔ جمہوریۂ ترکیہ پاکستان کے معاملات میں خاص دلچسپی لیتا ہے۔ جب میں وہاں پہنچا تو ترکی اخبارات

اور عوام نے میرا نہایت پرتپاک خیر مقدم کیا اور میں نے اپنے دورانِ قیام انقرہ اور استنبول کے عوامی حلقوں سے رابطہ قائم کر کے محسوس کیا کہ وہاں کے عوام نہایت خلیق اور مہمان نواز ہیں اور آج بھی ان کی یہ روایتی مہمان نوازی کسی طرح فراموش نہیں کی جاسکتی۔ اپنے مختصر سے قیام میں، میں نے وہاں متعدد مقامات پر تقاریر کیں اور اخباری نمائندوں سے بھی خطاب کیا۔ انقرہ کا ایک وکیل اپنے چھوٹے بچے کو ہمراہ لے کر کئی جگہ میری تقاریر سننے کیلئے آیا کرتا تھا۔ اس کے لڑکے کی عمر بمشکل آٹھ دس سال کی ہوگی۔ جب میں ترکی سے روانہ ہونے لگا تو اس لڑکے نے مجھے پاکستان اور آزاد کشمیر کے بچوں کے نام کئی خطوط دیئے اور جب وہاں سے رخصت ہونے لگا تو یہ بچہ زار و قطار رونے لگا۔ اگر میں آزاد کشمیر یا پاکستان سے کہیں باہر جا رہا ہوتا اور کوئی عزیز بچہ روتا تو اس کے رونے کو کوئی اہمیت نہ دی جاسکتی تھی۔ لیکن اس ترک بچے کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا اور مجھے بڑی شدت سے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ ترک عوام پاکستان اور اس کے باشندوں سے کس قدر گہرا انس، قرب اور ہمدردی کے جذبات و احساسات اپنے سینوں میں موجزن رکھتے ہیں۔

جب سے ترکی میں اپنی طرز کی ایک مخصوص جمہوری حکومت قائم ہوئی ہے، اس کی خارجہ حکمتِ عملی بھی نہایت کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔ ترکیہ کی مملکت بحیرۂ اسود اور بحرِ روم کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے بڑی سیاسی اہمیت کی حامل ہے۔ اور جس طرح کہ دنیا آج دو طاقت ور حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے، اس صورتِ حالات میں ترکی کے لئے غیر جانبداری برقرار رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ اگرچہ گزشتہ جنگ میں اپنے مخصوص حالات کی بدولت اپنی غیر جانبدار حیثیت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر کیا وہ آئندہ کسی جنگ

بھی اپنی غیر جانبداری قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی ۔۔۔؟ اس کے متعلق قطعی طور پر تو کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ۔ تاہم اگر بین الاقوامی جنگی حالات ناگزیر ہو جائیں تو یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ترکی ریاست ہائے بلقان بلاک کے اثر سے لاتعلق ہرگز نہیں رہ سکتا۔ اکثر اوقات یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ ترکی کے عوام نے اسلام ترک کر دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ترک عوام میں ایک بڑا نمایاں سماجی و سیاسی انقلاب رونما ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک مذہب کا تعلق ہے ترکی کے باشندے بھی اسلامی شعائر کے اتنے ہی پابند ہیں جتنے کہ پاکستانی عوام اسلام کے دلدادہ ہیں۔ اور اس سے بڑا تو جھوٹ میرے نزدیک اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ترکی کے عوام نے اسلام ترک کر دیا ہے۔ یا وہ اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مجھے پوچھنے پر بتایا گیا کہ ترکیہ حکومت نے اپنے ملک کے ابتدائی تعلیمی اداروں میں اسلامیات کی تعلیم لازمی قرار دے رکھی ہے۔ اور حکومت نے مذہبی امور پر غور و فکر کیلئے ایک ایسا ادارہ بھی قائم کر رکھا ہے جس میں سرکاری خرچ پر مذہبی امور پہ تحقیقات کا کام کیا جاتا ہے۔

البتہ انقلاب ترکی کے فوراً بعد ترکی کے عوام نے کچھ عرصے کیلئے اسلامی طرزِ فکر کی طرف توجہ دینی ترک کر دی تھی۔ مگر اس کی بھی کچھ سیاسی وجوہات تھیں۔ انقلاب ترکی کا بانی کمال اتاترک یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکا ملک ان ممالک کی صف میں شمار کیا جائے جو بظاہر تو مسلمان ہیں۔ لیکن عملاً بڑی اور استعماریت پسند حکومتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں اور اس کی یہ زبردست خواہش اور جد و جہد رہی ہے کہ ترکی کی ایک اپنی علیحدہ اور منفرد خصوصیت کی حیثیت دوسرے ممالک سے منوائے اور اس کی خارجہ حکمتِ عملی کسی بڑی اور طاقتور حکومت کی خارجہ پالیسیوں کے تابع نہ رہے اور اپنے اسی زاویۂ نگاہ کے پیشِ نظر وہ ہر ممکن اقدام کرنے میں حق بجانب بھی تھا۔

"جمہوریہ ترکیہ" آج بھی ہمارا ایک دوست اسلامی ملک ہے۔ لیکن وہ قدیم رسم د

رواج اور اسلام کے نام پر خود ساختہ تنگ نظری کی پابندیوں سے نجات حاصل کر چکا ہے جو ہمیشہ ملکی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ترک باشندے اعلیٰ تعلیم و تدریس، تہذیب و تمدن اور سیاست میں دنیا کے ترقی یافتہ عوام کی صفِ اوّل میں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ماضیٔ قریب تک بھی ترکی کی خارجہ پالیسی بالکل آزاد اور غیر جانبدار رہی ہے اور اس کی اسلامی بلاک یا کسی اور طاقت ور بلاک کے ساتھ شامل ہونے کی بھی خواہش نہیں رہی ہے۔ اور ترکیہ کے اس مؤقف کے پسِ منظر میں بھی ترکی کے مخصوص تاریخی حالات کی مجبوری کارفرما نظر آتی ہے۔ تاہم حال ہی میں حکومتِ ترکیہ کو بھی حالات نے اس امر پہ مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی غیر جانبدارانہ آزاد خارجہ پالیسی کو ترک کر دے۔

اگرچہ میں نے ترکیہ میں صرف تین ہفتے تک ہی قیام کیا تھا لیکن اس مختصر سے عرصہ میں ہی، میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنے مؤقف کی تشہیر کرنے میں خاصا کامیاب رہا۔ اس عرصے میں متعدد بار میں نے اخباری نمائندوں سے بھی خطاب کیا۔ اور اخبارات کے مدیروں اور نمائندوں سے علیحدہ علیحدہ بھی ملاقاتیں کر کے انہیں تنازعۂ کشمیر کے ہر پہلو سے اپنے زاویۂ نگاہ سے بالتفصیل آگاہ کیا اور ان ملاقاتوں میں باہمی تبادلۂ خیالات کے ذریعے بھی میں انہیں مسئلہ کشمیر پر اپنا ہم خیال بنانے میں نہایت کامیاب رہا۔ ترک عوام کو میں نے یہ بھی بتایا کہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی حقیقت و نوعیت کیا ہے اور بھارت نے کس طرح محض اپنی طاقت کے بل پہ کشمیری عوام کو اپنا غلام بنا رکھا ہے ترکیہ کے عوام کو کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی و خود مختاری کا حامی بنانا زیادہ مشکل نہ تھا۔ کیونکہ یہ ترک عوام خود اپنی آزادی و خود مختاری کیلئے انگریز سامراج کے خلاف کامیاب جنگ لڑ چکے تھے اور انہیں اب بھی اپنی آزادی و سالمیت کو برقرار رکھنے کیلئے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کی ضرورت تھی۔ ترکیہ کے اخبارات میرے

وہاں پہنچنے سے پہلے بھی تنازعۂ کشمیر پر بڑی فراخدلی اور جرأت و بیباکی سے تبصرے کر چکے تھے اور ترکی اخبارات پاکستان کے ہر مسئلہ پر شروع ہی سے پاکستانی مؤقف کی حمایت کرتے رہے ہیں اگرچہ بھارتی سفارت خانہ ترکی میں ہمیشہ ایسے مسائل کی غلط تصویر ترک عوام کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مگر ترک عوام اور ترکیہ کے اخبارات اتنا شعور رکھتے ہیں کہ کسی مسئلہ پر اپنی رائے قائم کرنے سے قبل اس کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈال کر غور و فکر کر لیں۔ اور یہی وہ مدبرانہ سیاسی شعور یا سوجھ بوجھ ہے جس کی اب تک پاکستانی اخبارات اور عوام میں خاصی کمی پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ہمارے کئی اخبارات اور عوام اب تک بھی افواہوں اور بے بنیاد خبروں پر یقین کر کے اکثر معاملات میں اپنی رائے قائم کر لینے کے عادی ہیں۔ تاہم ترکی اخبارات اور عوام سچ یا جھوٹ میں تمیز کرنے کا پورا شعور اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

ترکی سے روانہ ہونے سے قبل میں نے فیصلہ کیا کہ انقرہ اور استنبول میں واقع تاریخی مقامات اور قابلِ دید جگہوں کو بھی دیکھ لیا جائے اور یہاں میں نے قدیم ترکیہ کے بادشاہوں کے محلات دیکھے جو اگرچہ سلطنت ترکیہ کے مطلق العنان شہنشاہوں کی یادگاریں ہیں۔ مگر اپنی دلکشی و صناعی کے لحاظ سے بڑی نادر یادگاریں ہیں۔ کیونکہ انہیں دیکھ کر اس دورِ قدیم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جب یہاں کے مسلمان بادشاہ تقریباً سارے ایشیا پر حکمرانی کرتے تھے۔ اور جب کوئی غیر ملکی مسلمان سیاح ان قدیم طرز کی پرشکوہ عمارتوں کو دیکھتا ہے تو بجا طور پر چند ثانیوں کیلئے تو اسے اپنے آباؤ اجداد کی ان یادگاروں پر فخر محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک محل میں، میں نے وہ نہایت قدیم اشیاء بھی دیکھیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ چین سے لائی گئی تھیں اور یہ کم از کم ایک ہزار سال پرانی بتائی جاتی ہیں اور انقرہ کے محلات میں اس قسم کی نادر

و نایاب اشیاء دیکھ کر بیک وقت بڑی مسرت و حیرت بھی ہوتی ہے کہ ترک عوام نے انہیں آج تک کس طرح سنبھال کر رکھا ہے۔ اور یہ چیز ایک طرف جہاں ترک باشندوں کی اپنے آبا و اجداد کے تہذیبی ورثہ سے موانست کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ترک عوام اپنی زندگی میں کس قدر نظم و ضبط اور اتحاد باہمی کے عادی ہیں اور ترک قوم دنیا کی ایک نہایت ترقی یافتہ قوم بننے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔

ترکیہ کا دورہ ختم کرنے کے بعد میں قبرص بھی گیا۔ قبرص بحیرہ روم کا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اور اپنے محل و قوع کے لحاظ سے تو بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اس جزیرے میں زیادہ تر آبادی یونانی باشندوں کی ہے اور ترک باشندے بھی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ اور کچھ برطانوی باشندے یہاں مقیم ہیں قبرص کے ترک باشندے ترکی کے ساتھ اور یونانی باشندے یونان کے ساتھ اپنی ہمدردیاں رکھتے ہیں ترک باشندوں کی خواہش یہ ہے کہ قبرص ترکی کے ساتھ اپنے زیادہ گہرے تعلقات قائم رکھے جبکہ یونانی باشندے اس جزیرے کی حکومت کو یونان سے زیادہ قریب رکھنے کی جد و جہد میں ہمیشہ مصروف عمل رہتے ہیں۔ قبرصی عوام کیلئے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ قبرص جس پر چند سال پہلے تک برطانیہ حکومت کرتا تھا۔ اپنی آزادی کے بعد اب کس ملک سے اپنے زیادہ قریبی تعلقات قائم کرے؟ ترکیہ کی طرح قبرص کے ترک باشندے بھی مسلمانوں اور اسلامی ممالک کے ہر مسئلے پر گہری دلچسپی و ہمدردی رکھتے ہیں۔ میں جب صرف ایک روز کیلئے قبرص کے دورہ پر وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے عوام مسئلہ کشمیر کے بارے میں بہت کچھ واقفیت رکھتے ہیں۔ قبرص کے ترک اخبارات نے میری وہاں آمد کی خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ اور کثیر تعداد میں قبرصی باشندے بھی میرے استقبال کیلئے ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ میں صرف ایک

رات کیلئے ان کا مہمان تھا اور اس رات میں نے وہاں ایک "ثقافتی تماشہ" میں بھی شرکت کی جو بالکل ترک ثقافت کا نمونہ تھا۔ اگرچہ میں ان کی زبان تو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے یہ تماشا نہایت دلچسپ اور مؤثر محسوس ہوا۔ وہاں قبرص کے ایک ترک باشندے نے اپنے نومولود بچے کا نام بھی میرے نام پر رکھا۔ اور جب میں اگلے روز وہاں سے روانہ ہونے کیلئے ہوائی اڈے کی طرف جا رہا تھا تو ہزاروں قبرصی باشندے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اسی وقت ایک ضعیف العمر قبرصی نے میری کار کے نزدیک آکر مجھ سے پوچھا کہ کیا میں وہی ہوں جس کی اسنے اخبار میں تصویر دیکھی تھی۔ پھر اس نے مجھے وہ تصویر بھی دکھائی جو ایک مقامی اخبار میں شائع ہوئی تھی اور جب میں نے اسے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے یہ بتایا کہ ہاں میں وہی ہوں تو اس کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک کر اس کی ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔ جو حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ مگر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بعض اوقات انسان پر بڑا گہرا اثر اور نقش چھوڑ جاتی ہیں اور بسا اوقات ان سے کسی ملک کے عوام کی عظمت، دوستی اور ہمدردی وغیرہ کے جذبات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ کافی غور و خوض کے بعد میں اس ضعیف العمر قبرصی کے بارے میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا تھا کہ وفورِ جذبات میں اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے اور مجھے بھی یہ احساس کر کے بڑی کوفت محسوس ہوتی ہے کہ قبرص کے باشندے آزادی حاصل کرنے کے بعد خانہ جنگی کا شکار ہو گئے ہیں اور یہ خانہ جنگی آج تک جاری ہے۔

قبرص کے بعد میں مصر کے دورے پر روانہ ہو گیا۔ اور وہاں پہنچ کر کئی روز تک قاہرہ میں قیام کیا۔ قاہرہ عرب ممالک اور مشرقِ وسطیٰ کا مرکز ہے۔ اور یورپی باشندوں کی ایک اہم تفریح گاہ بھی ہے۔ قاہرہ دراصل دنیا کا ایک ایسا شہر ہے جہاں دنیا کے ہر ملک کے باشندے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور اسے مشرق و مغرب

۱۔ CULTURAL SHOW

کا سنگھم بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کے "سمیر امیز" (SEMIRA MIS) ہوٹل جیسی قیام گاہوں میں یورپی ممالک کے باشندے اور سفارتی افسر کثرت سے نظر آتے ہیں اور ان کے درمیان مصری پاشا اور شہزادے بھی صاف ستھرے لباس پہنے اور سروں پر سرخ ترکی ٹوپیاں رکھے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ بہت سے تعلیم یافتہ مصری، فرانسیسی زبان بڑی روانی سے بول سکتے ہیں۔ اگرچہ انہیں انگریزی زبان سے بھی خاصی واقفیت ہے۔ لیکن اتنی نہیں جتنی کہ وہ فرانسیسی سے گہری دلچسپی اور واقفیت رکھتے ہیں۔

اگرچہ مصر کا عرب ممالک پر گہرا اثر اور کنٹرول نہیں ہے۔ مگر پھر بھی عرب لیگ کے ذریعے مصر عرب ممالک کی قیادت کرتا ہے "عرب لیگ" جس کا صدر مقام قاہرہ میں ہی ہے اپنے ابتدائی دور میں تمام عالمِ اسلام کے عموماً اور عرب ممالک کے مسائل خصوصاً حل کرنے کیلئے ایک با اثر ادارے کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہے۔ مگر اب عرب لیگ کچھ عرصہ سے کمزور پڑ گئی ہے۔ تاہم ہماری خواہش ہے کہ عرب لیگ ایک ایسا ادارہ بن جائے جس پر کسی ایک عرب ملک یا کسی دوسرے بلاک کا کنٹرول باقی نہ رہے۔ ۱۹۴۸ء کے دوران مصر میں وفد حکومت کے قیام سے یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ عرب لیگ ایک آزاد اور مضبوط ادارہ بن جائے گی۔ مگر بعد میں نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ تاہم مصر کے دوسرے انقلاب کے بعد سے پھر اس بات کی امید پیدا ہو گئی ہے کہ صورتِ حال پھر تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن اس کے لئے مصر کی سیاسی تبدیلیوں پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بین الاقوامی سطح پر مصر بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے جو بعض حالتوں میں نہایت خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مصر کی سیاسی اور جغرافیائی اہمیت و محلِ وقوع کی وجہ سے مغربی طاقتیں ہمیشہ سے مصر پر حریصانہ نظر رکھتی ہیں۔ اور اب اسے مغربی بلاک کے ایک بین مملکتی دفاعی معاہدے میں شرکت پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ مصری حکومت اور وہاں کے عوام مسئلہ کشمیر میں اسے ایک اسلامی ملک کا مسئلہ ہونے کی وجہ سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور مصری اخبارات تنازعہ کشمیر پر پاکستان

کا مؤقف بلاشک وشبہ تسلیم کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ جب تک مصر میں وفد پارٹی کی حکومت رہی ہے۔ وہ ہمیشہ بھارت کی طرف جھکی رہی ہے جس کی وجہ وفد حکومت کے سربراہ مصطفےٰ نحاس پاشا اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے ذاتی مراسم بھی تھے اگرچہ مصری اخبارات اور کسی حد تک مصری حکومت نے بھی اس دور میں تنازعۂ کشمیر پر پاکستانی مؤقف کی حمایت کی ہے۔ لیکن یہ حمایت کسی صورت میں بھی کافی نہیں سمجھی جا سکتی۔ ابھی تک مسئلہ کشمیر اور پاکستان کے متعلق نئی حکومت کی پالیسی زیادہ واضح انداز میں ظاہر نہیں ہوئی ہے تاہم مصری عوام اور سیاست والوں کیلئے تنازعۂ کشمیر کی تہہ تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ پاکستان کیلئے بالکل اسی قسم کا ہے جیسا کہ مصر کے لئے سوڈان کا مسئلہ۔

میرے خیال میں یہ ضروری ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے استحکام کیلئے مصر کو زیادہ سے زیادہ استحکام اور ترقی حاصل ہو۔ کیونکہ اگر مشرقِ وسطیٰ کا یہ سب سے بڑا اور اہم ملک مستحکم ہو جاتا ہے تو مشرقِ وسطیٰ کے ممالک بھی خواہ وہ متحد ہوں یا علیحدہ اپنے لئے استحکام و تحفظ محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایک عرب مسلمان ملک ہونے کی وجہ سے پاکستان کو مصر سے گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے اور پاکستانی عوام بھی مصری عوام سے گہری دلچسپی و خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں۔

مصر کی تاریخ ہزاروں سال پرانی تاریخ ہے اور دنیا کے ہر ملک کے باشندے مصر سے متعلق تذکروں اور تاریخوں میں دلچسپی محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ مصر اپنی تمام سیاسی اور اقتصادی الجھنوں کے باوجود مستقبل کا ایک مضبوط اور آزاد ملک بننے میں کامیابی حاصل کر لے گا۔ اگرچہ موجودہ سیاسی حالات میں کسی عرب ملک کیلئے بالکل آزاد اور غیر جانبدار رہ کر اپنی سالمیت اور وجود قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ مسئلہ کشمیر مصریوں کیلئے مسئلہ سوڈان کی دوسری شکل کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جس طرح مصری عوام چاہتے ہیں کہ سوڈان کا مصر

سے مستقل الحاق قائم رہے۔ اسی طرح پاکستان بھی کشمیر کا غیر مشروط الحاق پاکستان سے چاہتا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر مصریوں کو تنازعہ کشمیر پر پاکستان کا ہمنوا بنانا نہایت آسان کام ہے۔ مصر کے کئی اخباری نمائندے پاکستان، بھارت اور آزاد کشمیر کا دورہ بھی کر چکے ہیں اور وہ اس تنازعہ پر پاکستان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ تاہم جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے۔ مصری عوام سے اس مسئلے پر کسی منطقی بحث و تمحیص کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس مسئلے پر ہمیشہ سے پاکستانی مؤقف کے ہی حامی رہے ہیں۔ دوسری طرف اگرچہ بھارتی حکومت مصر میں بھارت کے مؤقف کو مقبول بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ مگر مصری عوام تنازعہ کشمیر پر پاکستان کی اخلاقی ذمہ داریوں اور اس کے مؤقف کی صداقت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

مصری عوام کی اکثریت پاکستان اور اس کے باشندوں سے بھی گہری دلچسپی اور ہمدردیاں رکھتی ہے۔ اگرچہ مصر میں اس کے برعکس خیالات رکھنے والے بھی موجود ہیں جیسے مصر کے معزول شاہ فاروق جو پاکستان کو اپنا مدِ مقابل سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستان سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے کوشش کرتے ہوئے نہ صرف مصر کے ساتھ بلکہ دنیا کے تمام اسلامی ممالک کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کا عملی طور پر مظاہرہ کرتا ہے تو مصری عوام کے اس طبقہ کی رائے تبدیل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کا ایک مضبوط و متحد بلاک بنانے میں بھی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر ضروری نہیں ہے۔ کہ اسلامی ممالک کا یہ سیاسی بلاک کسی دوسرے طاقتور سیاسی بلاک کا مدِ مقابل بننے کی حیثیت بھی اختیار کرے گا کیونکہ اسلامی ممالک کے اتحاد کی بنیاد صرف اپنے علاقائی اور مذہبی رشتوں پر بھی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ ممالک اسلامیہ کے چالیس کروڑ مسلمانوں کا یہ بلاک بین الاقوامی سیاسی مسائل پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے اور تمام اسلامی ممالک اور ان کے عوام متحد و منظم ہو کر ایک ہی راہ پر گامزن ہوتے ہوئے

ہی وہ حیثیت اختیار کر سکتے ہیں کہ نہ صرف اپنی آزادی وسالمیت کا تحفظ کر سکیں۔ بلکہ چھوٹی چھوٹی ایشیائی قوموں کو بھی اپنی قومی آزادی کے حصول اور تحفظ کے لیے امداد فراہم کر سکیں۔

بھارت ایک عرصے سے مصر میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا کر اسکی ہمدردیاں حاصل کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بالآخر اس میں ناکام ہوگا دوسری طرف بھارت عرب ممالک کی "عرب لیگ" کو بھی سرے سے پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ مذہبی اور نسلی بنیادوں پر گروہ بندیوں کی مخالفت کا دم بھرتا ہے۔ لیکن مصر عرب ملکوں کی قیادت کرنے کا خواہشمند ہے اور اس کی یہ فطری خواہش بھی ہے۔ تنازعۂ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی وجہ سے بھارت مصر میں پاکستان کے خلاف زہر افشانی میں مصروف ہے اور برطانیہ کے خلاف بھارت کے ہندو راہنماؤں کی جدوجہد کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے کے باوجود مصر، پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعہ پر پاکستان کا ساتھ دینے پر آمادہ رہا ہے۔ اگرچہ بھارت پاکستان کے خلاف اس امر کا پراپیگنڈہ کرنے میں بہت کامیاب رہا ہے کہ پاکستان کا قیام برطانوی حکومت کی کوششوں کا رہین منت ہے اور مصری عوام برطانیہ کی سوڈان اور نہر سویز کے متعلق پالیسیوں کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لہٰذا بھارت کا پاکستان کے خلاف یہ پراپیگنڈہ اس کے لئے بہت کامیاب اور پاکستان کیلئے مضر ثابت ہوا ہے مگر پاکستان نے جس طرح فلسطین کے مسئلہ پر عرب ملکوں کی حمایت کی ہے۔ اس سے عرب ملکوں میں پاکستان کا وقار کافی بلند ہو گیا ہے اور در حقیقت تو پاکستان نے فلسطین کے مسئلہ پر اقوام متحدہ کے سامنے بڑی بے باکی سے عرب ممالک کی حمایت کی تھی اور اس کے بعد پاکستان نے شمالی افریقہ کے کئی اسلامی ملکوں کی بھی اقوام متحدہ میں پرزور حمایت کر کے عرب ممالک کی اور زیادہ ہمدردیاں حاصل کر لی ہیں۔

یہاں میں مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے مذہبی لگاؤ سے متعلق بھی کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اگرچہ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میں نے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کا اتنا زیادہ وسیع دورہ نہیں کیا کہ میں ان علاقوں کے بارے میں کوئی ٹھوس رائے قائم کر سکتا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ضمن میں میری رائے خام تجربے اور معلومات کی کمی کے باعث درست ثابت نہ ہو۔ لیکن جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے۔ مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مشرقِ وسطیٰ کے عوام مذہب سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے۔ اسلامی ممالک کی خارجہ اور داخلہ پالیسی پر دوسرے ممالک کا گہرا اثر ہے اور جب تک ان اسلامی ممالک کے اقتصادی معاملات پر مغربی ممالک کا گہرا اثر بلکہ غلبہ قائم ہے۔ تب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان ملکوں میں مستقبل قریب میں اسلام کا احیا کہاں تک ممکن ہے۔ کیونکہ ابھی تک تمام ایشیائی و افریقی ممالک نے کسی نہ کسی صورت میں مغربی ممالک کا سیاسی و معاشی نظام اپنا رکھا ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ دو[۲] تین صدیوں سے انگریز اور بعض دوسرے مغربی ممالک ان ممالک پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اگر ان ممالک کے اقتصادی معاشی حالات کا بنظرِ غائر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک یہ ممالک اقتصادی و معاشی میدان میں کامیابی حاصل نہ کر لیں گے۔ مغربی سامراجی ممالک کے اثر سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے ترکی، ایران افغانستان اور پاکستان ایسی جگہوں پر واقع ہیں کہ عالمی جنگ چھڑ جانے کی صورت میں یہ ممالک اپنی غیر جانبداری برقرار نہ رکھ سکیں گے۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ محض اس وجہ سے یہ ممالک اپنی آزادی و خودمختاری کسی دوسرے ملک کے حوالے کر دیں۔ تاہم ہر ملک کیلئے دوسرے ملکوں کے ساتھ اپنا وقار اور قومی سالمیت برقرار رکھتے ہوئے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم کرنے لازمی ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر کسی بھی ملک کا گزارہ ممکن ہے۔

محض "عرب لیگ" کا قیام اسلام کے احیا کا ثبوت پیش کرنے کیلئے کافی نہیں ہے۔ کیونکہ عرب ممالک میں اسلام ایک زندہ مذہب کی حیثیت سے نظر نہیں آتا جو عرب عوام کی مذہبی۔ سماجی اور سیاسی زندگی میں ان کی راہنمائی کرتا ہو۔ جبکہ اس کے برعکس مغربی ممالک کی تمام تر جمہوری قدروں کی حامل جمہوری حکومت بھی کسی عرب ملک میں نظر نہیں آتی۔ بلکہ ہر عرب ملک کے سیاسی ڈھانچے میں ایک عجیب قسم کی شتر گربگی نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہاں کے عوام پر مغربی طرزِ جمہوریت تھوپنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر وہاں کے عوام کسی طرح بھی اس جمہوریت کے اہل یا مظہر بن کر نظر نہیں آسکتے۔ جب تک کہ وہ ایک مرتبہ پھر اسلام کی طرف رجوع نہ کریں گے۔ اور اسلام کو عصرِ حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کی روشنی میں دیکھتے ہوئے ان اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

مشرقِ وسطیٰ کے ان ممالک کو اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ممالک اپنی ٹھوس اقتصادی منصوبہ بندی کی طرف توجہ دیں۔ کیونکہ مستقبل میں بھی اگر یہاں معاشی و اقتصادی بدحالی اسی طرح مسلط رہی تو یہاں کے عوام اور حکومتوں کو بھی بہت تباہ کن صورتِ حال کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جس سے عہدہ برآ ہونے کیلئے ضرورت اس بات ہی کی ہے کہ ان ممالک کے اقتصادی و معاشی حالات کا جائزہ لینے کے بعد ان کی اقتصادی ترقی کیلئے منصوبہ بندی کرنے کی خاطر اقتصادی ماہرین کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور جب یہ ماہرین باہمی صلاح و مشورے کے بعد اپنا اقتصادی منصوبہ تیار کر لیں تو اس پر عرب ممالک کے باہمی تعاون سے عمل درآمد شروع کر دیا جائے علاوہ ازیں اس اقتصادی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے کیلئے اقوامِ متحدہ کے علاوہ دوسرے دوست ممالک کی امداد و تعاون بھی حاصل کیا جائے۔ مگر اس کیلئے یہ ضروری نہیں ہے بلکہ نقصان دہ بھی ہے کہ یہ ممالک کسی بھی طاقت ور بلاک کے ہاتھ اپنی سیاسی

آزادی بیچ ڈالیں۔

مسئلہ کشمیر پر افغانستان کے علاوہ تمام اسلامی ممالک پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں ایران۔ ترکی۔ شام اور دوسرے اسلامی ممالک کھلے الفاظ میں مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کی حمایت کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ خصوصاً ایران نے تو اپنے اخبارات کے ذریعے بالکل واضح طور پر تنازعۂ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کی تائید و حمایت کی ہے۔

راقم الحروف کو ۱۹۶۴ء میں بھی کشمیر کے خیرسگالی وفد کے ہمراہ متعدد اسلامی ممالک کے دورے پر جانے کا موقع ملا تھا۔ اس وفد کے ہمراہ راقم کو مغربی اور مشرقی افریقہ ترکی سوڈان۔ مصر۔ جاپان، انڈونیشیا۔ فلپائن اور ملائشیا جانے کا اتفاق ہوا تو افریقی ممالک کی سیاحت کے بعد محسوس ہوا کہ ان نئے نئے افریقی ممالک نے جو اب دنیا کے نقشے پر آزاد ممالک کی حیثیت سے ابھر رہے ہیں۔ اور بین الاقوامی ادارۂ اقوام متحدہ میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بڑی طویل جدوجہد اور جانسوز قربانیوں کے بعد آزادی حاصل کی ہے اور افریقہ کے ان تمام نو آزاد ممالک کی جدوجہد آزادی دنیا کے ان تمام علاقوں اور خطوں کے عوام کیلئے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہے۔ جو سامراجی نو آبادیوں میں غلامی کی زندگی بسر کرتے ہوئے اس کے خلاف اپنی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

جس طرح ان افریقی ممالک کی حکومتوں نے ہمارے اس خیرسگالی وفد کا پرتپاک خیرمقدم کیا راقم الحروف اس سے بہت متاثر ہوا اور اسی طرح مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی ہمارے خیرسگالی وفد کا نہایت پرخلوص استقبال کیا گیا۔ جس سے اس بات کی قوی اُمید ہے کہ ان ملکوں کے عوام اور حکومتیں بھی کشمیری عوام کی تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچانے کیلئے ہر ممکن امداد فراہم کریں گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ روس اور چین جیسے بڑے ممالک بھی جنہوں نے ہمارے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے عوام کی جدوجہد آزادی کی اخلاقی

حمایت کی ہے آئندہ عملی طور پر بھی کشمیری عوام کی جنگِ آزادی میں مدد کریں گے۔ جس کے لئے میرا خیال ہے کہ ہمیں اشتراکی ممالک سے بھی رابطہ پیدا کر کے انہیں کشمیر کی موجودہ صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیئے۔ اگرچہ میں ذاتی طور پر جمہوریت پسند مغربی ممالک سے بھی اس سلسلے میں مایوس نہیں ہوں اور مجھے امید ہے کہ اگر وہ تحریکِ آزادیٔ کشمیر کیلئے اپنی عملی اور ٹھوس امداد نہ بھی فراہم کریں تو کم از کم اس تحریک کی صحت و صداقت کو ضرور تسلیم کریں گے۔ اور اس کی راہ میں رکاوٹیں نہیں پیدا ہونے دیں گے۔

تنازعۂ کشمیر کے بارے میں ایک آخری اور ٹھوس بات یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے تقریباً تمام ذمہ دار افراد کشمیر کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ بات بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ کشمیری عوام ایک طویل عرصے سے اپنی جد و جہد آزادی و خود مختاری میں مصروف عمل ہیں جبکہ انہیں اپنے اس عظیم مقصد کے لئے بے شمار قربانیاں بھی دینی پڑی ہیں لہٰذا ہند و پاکستان کے ہر آزادی پسند راہنما کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ کشمیری عوام کی تحریکِ آزادی کی حمایت کریں۔ آج کے حالات میں برصغیر کے سیاسی راہنماؤں کو یہ بات ذہن سے نکال دینی چاہیئے کہ کشمیر کو کسی کی جاگیر بھی بنایا جا سکتا ہے اور اگر اب بھی کسی کے دل میں یہ خیال ہے کہ کشمیر کسی کی جاگیر بن سکتا ہے تو اسے اپنے نظریات میں تبدیلی پیدا کرنی پڑے گی۔ کیونکہ یہ بات سوچنا کسی کیلئے مناسب یا سود مند نہیں ثابت ہو سکتی کہ کشمیر کسی کی ذاتی ملکیت ہے۔ اگرچہ کشمیری عوام ایک عرصے تک کچھ اس قسم کے حالات برداشت کرتے رہے ہیں۔ لیکن آئندہ اب وہ زیادہ عرصے تک یہ برداشت کرنے کیلئے بالکل تیار نہیں ہیں کہ ریاستِ جموں و کشمیر کو کسی کی ذاتی ملکیت سمجھا جا سکتا ہے۔

تحریکِ آزادیٔ کشمیر کا نیا دور!

کشمیر پر بھارتی حکومت اپنا قبضہ کسی دور میں بھی مضبوطی سے نہ جما سکی اگرچہ اُس نے اپنے اس سیاسی و اقتصادی استحکام کے لئے ہمیشہ سرتوڑ کوششیں کیں مگر بار آور نہ ہو سکیں۔ بھارت کو اپنے اس سیاسی استحکام میں ناکامی کا سامنا اس لئے کرنا پڑا کہ اس نے اپنی ساری امیدیں صرف شیخ محمد عبداللہ سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ مگر ۱۹۵۳ء میں جب شیخ محمد عبداللہ کو بھی پنڈت نہرو کے کئے ہوئے وعدوں سے سخت مایوسی پیدا ہو گئی تو انہوں نے بحیثیت وزیر اعظم کشمیر کچھ ایسی تقریریں بھی کیں جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ بھی نہ تھا کہ کشمیریوں کو ان کے حق خود ارادیت سے محروم نہ کیا جائے۔ مگر ان کا یہ کہنا ہی تھا کہ پنڈت نہرو کی حکومت نے شیخ عبداللہ کے خلاف ایک گہری سازش کا تانا بانا تیار کیا اور یہ سازش اس طرح انجام پذیر ہوئی کہ شیخ عبداللہ کو ان کے گلمرگ ہوٹل سے گرفتار کر لیا گیا۔ جس کے بعد سے وہ اب تک کم و بیش دس سال کے طویل عرصے سے قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا ہیں۔

اگر بھارت مسئلہ کشمیر سے کوئی سبق سیکھنے کی صلاحیت رکھتا تو جونہی شیخ عبداللہ کو بھارتی حکومت سے اختلاف پیدا ہوا تھا، اس کی سیاسی پالیسی میں ترمیم ہو جانی چاہئے تھی۔ مگر ہوا اس کے برعکس یہ کہ کشمیر کے معاملے میں پنڈت نہرو نے ایک نئی پالیسی کو اپنا لیا۔ اور وہ خطرناک رجحان کی حامل پالیسی یہ تھی کہ کچھ مخصوص لوگوں کو کسی نہ کسی طرح رشوت دے کر راضی کر لو۔ ظاہر ہے کہ رشوت خواہ

اقتصادی رعایت کی ہو یا کسی اور شکل میں مگر وقتی طور پر بڑی کارگر ثابت ہو سکتی تھی۔ اور بھارت کی اس نئی حکمت عملی کی آخری صورت یہ تھی کہ کسی قسم کی رشوت کے ذریعے کشمیری عوام کی تحریک آزادی کو دبانا ممکن نہ ہو تو پھر بھارت کی مرکزی حکومت کے ذریعے کشمیری عوام پہ اپنی حکومت ٹھونس دو۔ اور اس حکومت کو بھارتی فوج اور پولیس کے ذریعے سری نگر اور وادی کشمیر کے عوام پہ بہر صورت اس طرح مسلط رکھو کہ اگر اس کے خلاف کشمیری عوام سر اٹھائیں تو مسلح فوج اور پولیس کے ذریعے انہیں کچل کر رکھ دیا جائے۔

آنجہانی پنڈت نہرو کی اس نئی اور خطرناک پالیسی میں یہ خاص اقدامات بھی شامل تھے کہ بھی سے وادی کشمیر میں مسلمانوں کو اس طرح ایک مستقل عذاب میں مبتلا رکھا جائے کہ رفتہ رفتہ ان کا وہاں بے فکری سے رہنا ناممکن ہو جائے اور وہ وادی کشمیر سے ترک وطن کر کے پاکستان کی جانب ہجرت کرنے اور پناہ لینے پہ مجبور ہو جائیں۔ اگرچہ مسلمانوں کے بارے میں یہ پالیسی پورے ہندوستان میں ہی شروع سے اختیار کی جا چکی تھی۔ مگر ریاست جموں و کشمیر میں تو خصوصیت کے ساتھ اس خطرناک پالیسی کو بروئے کار لا کر وہاں کے عوام پہ سیاسی ظلم و تشدد کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے۔ کشمیری لیڈروں میں بڑی ہی عیاری اور مکاری سے فروعی اور ذاتی قسم کے اختلافات کی داغ بیل ڈالی گئی۔ چنانچہ بخشی غلام محمد کو شیخ عبداللہ کے بعد اپنا آلۂ کار بنا کر سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا جبکہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا وقار ختم کرنے کی سازش پہ بخشی صاحب کے ذریعے عمل درآمد کروایا گیا۔ گذشتہ دس بارہ سال کے طویل عرصہ سے بھارتی حکومت اپنی جوڑ توڑ کی اسی پالیسی پہ نہایت مکاری سے عمل پیرا ہے۔ پھر ریاست جموں و کشمیر کے جو علاقے مسلمانوں سے جبری طور پہ خالی کروائے گئے تھے، ان میں غیر ریاستی ہندوؤں اور سکھوں کو آباد کرنے کی کوششیں بھی بھارتی حکومت کی طرف سے ابھی تک جاری ہیں۔

اس نئی وضع کردہ بھارتی پالیسی کا ایک اور بھی پس منظر ہے اور وہ یہ کہ نہرو حکومت مسلمانوں کے سارے دینی نظام اور ان کے ایک خاص قسم کے تمدن کو بھی رفتہ رفتہ ختم کر دینا چاہتی تھی

تاکہ "دو قومی" نظریات کو کلیتاً ہی کشمیر میں معدوم کر دیا جائے۔ مقبوضہ کشمیر میں اس رجحان کو فروغ وسیع کے بعد "دو قومی" نظریئے کو گہری تشویش کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ مثال کے طور پر "حضرت بل" وادیٔ کشمیر میں ایک ایسا مقام ہے جس کا کشمیری مسلمان بڑا احترام کرتے ہیں اور ولادت رسول اکرم کی تقریب پر یہاں ہر سال مسلمانوں کا ایک عظیم الشان اجتماع منعقد ہوتا ہے جس میں ہزاروں مسلمان وادیٔ کشمیر کے دور دراز مقامات سے یہاں زیارت کے لئے آتے ہیں اور اس موقع پر "موئے مبارک" کا دیدار نہایت گہرے اخلاص اور روحانی عقیدت مندی سے کرتے ہیں۔ مگر یہ "موئے مبارک" ۲۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو حضرت بل سے کسی منظم سازش کے ذریعے اڑا لیا گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سری نگر اور پوری وادیٔ کشمیر کے مسلمانوں میں ایک قسم کا احتجاجی طوفان برپا ہو گیا۔ کیونکہ مسلمانوں کے دلوں کو اس سے ایک ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ جس کی وجہ سے ساری وادیٔ کشمیر بلکہ پاکستان میں بھی ایک قسم کا کہرام مچ گیا تھا۔ اور مسلمانوں کے مذہبی مقامات مقدسہ کو ختم کرنے کا یہ سلسلہ ایک سوچی سمجھی سازش کے مطابق عمل میں لایا گیا تھا۔

کشمیری مسلمانوں کے اس طوفانی احتجاج سے بھارتی حکومت میں بھی ہلچل پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ ساری دنیا کے اخبارات میں اس معاملے کی تشہیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا اسی دوران شیخ عبداللہ کے خلاف جو مقدمۂ بغاوت جموں کی عدالت میں زیر سماعت تھا وہ بھی نہایت ڈرامائی انداز میں واپس لے لیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اس طرح شمس الدین کی وزارت عظمیٰ بھی ختم ہو گئی ——— اب بھارتی حکومت کے اس غیر متوقع اقدام کا صحیح پس منظر کیا تھا! اس بارے میں یقینی طور پر تو کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر خیال ہے کہ چونکہ نہرو حکومت کو یہ امید تھی کہ شیخ عبداللہ کی قیادت کشمیر میں ختم نہیں ہو سکتی اس لئے شیخ صاحب کو رہا کرنے کا یہ مقصد تھا کہ ان سے مستقبل میں مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کر لی جائے۔ اپنی رہائی کے بعد شیخ عبداللہ نے پہلے نئی دلی میں پنڈت نہرو سے مکمل اور تفصیلی گفتگو کی۔ اور اس کے بعد وہ پاکستان بھی آئے۔ جہاں حکومت پاکستان سے بھی ان کا تبادلۂ خیالات ہوا۔ اور اس معاملے

میں جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے شیخ عبداللہ غالباً یہ نئی تجویز لے کر آئے تھے کہ کشمیر کو ایک ایسے ملک کی حیثیت سے پاکستان اور بھارت تسلیم کریں جسطرح کہ یورپی ملک سوئٹزرلینڈ کی حیثیت ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ اگر بھارت اور پاکستان دونوں ملکر کشمیر کی آزادی وخودمختاری کی ضمانت دے دیں تو پھر کشمیر کو باہر سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا۔ اور ساتھ ہی ہندو پاکستان کے علاوہ دُنیا کے دوسرے ممالک بھی بذریعہ عالمی بنک ریاست کو مالی امداد دیں تاکہ ریاست جموں وکشمیر داخلی طور پہ اقتصادی ترقی کر سکے۔ غالباً ایسی ہی کسی تجویز پہ شیخ عبداللہ نے ذاتی طور پہ پنڈت نہرو کو متفق کر لیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ شیخ عبداللہ سے ذاتی طور پہ تبادلۂ خیالات کا مجھے موقع نہ دیا گیا۔ اگرچہ میں نے اس موقع پہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ پھر راولاکوٹ (میرے آبائی وطن) میں آنے کی صورت میں بھی ان کے ساتھ تفصیلی تبادلۂ خیالات کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ اور شیخ صاحب کے ساتھیوں سے ملاقات کر کے مجھے معلوم ہوا کہ خود شیخ صاحب بھی یہ خواہش رکھتے تھے کہ آزاد کشمیر کے راہنماؤں سے کھل کر ان کا تبادلۂ خیالات ہو۔ پھر راولاکوٹ آنے کی بھی خدا تعالےٰ نے انہیں فرصت نہ دی۔ اور پنڈت نہرو کی اچانک موت نے سارا بنا بنایا نقشہ ہی بدل دیا۔

جب بھارت کے نئے وزیراعظم لال بہادر شاستری صاحب نے اقتدار سنبھالا تو بھارتی حکومت کے کشمیر کے معاملے پر سوچنے اور عمل کرنے کے طور طریقے بھی یکسر بدل گئے۔ بھارت کے نئے وزیراعظم ایک کمزور سے انسان ہیں جبکہ پنڈت نہرو کی سی حیثیت انہیں اپنی قوم میں بالکل حاصل نہیں ہے اور ان کی قوت فیصلہ بھی بڑی کمزور ہے۔ اگر کوئی فیصلہ کر بھی لیں تو کانگریس میں ان کی اتنی مضبوط پوزیشن ہرگز نہیں ہے کہ وہ یہ فیصلہ اپنے ساتھیوں سے بھی منوا سکیں۔ پنڈت نہرو کے مقابلے میں مسٹر شاستری کے لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی معاملے میں وہ از خود کوئی قطعی فیصلہ کر بھی پائیں اور اگر وہ کوئی آخری فیصلہ کر بھی لیں تو اس پہ دوسرے جماعتی راہنماؤں کی تائید وحمایت کر کے اُسے نافذ العمل کرنا ان کے بس کی بات ہرگز نہیں ہے۔ اور ایک کمزور سیاستدان کی ہمیشہ

ایسی قسم کی مشکلات ہوتی ہیں۔ مجھے اپنی زندگی میں کئی کمزور قسم کے سیاستدانوں سے واسطہ پڑا ہے اور ایسے لوگ میں نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں بھی دیکھے ہیں۔ اور سرزمین پاکستان میں بھی قائد اعظم کی وفات کے بعد ایسے سیاستدان کم نہ تھے۔ اور اس دوران اگر کوئی مضبوط سیاستدان پاکستان میں آگے آیا بھی تو مرکزی اسمبلی اور دوسرے لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں کشمیر سے متعلق ہماری پالیسی اگرچہ ہمیشہ ایک ہی نہج پر رہی ہے۔ مگر ماضی کے ان کمزور سیاستدانوں کے اعلانات سے پنڈت جواہر لعل نہرو کبھی متاثر نہ ہو سکے۔ البتہ موجودہ حکومت کے کچھ ٹھوس اقدامات کی بدولت بھارتی حکومت اگرچہ اب بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے مگر بہت سی سیاسی کمزوریوں میں گھر چکی ہے۔ تاہم اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں موجودہ حکومت کی بے جا خوشامد کا ارتکاب کر رہا ہوں۔

پنڈت نہرو کی وفات کے بعد بھارتی حکومت شیخ عبداللہ سے بھی جب تسلی بخش طور پر اپنی گفتگو جاری نہ رکھ سکی تو شیخ صاحب بھارتی حکومت سے مایوس ہو کر دوسرے ممالک کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بھارت سے باہر تشریف لے گئے۔ باہر رہ کر شیخ عبداللہ نے کشمیریوں کی داستانِ مظلومیت و محکومیت بیان کی۔ شیخ عبداللہ بے شک کشمیری عوام کے ایک ہمدرد اور مخلص لیڈر رہے ہیں اور کشمیریوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی وہ اتنے خلوص اور خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں ایک قسم کی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ جو بہت کم کشمیری راہنماؤں میں موجود ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے شیخ صاحب ایک صاحب عقیدہ انسان بھی ہیں۔ اور اسلام کی تاریخ سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ تاریخ اسلام کی تشریح بڑی علمیت سے کر سکتے ہیں اور قرآن مجید کی تلاوت کر کے جس طرح عوام کے سامنے اس کی تفسیر پیش کرتے ہیں اس کا بھی جواب نہیں۔ علاوہ ازیں وہ صحیح معنوں میں ایک آزمودہ کار اور مخلص کشمیری لیڈر بھی ہیں۔ کیونکہ وہ عوام کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ کر مروت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کا ایک عوامی لیڈر میں موجود ہونا میرے خیال میں نہایت ضروری بھی ہے۔

بیرونی ممالک کا دورہ کرتے ہوئے جب شیخ عبداللہ نے ایک ملاقات الجزائر میں چینی وزیر اعظم چو این لائی سے بھی کی تو بھارت کی حکومت سیخ پا ہو گئی اور سارے ہندوستان میں شیخ عبداللہ کے خلاف مخالفانہ مہم شروع کر دی گئی ۔ ہندوستان کے اخبارات میں شیخ صاحب کے خلاف انہونی باتیں منسوب کی جانے لگیں ۔ اور پورے ہندوستان میں شیخ عبداللہ کو بھارت کا بدترین دشمن قرار دے دیا گیا ۔ اِن پر غداری کے الزامات تھوپے جانے لگے خصوصاً بھارت کی وہ جماعتیں تو اس مہم میں پیش پیش تھیں جن کا مقصد اولین ہی صرف یہ ہے کہ پاکستان کا وجود دنیا سے ختم کر دیا جائے ۔ اور بھارتی وزیر اعظم مسٹر شاستری اِن باتوں سے متاثر ہی نہیں ہوئے ۔ بلکہ روایتی طور پر ایک کمزور سیاستدان ہونے کی وجہ سے مرعوب ہو کر رہ گئے ۔ انہوں نے شیخ عبداللہ کے خلاف پہلے سے بھی زیادہ سخت گیر رویہ اختیار کر لیا ۔ اور شیخ عبداللہ نے بیرونی ممالک کا دورہ ختم کر کے سرزمین بھارت پر قدم رکھا تو انہیں اور اُن کے ساتھیوں کو ایک بار پھر گرفتار کر کے اپنے وطن سے دُور جنوبی ہندوستان میں قید کر دیا گیا ۔ اب شیخ عبداللہ اپنے وطن عزیز کی آزادی کے متعلق کچھ اظہار خیال نہیں کر سکتے اور اگر کریں بھی تو وہ کشمیری عوام تک پہنچنے ہی نہیں دیا جائے گا ۔

مگر یہ داستانِ مظلومیت یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اِن کی گرفتاری کے بعد کشمیر کا مسئلہ ایک نئی تحریک کی صورت اختیار کر گیا جبکہ ابتدائے اگست ۱۹۶۵ء سے کشمیر میں ایک بار پھر مجاہدین کی بغاوت شروع ہو گئی ۔ کیونکہ جب مظلوم کشمیری عوام کو یہ یقین ہو گیا کہ اقوام متحدہ کے در و دیوار سے کشمیر کی آزادی کا پیغام کبھی نہیں آ سکتا اور ساری دنیا کے یہ ممالک اِن کی مظلومیت کی پکار سن کر بھی اِن کی مدد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو انہوں نے ایک بار پھر اپنی آزادی کے لئے بغاوت کا پرچم لہرا دیا ۔

کشمیر کے باشعور عوام اب اس بات کو بخوبی سمجھ گئے ہیں کہ دنیا کی تعمیر و ترقی کے بلند بانگ دعوے کرنے والے یہ بڑے بڑے ممالک محض اپنے اپنے اقتصادی مفادات رکھتے ہیں اور

ان مفادات کے پیش نظر بغیر کسی ذاتی مفاد کے یہ غریب قوموں کا ساتھ کب دے سکتے ہیں !——
خصوصاً امریکہ اور روس کی باہمی کشمکش سے دنیا کے چھوٹے چھوٹے ممالک جو مظلوم و محکوم ہونے کی وجہ سے اب تک اپنی قومی و ملی آزادی سے بھی محروم ہیں۔ دنیا کی بساطِ سیاست کا مہرہ بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ دنیا کا سب سے امیر ملک امریکہ دنیا کے اُن ممالک کی امداد کو تو فوراً پہنچ جاتا ہے جہاں اس کے اپنے مفاداتِ خصوصی خطرے میں پڑتے ہوں اور روس بھی کچھ اسی قسم کی پالیسی پر کاربند ہے اور یہ انگریز تو صرف ایک تجارتی قوم ہے کہ جہاں بھی اِن بھلے لوگوں کی تجارت خطرے میں پڑتی ہے وہاں یہ فوراً اصول کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اگرچہ چھوٹی قوموں کے حقوق اور اصولوں کا مسئلہ اس وقت بے معنی سی چیز ہو کر ہی کیوں نہ رہ جاتے ہوں۔ اور حالات نے یہ امر بھی واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ بڑے بڑے ممالک بھی ہمیشہ انہی قوموں کا ساتھ دیتے ہیں جو بغیرت مند قومیں اپنا خون بہا کر آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوں۔ ورنہ یہ اقتصادی دنیا والے ممالک بھی ہمیشہ چڑھتے سورج کی پرستش ہی بخوشی کرتے ہیں۔ کیونکہ سورج کی نرم اور گرم دھوپ میں بیٹھ کر ہی عیش و عشرت بھی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میرے نزدیک تو اِن سے کوئی توقع رکھنا ایک حماقت ہے۔ اور جو لوگ بھی اس احمقوں کی دنیا میں رہتے ہیں اُنہیں آخر کار اپنا انجام بھی معلوم نہیں !

اپنی اس مایوسی و بے سروسامانی کی حالت میں کشمیری مجاہدین نے بھارت کی بربریت اور ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا حالانکہ اُنہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وادیٔ جموں و کشمیر کے چپے چپے پر بھارتی فوجوں کے سپاہی بندوقیں تانے کھڑے ہیں اور بھارتی فوجیوں کی سنگینیں اِن کے سینوں کو چھلنی کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ ساری کائنات میں صرف اللہ تعالےٰ کے بھروسے اور اس کے بعد پاکستان کی حمایت کے سوا اِن کا کوئی مددگار نہ تھا مگر وہ اپنی اس بے سروسامانی کے باوجود بھارتی جبر و تشدد کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پورے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوجوں کو بے دست و پا کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان نے کئی ڈویژن فوج مقبوضہ کشمیر میں اور

بھیجدی۔ ساتھ ہی سارے ہندوستان میں کشمیری عوام کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے بھارتی فوجوں کی نقل وحرکت وسیع پیمانے پر شروع ہوگئی۔ اور امریکہ سے حاصل کئے ہوئے بھارتی اسلحے کے ذریعے کشمیر کے پہاڑ اور وادیاں کشمیری مسلمانوں کے خون سے پھر رنگی جانے لگیں۔ مگر بھارت نے اس پر بھی الٹا ساری دنیا کے سامنے یہ واویلا کرنا شروع کردیا کہ پاکستان نے کشمیر میں عوامی بغاوت کی پشت پناہی کی ہے۔

مگر ہندو پاکستان کے باشعور اور اہل نظر لوگ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اس فوری بغاوت کی وجوہات کچھ اور تھیں۔ بھارتی حکومت نے چونکہ پنڈت نہرو آنجہانی کے بعد کشمیر پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کیلئے ایک بالکل نئی اور انتہائی جابرانہ وغیر منصفانہ حکمت عملی اختیار کرلی تھی۔ اگرچہ پنڈت نہرو (مرحوم) بھی کشمیر پر بھارت کا قبضہ مستحکم کرنے کے علمبردار تھے مگر بھارت میں کشمیر کی ایک خاص حیثیت وہ ہر وقت تسلیم کرتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ کشمیر سیاسی و اقتصادی اور تہذیبی و تمدنی نکتہ نگاہ سے باقی ہندوستان سے مختلف ہے۔ اور اپنے اسی نظریے کے پیش نظر پنڈت نہرو اپنے دور حکومت میں کشمیر کو ایک مخصوص سیاسی حیثیت دیتے رہے۔ چنانچہ کشمیر میں ایوان بالا اور عوامی اسمبلی کا قیام انہی کے دور حکومت میں عمل میں لایا گیا۔ اور ان اسمبلیوں میں عوامی نمائندے بھی منتخب ہونے لگے۔ اگرچہ جس ڈھب سے یہ انتخابات ہوئے ان پر بھی کڑی نکتہ چینی کی گنجائش ہے۔ پھر جموں و کشمیر صوبہ جات کے لئے الگ الگ یونیورسٹیاں بھی قائم کروائی گئیں۔ اور کشمیر کا نام نہاد وزیر اعظم بھی اسمبلی میں اکثریت سے چنا جانے لگا۔ ان مفید اقدامات کے علاوہ پنڈت نہرو (مرحوم) نے ریاست جموں و کشمیر کو اقتصادی طور پر بھی کسی نہ کسی صورت میں ترقی دینے کی کوششیں جاری رکھیں۔ مگر یہ اقدامات بھی چونکہ بنیادی طور پر کشمیری عوام کے لئے اخلاص اور ہمدردی پر مبنی نہ تھے۔ اس لئے کشمیری عوام کبھی دل سے بھارت کے حق میں نہ ہو سکے بلکہ ہمیشہ اپنے حق خود ارادیت کے لئے لڑتے رہے۔

پنڈت نہرو کی وفات کے فوراً ہی بعد شاستری حکومت نے یہ اعلان کر دیا کہ ریاست جموں و کشمیر کو وہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں ضم کر دیں گے اور اس اقدام کی تکمیل کے سلسلے میں آئینی و قانونی اقدامات بھی کئے جانے لگے۔ مگر اس مرحلے پر کشمیری عوام میں ایک بار پھر بھارتی حکومت کے خلاف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور کشمیری عوام بھارتی سامراج کے اس اقدام کے خلاف بغاوت کرنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ مقبوضہ کشمیر کے کونے کونے میں ہندوستانی افواج، پولیس اور مجاہدین آزادی کے درمیان جنگ کا آغاز ہو گیا۔ کشمیری عوام کی اس جنگ آزادی کا آغاز اگست ۱۹۶۵ء کے شروع میں ہوا اور کشمیری مجاہدین کی مسلح بغاوت شروع ہوتے ہی بھارت نے کارگل میں پاکستان کی تین چوکیوں پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس پر حکومتِ پاکستان نے احتجاج کرتے ہوئے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کو مطلع کیا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اور پھر اس کے چند ہی روز بعد بھارتی فوجوں نے ٹیٹوال کے مقام پر پیشقدمی کر کے ہماری چند اور چوکیوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور حکومتِ بھارت کے اس کھلے ہوئے جارحانہ اقدام کی وجہ سے سارے جنگلات ہم سے کٹ کر رہ گئے۔ دریائے نیلم (کشن گنگا) پر بھی بھارت کا مکمل قبضہ ہو گیا اور اس دریا کے ذریعے لکڑی کا پاکستان تک پہنچانا بھی ناممکن بنا دیا گیا۔ آزاد حکومت کشمیر کا ایک بڑا ذریعۂ آمدن یہ جنگلات ہی ہیں۔ جن سے اُسے محروم کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی کئی ایسے دیہات بھی ہم سے کٹ گئے جن کے ہم سے گہرے تعلقات تھے۔ دوسری طرف مظفر آباد کے سر پر بھی بھارتی فوجوں نے ڈیرے ڈال دیئے جس کی وجہ سے مظفر آباد شہر کے لوگوں کی جانیں بھی خطرے میں پڑ گئیں۔ اسی طرح بھارت کی دو بریگیڈ فوج نے حاجی پیر کے درّہ پر بھی حملہ کر دیا۔ ہمارے مجاہدین نے اگرچہ اپنی بے سروسامانی کی حالت میں بھی ایک ہفتے تک ان بھارتی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر آخر کار بھارتی فوج نے درّہ حاجی پیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور پونچھ کا سڑک کے ذریعے اوڑی سے تعلق قائم کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حویلی میں سو گاؤں کا علاقہ بھی ہمارے قبضہ سے جاتا رہا۔ وہاں کے ہزاروں کشمیری مہاجر بھارتی فوجوں کے ظلم و تشدد سے جانیں بچا کر بھاگ نکلے۔ اور آزاد کشمیر میں پونچھ کے علاقہ

میں پناہ گزین ہوئے ۔ راجوڑی اور مینڈھر کے علاقوں میں بھی بھارتی فوجوں نے ظلم وتشدد کی انتہا کر دی ۔ پھر درہ حاجی پیر پر قبضہ ہونے کے باعث آزاد کشمیر کا وسطی حصہ یعنی سارے پونچھ کا علاقہ بھی بھارتی فوج کی توپوں کی زد میں آ گیا ۔ اور یہاں بھی کشمیری باشندوں کا رہنا ناممکن ہو گیا ۔

آخر کار اِن سب حالات سے مجبور ہو کر پاکستان کی فوجوں اور آزاد کشمیر کی فوجوں نے بھمبر کی طرف سے پیشقدمی شروع کر دی اور اگر اس موقع پر بھی ایسا نہ ہوتا تو بھارتی فوجیں جو ساری ریاست جموں و کشمیر پر قبضہ کرنے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھیں آگے ہی بڑھتی آتیں ۔ اور بھارتی حکومت نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ ایسا ضرور کریں گی کیونکہ بقول بھارت کے یہ علاقہ آئینی طور پر ان کا تھا ۔ مگر پاکستانی فوج اور آزاد کشمیر کی فوج کے جوانوں نے جس بہادری اور جرأت مندی سے جوڑیاں کی طرف سے پیشقدمی کی اس کی مثال پوری جنگِ کشمیر میں مشکل سے ہی ملے گی ۔ اور ہماری اس پیشقدمی سے مرعوب ہو کر بھارتی فوج سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی ۔ اور اگر ہماری فوجیں یہ پیش قدمی جاری رکھتیں تو جموں اور اکھنور پر قبضہ کرنے کے بعد سات ڈویژن بھارتی فوج جو وادیٔ کشمیر اور لداخ میں موجود ہے کی قبر ہمیشہ کے لئے وہیں کھود دی جاتی ۔ اور اب بھی بفضل خدا اپنی قبر کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے ۔ اور ایک ایسا وقت بھی ضرور آئے گا جب بھارتی فوج کی قبر کشمیر کی انہیں وادیوں میں کھدے گی ۔ جہاں وہ کشمیر کے غریب اور مظلوم عوام پر ہزاروں قسم کے مظالم روا رکھے ہوئے ہے ۔

جب ہماری فوج نے جوڑیاں میں پیشقدمی کی تو بھارت نے بے حد پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں پاکستان کو جنگ کا الٹی میٹم دیئے بغیر لاہور اور سیالکوٹ پر حملہ کر دیا ۔ اور پاکستان کے کئی دوسرے شہروں پر بھی اچانک اندھا دھند بمباری شروع کر دی گئی ۔ جس سے ہزاروں بے گناہ اور معصوم شہری ہلاک ہو گئے ۔ اور بھارتی حکومت کا یہ اقدام پاکستان کے سوئے ہوئے شیر کو جگانے کے مترادف ثابت ہوا ۔ پاکستان کی بری، بحری

ہوائی فوج اور عوام نے بھارت کے اس بزدلانہ حملے کا منہ توڑ جواب دیا۔ چند روز کی ہی لگاتار جنگ میں بھارتی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیئے گئے۔ اور بھارتی حکومت کا یہ خواب کہ لاہور پر چند گھنٹوں میں ہی اب اس کا قبضہ ہو جائے گا چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ بھارتی حکومت اپنے پروگرام کے مطابق لاہور پر قبضہ ہو جانے کا اس قدر یقین رکھتی تھی کہ ساری دنیا میں پہلے ہی سے یہ خبر پہنچا دی گئی تھی کہ لاہور پر بھارت کا قبضہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ بی بی سی کے ذریعے لندن اور نیویارک کے اخبارات میں یہ خبر حملے سے پہلے ہی شائع کرا دی گئی تھی کہ لاہور شہر بھارت کے قبضے میں آ گیا ہے۔ مگر بعد میں یہ بڑ ہانکنے پر بھارت کو دنیا کے سامنے جو خفّت اور ذلت اٹھانا پڑی اسکا سامنا وہ کسی طرح بھی نہ کر سکی۔

پاکستان کی بری اور ہوائی فوج نے لاہور اور سیالکوٹ پر حملے ہوتے ہی جس دلیری، اولالعزمی اور ایثار کا ثبوت دیا اس کی مثال بھی دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ہی ملے گی۔ اگرچہ بھارتی فوج، پاکستانی فوج سے کئی گنا زیادہ تھی بھارت کے بڑے بڑے "سینک" جدید ترین امریکن ہتھیاروں سے لیس ہو کر اس جنگ میں کود پڑے تھے اور بھارتی ہوائی جہازوں کی کثیر تعداد بھی ان حملوں میں بروئے کار لائی گئی تھی۔ مگر ہماری تعداد میں کم مگر شیر دل فوج نے انہیں شکست فاش دے کر ان کا منہ موڑ کر رکھ دیا۔ اور پاکستان کی بہادر افواج نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کی فوج تھوڑی ہونے کے باوجود اپنی جرأت اور مردانگی سے ہندوستان کی کئی گنا بڑی فوج کو منہ کے بل گرا کر رکھ سکتی ہے۔ اور در حقیقت ہماری فوج نے مسلمان قوم کی تاریخی روایات کو از سرِ نو زندہ و تابندہ کر دیا ہے۔ لاہور اور سیالکوٹ میں عوام کے حوصلے بھی اس دوران مثالی طور پر بلند رہے۔ مجھے اس دوران (۱۱ ستمبر سے ۱۶ ستمبر ۶۵ء تک) لاہور رہنے کا اتفاق ہوا تو میں نے اپنی آنکھوں سے لاہوری باشندوں کے حوصلے اور عزائم بلند دیکھے۔ مجھے اس سے بے پناہ دلی سکون اور روحانی تسکین حاصل ہوئی۔ اور جنگ کے دوران تو گویا ساری پاکستانی قوم کی روح تازہ ہو گئی تھی۔ اور مجھے اس وقت یقین ہو چکا تھا بلکہ

اب تو ساری دنیا کو یقین آچکا ہے کہ پاکستان اپنی بری، بحری اور ہوائی فوج کے علاوہ عوام کی بے پناہ فوج کے سہارے پر بھی ہر مصیبت کا مقابلہ مردانہ وار کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ دنیا کے تمام ہمدرد اور آزادی پسند ملکوں نے بھی اخلاقی طور پر ہمارا ساتھ دیا۔ جن میں چین، انڈونیشیا، ترکی، ایران، اردن، سعودی عرب پیش پیش رہے ہیں۔ اس جنگ میں اگرچہ مغربی ملکوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا بلکہ وہ عملاً ہندوستان کی پشت پناہی ہی کرتے رہے۔ مگر انہیں بھی اب اس کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پاکستان اگرچہ ایک چھوٹا سا ملک ہے مگر صحیح معنوں میں ایک منظم قوم اور مضبوط ارادے رکھنے والے باشندوں کا ملک ہے۔ اور بھارت جیسا بزدل ملک پاکستان کو کبھی شکست نہیں دے سکتا۔

مجھے اس موقعہ پر نہایت افسوس سے یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ امریکہ کا رویہ اس سارے معاملے میں ہمارے ساتھ بے حد معاندانہ ومخاصمانہ اور افسوسناک رہا ہے۔ سلامتی کونسل میں بھی امریکہ نے ہر طور بھارت کا ساتھ دیا ہے اور روس نے بھی اس دوران کچھ عجیب رویہ اختیار کیا ہے۔ مگر امریکہ نے جو پاکستان کا حلیف ملک ہے اور ہمیشہ ہمارے دفاع کی علمبرداری کرتا رہا ہے اس نازک دور میں پاکستان کے ساتھ بڑی بے اعتنائی کا سلوک کیا ہے اور اس سے امریکہ کی جو تھوڑی بہت ساکھ پاکستان میں قائم تھی وہ بھی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور آئندہ کے لئے اب پاکستان کو امریکہ پر بہت کم بھروسہ رہ گیا ہے۔ البتہ روس سے ہمارا کوئی گلہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب ہمارا حلیف ملک امریکہ ہی ہم سے نہایت نازک وقت میں الگ رہا تو روس جو ہمارا حلیف بھی نہ تھا، اس سے کیا شکایت! البتہ روس کو اخلاقی طور پر ضرور دیکھنا چاہئے تھا کہ اس معاملے میں ظالم کون ہے؟ اور روس کو ہمیشہ دنیا کی مظلوم قوموں کا ساتھ ہی دینا چاہئے نہ کہ ظالم قوموں کا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ چین شروع ہی سے اس معاملے میں ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ اس لئے روس نے ہمارا ساتھ نہ دیا اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ روس اور چین کی باہمی چپقلش ہی ہے۔ اسی وجہ سے غالباً سلامتی کونسل میں بھی ابھی تک قضیۂ کشمیر کا کچھ نتیجہ برآمد

نہیں ہو پایا اور اگرچہ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء سے جنگ بندی پر فیصلہ ہو گیا ہے مگر محسوس ہوتا ہے کہ یہ جنگ بندی بھی محض عارضی ثابت ہوگی۔ کیونکہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں اب بھی بڑی طاقتیں اپنے بین الاقوامی اقتدار کی سیاسیات میں الجھ کر غریب کشمیریوں کا ساتھ دینے پر آمادہ نظر نہیں آتیں۔ اور جو رویہ ان بڑے ممالک نے اس موقعہ پر اختیار کر رکھا ہے وہ ہمارے لئے بے حد افسوسناک ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہے۔ کشمیری عوام کو اب جان لینا چاہیے کہ ان بڑی طاقتوں پر بھروسہ کرنا بالکل لاحاصل ہے۔ اور ان سے کوئی امید وابستہ رکھنا بھی ان کی ایک سیاسی غلطی ہوگی۔ بلکہ صرف خدائے تعالےٰ پر بھروسہ رکھ کر ہی اپنی تیاری مکمل کرنی چاہیے۔

بھارت اگرچہ ہمارا ایک پڑوسی ملک ہے۔ مگر ہندوستان کے بیراردنے مہاجن صاحب کے انکشافات سے ہم پر بخوبی روشن ہو چکے ہیں کہ پاکستان کو ختم کرنے کے منصوبے دراصل ۱۹۴۷ء میں ہی جموں میں تیار ہو گئے تھے۔ اور ہم ہمیشہ سے یہی واویلا سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی میں کرتے آئے تھے کہ بھارت پاکستان کے وجود کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ کیونکہ بھارت میں ہندو پاکستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو بھی ابھی تک دیانتداری اور خلوصِ دل سے قبول نہیں کیا گیا ہے۔ اور جب گاندھی جی نے بھارتی مسلمانوں کی ذراسی ہی حمایت شروع کی تھی تو رجعت پسند ہندوؤں نے ہی انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جبکہ گاندھی ہندوستان بھر کے عوام کا ایک محسنِ اعظم تھا۔ تو پھر یہ رجعت پسند ہندو قوم پاکستان یعنی اپنے ایک دشمن ملک کے وجود کو کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ تاہم اگر کسی پاکستانی کو یہ غلط فہمی تھی بھی کہ ہندوستان کے رجعت پسند ہندو انہیں برداشت کر سکتے ہیں تو اب یہ غلط فہمی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جانی چاہیے۔

میری ناچیز رائے میں تو اب بحالات موجودہ یہ نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ حکومت پاکستان ساری ملکی دولت کو قومی ملکیت میں لے کر ملک کو ایک منظم فوجی نظام کے تحت ڈھال دے۔ جس کے لئے اس وقت ساری قوم بھی ذہنی، جذباتی اور روحانی طور پر تیار

ہے۔ اسی طرح آزاد کشمیر میں بھی ایک بڑی منظم اور طاقتور فوج تیار کی جائے جو اپنے ملک کے دفاع اور آزادی و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے خود اپنی قوت کے بل پر لڑ سکے۔ اور جب یہ ساری تیاری مکمل ہو جائے تو کشمیر والے اپنی آزادی کی جنگ شروع کر دیں اور پاکستان کی فوجیں اپنے ملک کے دفاع کے لئے سرحدیں سنبھال لیں۔ اس طرح ہندوستان کے ساتھ ایک آخری اور فیصلہ کن جنگ اس مقصد کے لئے لڑی جائے کہ سارے معاملات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائیں۔ اس کے سوا ایسا اور کوئی طریقہ اب نظر نہیں آتا کہ جسے بروئے کار لا کر بھارت کے ساتھ ہمارے باہمی تنازعات پر امن اور منصفانہ انداز میں طے ہو سکیں۔

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No:
MAILSI

23 FEB 2021

کلاسیک

۴۴ دی مال لاہور

کشمیر کی جنگِ آزادی ——— غزنوی ار محمد ابراہیم خان (تاریخ) ۸/۵۰

متاعِ زندگی ——— " " (سرگزشت) ۱/-

کشمیر ہمارا ہے ——— میر غلام احمد کشفی (تاریخ و سیاست) ۷/۵۰

ندائے حق ——— نصیر انور (جنگ کا ریڈیو پروگرام) ۶/-

ساونی ——— ابو سعید قریشی (ناولٹ) ۲/۵۰

قاضیِ اعظم ——— سیّد اعجاز حسین (ناول) ۷/-

تنگ دروازہ ——— آندرے ژید (ناول) ۳/-

صحیفہ (۱۲-۱۱) ——— مرتبہ: سیّد عابد علی عابد (منتخب) ۶/-

مستقبل کا انسان ——— ڈاکٹر لورین آئزلے (انسانیات) ۶/۰

وقت کا آسمان ——— ڈاکٹر لورین آئزلے (انسانیات) ۳/۰

سُورج کی پیدائش اور موت ——— جارج گیمو (سائنس) ۵/

زمین کی سرگزشت ——— جارج گیمو (سائنس) ۴/۰

ستاروں کی دُنیا ——— ڈبلیو میکسویل ریڈ (سائنس) ۵/۰

یہ ہے شمالی افریقہ ——— جان گنتھر (سفرنامہ) ۲/۵۰

تعلیم کا عمل ——— جیروم ایس بروز (تعلیم) ۲/۵۰

میکبتھ ——— ولیم شیکسپیئر (ڈرامہ) ۲/۵۰

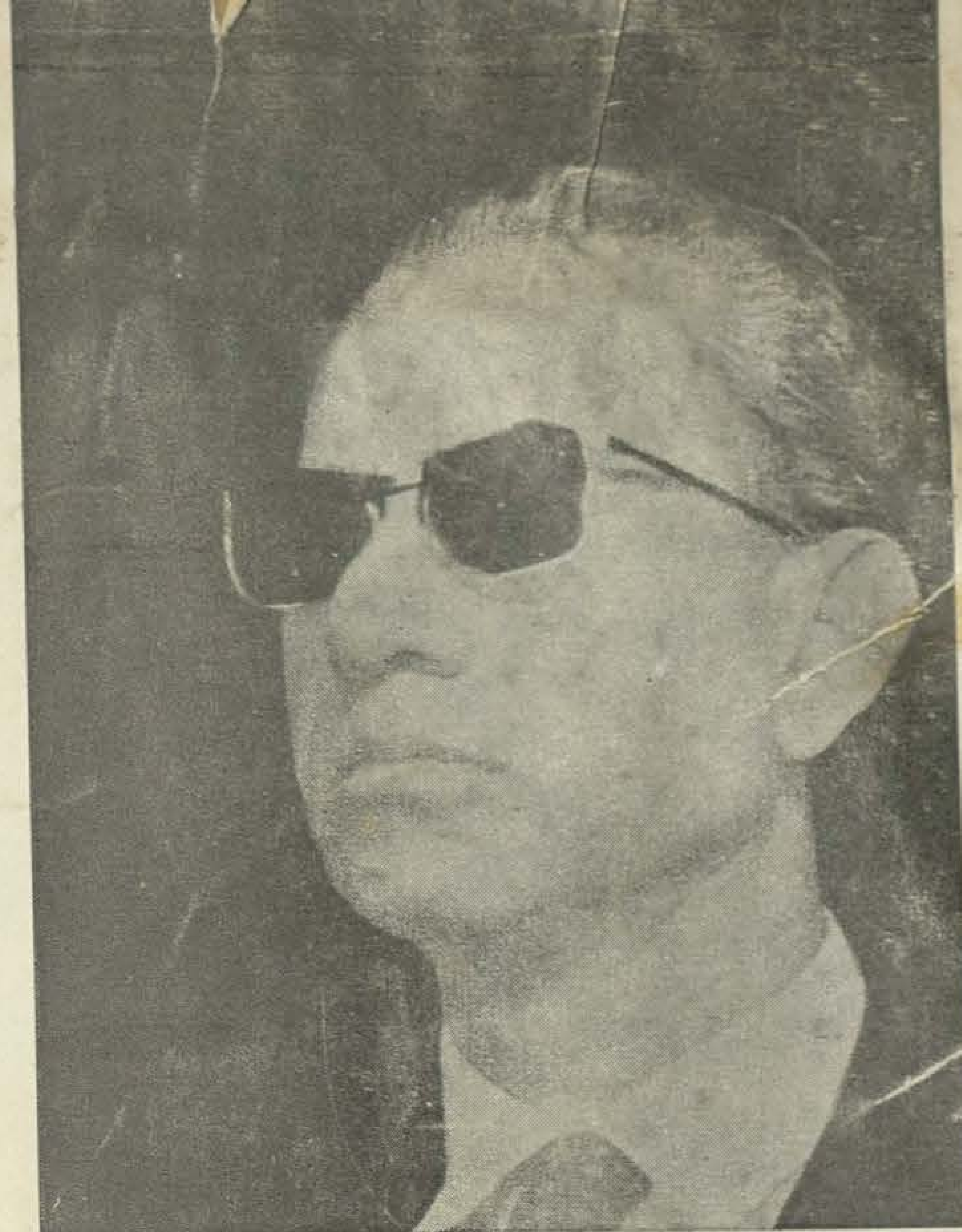
اوتھیلو ——— ولیم شیکسپیئر (ڈرامہ) ۲/۵۰

دُودِ چراغِ محفل ——— ذکاء الرحمٰن (ناول) ۴/۰

روشنی کے آنچل ——— ذکاء الرحمٰن (افسانے) ۴/۰

سردار محمد ابراہیم خان

سابق صدر حکومتِ آزاد کشمیر



۱۹۱۵ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے - پونچھ، لاہور اور لندن میں تعلیم پائی - ۱۹۴۱ء میں قانون کی ڈگری لے کر آئے - ۱۹۴۳ء میں ہائی کورٹ سری نگر میں پریکٹس شروع کی اور اسی سال گورنمنٹ ایڈووکیٹ مقرر ہوئے - ۱۹۴۴ء میں انہیں نائب ایڈووکیٹ جنرل مقرر کیا گیا - ۱۹۴۶ء میں حکومت کی پالیسی سے اختلافات کی بنا پر سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے - جنوری ۱۹۴۷ء میں ریاستی اسمبلی میں پونچھ کی طرف سے پھر منتخب ہوئے - اور اسمبلی میں مسلم کانفرنس کے چیف وہپ کی حیثیت سے کام کیا - تقسیم کے بعد ریاست میں صورتِ حال بالکل بدل گئی - اکتوبر ۱۹۴۷ء میں آزاد کشمیر کے صدر منتخب ہوئے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۰ء میں دو بار سلامتی کونسل کے سامنے آزاد کشمیر کا کیس پیش کیا - اور "میکناٹن تجاویز" کے سلسلے میں جنرل میکناٹن کا ہاتھ بٹایا - مئی ۱۹۵۰ء میں مسلم کانفرنس سے چند اختلافات کی بنا پر آزاد کشمیر سے مستعفی ہو گئے - لیکن اس کے باوجود تادمِ تحریر تحریکِ آزادی یاب بنانے میں مصروف ہیں - پھر دوبارہ ۱۹۵۷ء حکومت کے صدر چنے گئے - ۱۹۵۹ء کے وسط میں صدارت ـیدیا ——— آج کل لاہور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ پریکٹس کرتے ہیں -